The "Adabi-Dunya"
اُردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دنیا
ایڈیٹر: منصور احمد
قیمت چھ آنے

کو ان کی عزت کرنی چاہئے ۔

گفتار کی حقیقت

برطانوی حکیم سر رچرڈ پیجٹ نے قوتِ گفتار کو جس کے ذریعہ سے انسان اور حیوان ادائے مطلب کا کام لیتے ہیں دو مختلف اعمال کا مجموعہ قرار دیا ہے ۔ ان میں سے پہلا صوت ہے یعنی ایسی آوازیں پیدا کرنا جو مختلف جذباتی حالات مثلاً خوف، غصے اور خوشی کے وقت مختلف ہوں ۔ اس کا انحصار اُن صوتی رگوں میں سے ہوا کے گذارنے پر ہے جو ایک ترم بجانے والے کے اصلی ہونٹوں کی طرح اہتزاز کرتی ہیں ۔ آواز کا زیر و بم اور نوعیت اُن کی لمبائی، موٹائی اور کھنچاؤ پر منحصر ہے اور اس کی جسامت ہوا کے اس دباؤ پر جو پھیپھڑے بہم پہنچاتے ہیں جس طرح لوگ اپنے جذبات کو اپنے لبوں کی مختلف حرکات سے ادا کرتے ہیں بالکل اسی طرح نامعلوم طور پر وہ ان رگوں کے ذریعہ سے بھی کام لیتے ہیں ۔

دوسرا اصول تلفظ ہے یعنی اُن صوتی اجواف کی اندرونی شکل کا نقشہ جن میں زبان، لبوں، جبڑوں اور حرکت کرنے والے اعضا کی حرکات سے پھیپھڑوں میں سے ہوا پھونکی جاتی ہے ۔ تلفظ کی یہ حرکات یا اشارے ایک اور عام حیوانی اصول یعنی ادائے مطلب کے خاموش اشاروں کی صرف ایک ترقی یافتہ شکل ہے ۔

تلفظ کا فن کس طرح ایجاد ہوا ۔ اس کا جواب سر رچرڈ کو ڈارون کے اس قول سے معلوم ہوا کہ لوگ جب قینچی سے کوئی چیز کاٹتے ہیں تو اُن کے جبڑے بھی ساتھ ساتھ اسی انداز سے ہلتے جاتے ہیں، اور بچے جب لکھنا سیکھتے ہیں تو جس جس طرح ان کی انگلیاں ہلتی ہیں اسی کے مطابق وہ اپنی زبانوں کو منہ کے اندر خم دیتے جاتے ہیں ۔ انسانی گویائی کا آغاز غالباً اسی بات میں پوشیدہ ہے ۔ قدیم انسان حیوانوں کی طرح صرف اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ سے اپنے جذبات ادا کرتا تھا ۔ وہ اپنے چہرے اور دوسرے اعضا سے اشارے کرکے اپنے خیالات دوسروں کو سمجھاتا تھا ۔ اور جب وہ اشارے کرتا تھا تو اُس کی زبان اس کے اشاروں کے مطابق حرکت کرتی تھی ۔ لیکن جوں جوں وہ اپنے ہاتھوں کو مختلف فنون میں مصروف کرتا گیا اس نے صرف اپنے چہرے، زبان اور لبوں کے اشاروں سے کام لینا شروع کیا ۔ پھر یہ ہوا کہ اشارات کو آواز میں ادا کیا جانے لگا اور نگاہ نے ان کی مطابقت کو پہچانا، اس طرح گفتار پیدا ہوئی ۔

منصور احمد

قارئینِ ادبی دُنیا کے نام

میں ادبی دنیا کے قارئینِ کرام سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ادبی دنیا سے مجھے ارتباطِ جسم و جان کا سا تعلق رہا ہے، مگر رشتۂ جسم و جان بھی ایک دن ٹوٹ جاتا ہے۔ آج ادبی دنیا اور اس کے معزز قدر شناسوں سے اس لئے جدا ہو رہا ہوں کہ حالاتِ ناسازگار نے میرے لئے یہ تعلق قائم رکھنا ناممکن بنا دیا ہے۔ میں ہمیشہ ادبی دنیا کا بہی خواہ رہوں گا اور کبھی کچھ لکھ سکا تو وہ صرف اس کے لئے ہوگا، لیکن بحیثیتِ مدیرِ اعزازی اپنا نام شائع کرنا میرے لئے اب دشوار ہو رہا ہے۔ بنا بریں بادلِ ناخواستہ اپنے اعزازی ادارہ کو ختم کر رہا ہوں۔

خاکسار

تاجور

ہم نے بھارت انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور کی ۳۷ ویں سالانہ رپورٹ پڑھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمپنی نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اور بڑی معقول تجارت کر رہی ہے۔ اپنے گاہکوں سے بھی اس کا معاملہ بہت منفعت بخش اور صاف ہے۔ بیمہ کرانے والوں کو سب سے پہلے اس قومی کمپنی کا خیال کرنا چاہیئے۔

اعلان

ادبی دنیا کے متعدد ناظرین اس قسم کے خطوط ارسال فرما دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مہینے کا رسالہ وصول نہیں ہوا۔ لہٰذا دوبارہ ارسال کریں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس قسم کی شکایات کی تعمیل صرف اُس صورت میں کر سکتے ہیں جب رسالہ پہنچنے کی شکایت اس ماہ کے اندر اندر دفتر میں آجائے جس ماہ کا رسالہ مطلوب ہو۔ علاوہ ازیں ہر حالت میں خریداری نمبر کا حوالہ دینا اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر تعمیل قطعاً ناممکن ہے۔

منیجر

مرزا

خاتونِ محترم - آج میں آپ کو اپنے سفر کا ایک واقعہ سُنانا چاہتا ہوں، ممکن ہے کہ یہ آپ کو دلچسپ معلوم ہو۔ تقریباً ایک مہینہ گزرا مجھے گورِی میں معلوم ہوا تھا کہ اِس جگہ سے چند میل کے فاصلے پر گورنر نے سینٹ ڈومنگو جیسی ایک کھیتی تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اور اِس لئے وہ وہاں ایک حبشی خاندان کو بسانا چاہتا ہے۔ بلاشبہ اُس کے دل میں یہ خیال جاگزین تھا کہ اِس مثال کو دیکھ کر افریقہ والوں میں شکر تیار کرنے کا شوق پیدا ہوگا، اور فرنگی اُن کی گردن میں غلامی کا ہیبت ناک طوق ڈال کر اُنہیں ملک بدر کرنے کی بجائے اپنی ہی قوم اور اپنے ہی ملک میں ایک آزاد تجارت میں لگائے رکھیں گے۔ ہمارے بہترین مصنفین نے دُنیا کو انسانی شرافت کا واسطہ دے کر یہ انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی لیکن اُنہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ یہ روشن دماغ مدبّر اپنے ذاتی اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے غلامی کے مسئلہ کو باقی دُنیا کے لئے چھوڑ سکتا تھا، یا اُن فوائد سے دستکش ہو سکتا تھا جن کے لئے غلامی کے قیام کی ضرورت ہے، لیکن حبشی جو مستقبل کو خود اپنے معاملے میں بھی فراموش کئے ہوئے ہیں اپنی آیندہ نسلوں کے لئے پیش بینی کر سکنے کے اِس سے بھی زیادہ ناقابل ہیں اور ذراسی شفقت کو یہ سوچے بغیر رد کر دیتے ہیں کہ آیندہ خدا جانے اُن کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ صرف ایک حبشی ایسا نکلا جو نیک دل گورنر کے آزاد کرنے پر اس کی کھیتی میں کام کرنے کو رضامند ہو گیا۔ اپنے علاقے میں وہ ایک شاہزادہ تھا! ادنیٰ طبقے کے کچھ حبشی اُس کے ساتھ ہو گئے اور اُس کی ہدایات کے ماتحت وہاں کھیتی باڑی کرنے لگے۔ مَیں نے اُس حبشی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ گورنر نے ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا۔ کوئی چار گھنٹے ہم چلتے رہے اور شام کے قریب ایک مکان کے پاس آئے جو میں نے سُنا کہ فرانسیسیوں کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا، لیکن جو اِس کے باوجود قدیم معلوم ہو رہا تھا۔

جس وقت مَیں وہاں پہنچا کچھ حبشی تفریح میں مشغول تھے۔ وہ تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ شاید وہ اُس وقت کی یاد تازہ کر رہے تھے جب اُن کی تنہا مصروفیت یہی ہوا کرتی تھی۔ اور ایک حبشی سردار کی بیوی تیر اندازوں سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی اور اپنی ننھی سی بیٹی کی طرف جو اُس کے سامنے زمین پر کھیل رہی تھی مضطرب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میرے رفیق نے آگے بڑھ کر اُس سے کہا "گورنر نے صاحب کو بھیجا ہے اور اُنہوں نے کہا ہے کہ اِن کے قیام کا انتظام کر دیا جائے"۔ وہ بولی، اچھا، اِن کو گورنر نے بھیجا ہے؟ اِن سے کہو کہ گھر میں چلیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب گورنر کی مہربانی ہے"

وہ نہایت خوش اخلاقی سے میری طرف بڑھی۔ اُس کے حُسن نے مجھے مسحُور کر دیا۔ وہ نسوانیت کا ایک مکمل نمونہ تھی، نرمی اور خُوبصورتی کا پیکر۔ میرے ساتھی نے پُوچھا "زیمیو کہاں ہے؟" اور ریکا نے جواب دیا "وہ سیر سے ابھی واپس نہیں آیا۔ وہ غروبِ آفتاب کے وقت سَیر کو جاتا ہے اور جب شفق کی سُرخی رات کی سیاہی میں تبدیل ہو جاتی ہے تب گھر آتا ہے، اور اُس کے آنے سے رات میرے لئے دن سے زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔" اِن الفاظ کے خاتمے پر اُس نے ایک آہ کی اور چلی گئی۔ جب وہ پھر ہمارے پاس آئی تو مَیں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر آنسُو بہہ رہے تھے۔ ہم مکان کے اندر داخل ہو گئے جہاں انواع و اقسام کے پھلوں سے ہماری تواضع کی گئی۔ اِن میں اِس ملک کے بعض ایسے پھل بھی تھے جو میرے لئے بالکل نئے تھے اور مَیں ان کو نہایت مسرّت اور دلچسپی سے کھا رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھٹکا اور ریکا چونک کر تیزی سے اُٹھی اور دروازہ کھول کر زیمیو سے جا لپٹی، جس نے بلا تامل اُسے بغل گیر کر لیا۔ مَیں بھی اُٹھ کر اُس سے ملا۔ آپ تصوّر نہیں کر سکتیں کہ وہ کتنا خوبصورت تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش میں سیہ فام لوگوں کی طرح کوئی عیب نہ تھا۔ اُس کی نظروں میں ایک ایسا اثر تھا جو اُس کے بعد مَیں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ یہ رُوح میں اُتر جاتی تھیں۔ اِن میں ایک ایسا غم پنہاں تھا کہ جس پر پڑتی تھیں اُس کے دل کو چیر جاتی تھیں۔ اُس نے ہماری طرف دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اُن خیالات کے سوا جو اُس پر پہلے سے مستولی تھے وہ کسی اجنبی احساس سے متاثر ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ مَیں نے اُس سے کہا کہ ہم گورنر کے ہاں سے آئے ہیں اور اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ اُس نے کہا "آہ مَیں گورنر کا بہت ہی احسان مند ہوں۔ یقین کیجئے، اِس جاگیر میں جہاں مَیں رہتا ہوں مَیں سمجھتا ہوں کہ ابھی میرا ایک محسن موجود ہے۔" گفتگو کے دوران میں کبھی کبھی وہ اُن وجوہ کا بھی ذکر کرنے لگتا تھا جو اُس کے یہاں رہنے کی محرک ہوئیں اور اُس وقت مَیں اُس کی عقل اور اُس کے زورِ بیان پر حیران رہ جاتا تھا۔ اُس نے میری حیرت کو محسوس کر لیا اور کہا "آپ لوگوں کو حیرت اِس لئے ہوتی ہے کہ آپ ہمیں بے حس جانور سمجھتے ہیں، حالانکہ ہماری اِس پستی کا باعث بھی آپ ہی ہوتے ہیں۔" مَیں نے کہا "نہیں، یہ بات نہیں، بلکہ مجھے اِس بات پر حیرت ہے کہ تم بالکل فرانسیسیوں کی طرح فرانسیسی زبان بولتے ہو۔" اُس نے کہا "آہ آپ سچ کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی فرشتے کی معیت میں کچھ دیر تک رہتے ہیں تو اُس کے نور کی کرنوں سے دیر تک ہماری رُوح روشن رہتی ہے۔ آہ اُس کی خوبصورت آنکھیں جو مجھ پر پڑیں اور پھر کسی دُوسری طرف نہ اُٹھیں۔" اور ریکا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسُو گرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد زیمیو نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا، "مجھے معاف کر دو۔ یہ تو گزرے ہوئے دنوں کا ایک افسانہ ہے، اور حال کی مالک تو تمہیں ہو۔" پھر میری جانب مڑ کر بولا "کل کھیتی دیکھنے چلیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ مَیں نے گورنر کی خواہشات کو کس حد تک پُورا کیا ہے۔ مَیں نے

اپنے گھر کا بہترین بستر آپ کے لئے تیار کرا دیا ہے، اب سو جائیے۔ مجھے آپ کے آرام کا بہت خیال ہے۔" پھر آہستہ آواز میں کہنے لگا" زخمی دل کو اپنے آرام کا خیال نہیں ہوتا، اُسے صرف دُوسروں کا آرام ملحوظ ہوتا ہے۔"

مَیں اپنے بستر پر جا لیٹا مگر سو نہ سکا۔ میرے دل میں غم کا نشتر چبھ چکا تھا اور ہر چیز مجھے مغموم نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ مجھے اِس غم کی وجہ معلوم نہ تھی لیکن مَیں اپنے دل میں اُسی قسم کا جذبہ محسوس کرتا تھا جیسا کسی مغموم تصویر کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ پَو پھٹتے ہی میں اُٹھ بیٹھا اور زیمبو کو گذشتہ شام سے بھی زیادہ مضمحل دیکھ کر مَیں نے وجہ دریافت کی۔ اُس نے کہا" میرا غم اب میرے دل میں پیوست ہو چکا ہے۔ یہ نہ کم ہو سکتا نہ مٹ سکتا ہے، لیکن زندگی کی یکسانیت نامعلوم طور پر غم کو بڑھا دیتی ہے، اور نئے واقعات خواہ وہ کچھ بھی ہوں نئے اثرات پیدا کرتے ہیں، جو اکثر آنسوؤں کا ایک نیا سرچشمہ ہوتے ہیں۔" اُس نے نہایت اچھی طرح مجھے تمام کھیتی دکھا دی اور مَیں ہر بات میں اُس کے حسنِ انتظام کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اِس جگہ کا رقبہ بھی اُسی قدر ہے جتنا سینٹ ڈومنگو کا ہے اور اُسی قدر آدمی یہاں بھی کام کرتے ہیں، لیکن اِن سے محنت اتنی شدید نہیں لی جاتی۔ مَیں یہ دیکھ کر خوش ہُوا کہ یہاں ظلم قطعاً مفقود تھا۔ مَیں نے زیمبو سے پوچھا کہ" تم نے کھیتی باڑی کا کام اور محنت کے لئے اوقات کی صحیح تقسیم کہاں سے سیکھی ہے۔" اُس نے جواب دیا" مَیں نے تھوڑی سی تعلیم بھی پائی ہے، لیکن عقل جس چیز کو ضروری سمجھتی ہے اُسے خود ہی معلوم کر لیتی ہے۔ چونکہ ہمیں مرنے سے منع کیا گیا ہے ہمارے لئے لازمی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو دُوسروں کی نظروں میں محترم بنائیں۔ مَیں بھی اَور کیا کر سکتا تھا؟ مَیں غلامی سے سخت خائف تھا۔ مَیں تمہاری قوم کے وحشیانہ منصوبوں کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا۔ مَیں بعض اوقات سوچا کرتا تھا کہ شاید فرنگیوں کا خدا ہمارے خدا کا دشمن ہے، اور اُس نے اُن کو ہمیں عذاب میں مبتلا کرنے کا حکم دے رکھا ہے؛ لیکن جب مجھے معلوم ہُوا کہ افریقہ والوں کے مصائب کا انسداد خود ہمارے اختیار میں ہے تو مَیں نے اِس کھیتی میں کام کرنا منظور کر لیا۔"

اِتنے میں ہمارے سامنے ایک پھاٹک آ گیا، جو ایک شاندار جنگل کی طرف کھلتا تھا، اور جس کے ساتھ اِس جاگیر کی حدود ملتی تھیں۔ مجھے یوں معلوم ہُوا کہ ابھی زیمبو اِس پھاٹک کو کھولے گا لیکن وہ اُس کو چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گیا۔ مَیں نے کہا" اِس طرف کیوں نہ چلیں؟" وہ بولا" ٹھہرئیے، آپ مجھے اہلِ دل معلوم ہوتے ہیں؛ کیا آپ میری بدنصیبی کی لمبی کہانی سننے کی تاب لا سکیں گے؟ دو سال ہو گئے ہیں کہ مَیں نے بات نہیں کی ——— جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں یہ بولنے میں شامل نہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ مَیں اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دوں، لیکن میرے اعتماد کو آپ خوشامد پر محمول نہ کیجئے گا۔ مجھے آپ کی خوش اخلاقی سے اِس بات کی جرأت ہوئی ہے اور مجھے آپ سے رحم کی توقع ہے۔" مَیں نے کہا" تم ڈرو نہیں۔ مَیں تمہیں دھوکا نہیں دُوں گا۔"

زیمیو نے کہا "مَیں کیور کی بادشاہی میں پیدا ہوا تھا۔ میرا باپ شاہی خاندان سے تھا۔ وہ چند قبائل کا سردار تھا جو بادشاہ کے حکم سے اُس کے ماتحت کر دیئے گئے تھے۔ مجھے ابتدا ہی سے اپنے وطن کی مدافعت کا سبق دیا گیا تھا، اور تیر اور کمان سے مَیں بچپن ہی میں واقف تھا۔ بچپن ہی سے مَیں اوریکا، اپنی پھوپھی کی لڑکی سے منسوب تھا، اور جب مَیں نے ہوش سنبھالا تو مَیں اُس سے محبت کرنے لگا۔ سب سے پہلے مَیں نے اُس سے محبت کی اور اُسی سے محبت کرنی سیکھی۔ اپنے ایک ہمسایہ قبیلے سے ہمیشہ ہماری جنگ رہتی تھی، اور چونکہ ہم دونوں قبیلے اپنے قیدیوں کو فرنگیوں کے پاس فروخت کر دیا کرتے تھے اِس لئے ہمیں ایک دوسرے سے ایسی شدید نفرت ہو گئی تھی کہ نامہ و پیام بھی ممکن نہ رہا تھا۔ ایک دن مَیں اپنے پہاڑوں میں شکار کرتا ہوا نامعلوم طور پر اِتنی دُور نکل گیا کہ جس کا مَیں نے ارادہ بھی نہ کیا تھا۔ وہاں مَیں نے ایک نسوانی آواز سُنی جس میں غضب کی شیرینی تھی۔ مَیں اُس کے گیت کو سنتا رہا، لیکن وہ کوئی ایسا گیت نہ تھا جیسے عموماً عورتیں گایا کرتی ہیں۔ آزادی کی محبت اور غلامی کا خوف اُس مقدس گیت کا موضوع تھا جس نے مجھ پر گویا جادو کر دیا تھا۔ مَیں اُس جگہ پہنچا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی میری طرف دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی عمر اور اُس کے خیالات کے تفاوت کو دیکھ کر مَیں حیران رہ گیا، اور اُس کے چہرے پر اُس فوق الفطرت جھلک کی تلاش کرنے لگا جو مسلسل تجربے کے بعد نقوش میں نمایاں ہوا کرتی ہے۔ وہ خوبصورت نہ تھی، لیکن اُس کے موزون و متناسب جسم، اُس کی جادو بھری آنکھوں اور اُس کے شگفتہ و شاداب چہرے کے علاوہ محبت کرنے والے کو اَور کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ وہ میرے پاس آئی اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کئی باتیں مجھ سے کہہ گئی۔ آخر میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا، میری حیرت یہ سُن کر اور بھی بڑھ گئی کہ جو گیت وہ گا رہی تھی وہ اُسی نے بنایا تھا۔ اُس نے کہا "اب اپنی حیرت کو ختم کرو۔ ایک فرانسیسی، جو اپنی قسمت پر مطمئن نہ تھا اور اپنے ملک میں مصیبت کا شکار تھا ہمارے ہاں آ کر رہ پڑا۔ اِس بوڑھے آدمی نے میری تربیت کا بیڑا اُٹھایا ہے، اور اُس چیز سے مجھے بہرہ ور کیا ہے جو فرنگیوں کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ تمنا ہے، یعنی علم جسے وہ بے محل استعمال کرتے ہیں اور فلسفہ جس کے اصولوں کی پابندی وہ کچھ زیادہ نہیں کرتے۔ مَیں نے فرانسیسی زبان سیکھی ہے، مَیں نے اِن لوگوں کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں، اور میں اِن پہاڑوں میں اکیلی سوچتی رہتی ہوں اور خوش ہوتی ہوں۔" اُس کا ہر ہر لفظ میری دلچسپی اور تعجب کو بڑھا رہا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی عورت نہیں ہے بلکہ کوئی آسمانی ہستی ہے جو مجھ سے باتیں کر رہی ہے، اور مجھے اُن لوگوں کے چہروں پر بھی ایسا شریفانہ جلال کبھی نظر نہ آیا تھا جو دن رات دیوتاؤں کی پرستش میں مشغول رہتے ہیں۔ رخصت ہوتے وقت مَیں نے اُس سے دوبارہ ملنے کی اجازت حاصل کر لی۔ جہاں میں جاتا تھا اُس کا خیال میرے ساتھ

ساتھ ہوتا تھا، لیکن میرے دل میں محبت کی بہ نسبت اُس کا احترام زیادہ تھا، اور اسی جذبے کو دل میں لئے ہوئے مَیں اس نوجوان خاتون سے جس کا نام مرزا تھا دیر تک ملتا رہا لیکن اِس سے میرے دل میں اوریکا کو ناراض کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ آخر ایک دن مَیں نے مرزا سے پوچھا کہ آیا اُس نے کبھی محبت بھی کی ہے۔ میں یہ سوال کرتے ہوئے کانپ گیا لیکن اُس کی معصوم فراست اور آزاد سیرت نے اُس کے لئے تمام جوابات آسان کر دیئے۔ اُس نے کہا" نہیں، مَیں نے محبت نہیں کی لیکن بعض اوقات مجھ سے محبت کی گئی ہے۔ شاید اس جذبے کو محسوس کرنے کی مجھے ہمیشہ خواہش رہی ہے۔ مَیں اس جذبے کو جاننا چاہتی ہوں جو ہماری زندگی میں جاری و ساری ہے اور صرف اپنے آپ میں سے وقت کے ہر لمحے کی تقدیر معیّن کرتا ہے، لیکن مَیں سمجھتی ہوں کہ مَیں نے اِس معمے کو حل کرنے کے لئے بہت سا غور و خوض کیا ہے۔ مَیں اپنے دل کے تمام جذبات کو محسوس کرتی ہوں اور مجھے دوسروں کے جذبات بھی محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے ابھی تک میرے نفس نے دھوکا نہیں دیا اور نہ کسی اَور سے مَیں نے دھوکا کھایا ہے۔" اِن آخری الفاظ سے مجھے کچھ تکلیف سی ہوئی۔ مَیں نے کہا" مرزا، مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ مسرّتیں صرف خیال تک محدود نہیں ہیں، رُوح میں جو ایک خلا سا معلوم ہوتا ہے اُسے صرف قلب کی مسرّتیں ہی پُر کر سکتی ہیں۔" اسی دوران میں اُس نے نہایت صبر کے ساتھ وہ سارا علم مجھے سکھا دیا جو وہ خود جانتی تھی۔ جب مَیں اُس کی تعریف کرتا تھا تو وہ اپنا سلسلۂ کلام منقطع کر دیتی تھی اور جب مَیں خاموش ہو جاتا تھا تو وہ پھر شروع کرتی تھی؛ اگرچہ مَیں اُس کا ایک ادنیٰ پرستار تھا لیکن مَیں نے اُس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ اُس کے دل میں میرے سوا اور کسی کا خیال نہیں ہے۔ آخر کار اُس کی شائستگی، اُس کی عقل اور اُس کی صورت سے مَیں مسحور ہو گیا اور مَیں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس سے محبت ہے، اور مَیں نے اِس محبت کے اظہار کی جرأت کر ڈالی۔ اُسے یہ یقین دلانے کے لئے کہ اُس کی ذات میں مجھے کتنی بلندیاں نظر آتی ہیں مَیں نے کیا کچھ نہ کیا! مَیں اس وقت محبت اور خوف سے اُس کے قدموں میں جان تک دے دینے کو تیار تھا۔ مَیں نے کہا" مرزا، مجھے یہ کہہ کر دنیا کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے، جنت کا دروازہ میرے لئے کھول دو کہ مَیں تمہارے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤں۔" یہ سن کر وہ بہت متاثر ہوئی اور اُن خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے جن میں اِس سے پہلے مَیں نے صرف ذہانت و فراست ہی کو دیکھا تھا۔ اُس نے کہا" زیمیو، کل مَیں تمہیں جواب دوں گی، اپنے ملک کی عورتوں کی طرح مجھ سے کسی تصنّع کی اُمید نہ رکھنا، کل میرے دل کا عکس اپنے دل میں دیکھ لینا اور میرے جواب کی تحریر پڑھ لینا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا تھا؛ وہ غروب آفتاب سے بہت پہلے چلی جایا کرتی تھی۔ مَیں نے اُسے ٹھہرانے کی کوشش نہ کی؛ اُس کی پُر عظمت سیرت کے آگے مَیں ہمیشہ جھک جایا کرتا تھا۔ مرزا کو جاننے کے بعد اُوریکا سے مَیں کم ملا کرتا تھا۔ مَیں نے اُسے فریب میں مبتلا کر دیا؛ مَیں سفر

کے بہانے اکثر گھر سے باہر رہتا تھا ، مَیں نے شادی کی تاریخ کو ملتوی کر دیا تھا ، مستقبل پر غور کرنے کی بجائے مَیں نے اُس کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دیا تھا ۔

آخر وہ کل آئی جو گزشتہ شام سے گویا ہزاروں سال کی مدّت کے بعد طلوع ہوئی تھی ۔ مرزا مجھ سے پہلے میری طرف بڑھی ۔ اُس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے ۔ اُس نے مضبوط لیکن نرم لہجے میں کہا " زیمیو ، کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے ؟ کیا یہ بھی یقینی ہے کہ اِس وسیع علاقے میں اور کسی نے تمہارے دل کو متاثر نہیں کیا ؟" مَیں نے کہا " ہاں مجھے تمہیں سے محبت ہے اور کسی سے نہیں ۔" اُس نے کہا " بہت اچھا ، مَیں تم پر اعتبار کرتی ہوں ۔ فطرت جو اِس وقت ہمیں چاروں طرف گھیرے ہوئے ہے ہمارے قول و قرار کی گواہ ہے ۔ جو کچھ مَیں نے تمہاری زبان سے سنا ہے اِس کے علاوہ مجھے تمہارے متعلق کچھ معلوم نہیں ۔ میری بے کسی اور میری تنہائی میری حفاظت کا کل سرمایہ ہے ۔ تمہاری خواہش کو پورا کرنے کے لئے مَیں نے بڑی مشکل اور بڑی بدگمانی کا مقابلہ کیا ہے ۔ زیمیو ، اُس عزت کو قائم رکھنا جو میرے دل میں تمہاری ذات کے لئے ہے ، مجھے محبت کرنے کی سزا نہ دینا ۔ مَیں نے اپنے رشتہ داروں ، اپنے دوستوں ، اپنے وطن سب کو صرف تمہاری خاطر چھوڑ دیا ہے ۔ مَیں تمہاری نظروں میں اتنا ہی محترم ہونا چاہتی ہوں جتنا بڑھاپا ، بچپن اور مصیبت ہوتے ہیں ۔ نہیں ، مجھے کچھ نظر نہیں آتا ، کچھ ـــ" مَیں نے اُسے بولنے سے روک دیا ۔ مَیں نے اُس کے پاؤں پر سر رکھ دیا ۔ مجھے اپنی سچائی کا یقین تھا ۔ حال کی قوت نے ماضی اور مستقبل کو میرے حافظے سے محو کر دیا تھا ۔ اللہ اللہ ! کیسی محبت آمیز تھیں اُس کی باتیں ! محبت میں وہ کتنی خوش تھی ۔ آہ ! اُن دو مہینوں میں جو اِس طرح گزرے دنیا بھر کی محبت اور مسرت اُس کے دل میں سما گئی ۔ مَیں مسرور تھا ، لیکن غیر محسوس طریقے پر میرا جوش ختم ہو چکا تھا ۔ انسانی فطرت عجیب متلون واقع ہوئی ہے ! مجھے دیکھ کر اُسے جو مسرت ہوتی تھی اُس سے مَیں بے حد مغرور ہو گیا تھا ، اور اب اُس کے لئے نہیں بلکہ اپنی خاطر اُس سے ملتا تھا ۔ مجھے اُس کی گرمجوشی کا اتنا یقین ہو گیا تھا کہ مجھے اُس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش نہ کرنی پڑتی تھی ۔ مرزا کو یہ بات محسوس نہ ہوئی ۔ وہ بدستور باتیں کرتی تھی ، جواب دیتی تھی ، روتی تھی ، مطمئن ہو جاتی تھی ، اور اُس کا محبت بھرا دل اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا تھا ۔ جب میں اس کو چھوڑنے کا خیال دل میں لاتا تھا تو مرزا کے اعتبار سے اتنا شرمندہ نہ ہوتا تھا جتنا کہ اپنی پُر فریب ذات سے کیونکہ بادشاہت کی ایک اور سرحد پر جنگ چھڑ گئی ، اور مَیں نے جنگ میں جانے کا فیصلہ کر لیا ، لیکن اِس کی اطلاع مرزا کو دینی ضروری تھی ۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مجھے اُس سے کتنی محبت ہے ۔ اُس کے پُر اعتماد اور شریفانہ اطمینان نے مجھ سے میرے قصد کے اظہار کی تمام طاقت سلب کر لی ۔ وہ میری ذات سے اِس قدر وابستہ معلوم ہوتی تھی کہ جب مَیں نے اپنی روانگی کا ذکر کرنا

چاہا تو میری زبان گنگ ہوگئی چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کو لکھ کر بتاؤں گا۔ وہ فن جو اسی نے مجھ کو سکھایا تھا اس کی تباہی میں استعمال ہونے والا تھا بیس مرتبہ میں اس سے رخصت ہوا لیکن اتنی ہی بار پھر واپس آگیا۔ اُس بدنصیب نے میرے رحم کو غلطی سے محبت پر محمول کیا۔ آخر میں چلا گیا اور میں نے اس کو خط لکھا کہ ادائے فرض کے احساس نے مجھے تم سے جدا ہونے پر مجبور کیا ہے، لیکن جونہی میں اس طرف سے فارغ ہوتا ہوں تمہارے قدموں میں واپس پہنچ جاؤں گا۔ اس نے اس کا کتنا حسین جواب لکھا! آہ اے محبت کی زبان! جب تخیل تجھے آراستہ کرتا ہے تو تو کتنی سحر کار بن جاتی ہے! آہ میری جدائی اسے کتنی شاق تھی، اور میری واپسی کی اسے کتنی تمنا تھی! میں اُس کی اس بے پناہ محبت کے خیال سے کانپ جایا کرتا تھا! کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میرا باپ کبھی ایک غیر قبیلے کی لڑکی کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کرے گا۔

جب میں نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا تو یہ تمام مشکلات میرے سامنے آگئیں۔ میں پھر اوریکا سے ملا۔ اس کا حسن، اس کے آنسو، پہلی محبت کی قوت، میرے اعزہ کی منت سماجت، میں کیا کہوں! ہر وہ چیز جو دل کی کمزوری کے وقت مغلوب نہیں ہوسکتی مجھے بے وفائی پر مجبور کر رہی تھی! چنانچہ اوریکا اور میں دیوتاؤں کی موجودگی میں ایک دوسرے سے وابستہ کر دئے گئے۔ اسی اثنا میں وہ وقت بھی آپہنچا جب میں نے مرزا سے واپسی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا! جو صدمہ میں اسے پہنچانے والا تھا مجھے خیال تھا کہ میں اسے کم کرسکوں گا، اور میں اسے ممکن خیال کرتا تھا۔ آہ جب ہماری محبت ختم ہوچکتی ہے تو ہم اس کے اثرات کا اندازہ نہیں لگا سکتے! اس وقت حافظہ بھی ہمیں مدد نہیں دیتا۔ جب میں اُن مناظر میں سے گزر رہا تھا جو میرے قول و قرار اور عیش و شادمانی کے گواہ تھے تو میرے احساسات کی عجیب کیفیت تھی، میرے دل کے سوا کوئی چیز بدلی ہوئی نہ تھی، اس کے باوجود میں ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔ جونہی مجھے مرزا نے دیکھا، اسے اتنی خوشی ہوئی جتنی ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں کن خوفناک منازل میں سے گزار کر بدقسمت مرزا کو اُس مقام پر لایا جہاں میرا بے وفا دل تھا! جب میں نے دوستی کا لفظ کہا تو میرے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے کہا "دوستی! تمہاری دوستی! وحشی انسان! کیا میرے دل کو تو دوستی کا جذبہ پیش کرسکتا ہے! مجھے موت پیش کر اب تو میرے لئے اور کچھ نہیں کرسکتا"۔ وہ بے جان ہوکر میرے پاؤں پر گر گئی۔ اس وقت میری محبت کا فریب کھل رہا تھا لیکن اُسی وقت میں دیانتدار بھی تھا۔ اس نے کہا "سنگدل آدمی، مجھے چھوڑ دو، وہ بوڑھا شخص جس نے بچپن سے میری نگہداشت کی، اور جو میرے لئے باپ کے برابر تھا ممکن ہے ابھی کچھ دن اور زندہ رہے: مجھے اس کے لئے زندہ رہنا ہے"۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے کہا "حقیقت میں تو میں مرچکی ہوں، لیکن اُسے ابھی میری ضرورت ہے۔ مجھے چھوڑ دو"۔ میں نے کہا "میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا، میں تمہاری نفرت کی تاب نہیں لاسکتا"۔ اس نے کہا "میری نفرت! ذمیو! اس

مت ڈرو۔ دنیا میں ایسے دل بھی ہیں جن میں محبت کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں ہوتا اور دوسرا ہر جذبہ ان کے اپنے خلاف عمل کرتا ہے۔ رخصت زمیو، اب تم پر کسی اور کا قبضہ ہونے والا ہے"۔ میں بولا۔ "نہیں نہیں کبھی نہیں"۔ اس نے کہا "اب مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے۔ کل اگر تم رات کو دن بھی کہہ دیتے تو میں مان لیتی، لیکن اب وہ بات کہاں۔ زمیو مجھے ایک دفعہ اپنی آغوش میں لے کر بھینچو، مجھے اپنی محبوبہ کہو، میرے ساتھ پہلے کی طرح ایک دفعہ پھر باتیں کرو جن کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس یاد کو تازہ کرنے کے لئے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ رخصت، جب میں تنہا ہوں گی تو یہ سب باتیں مجھے حاصل ہو جائیں گی، میرا دل ان کو ہمیشہ سنے گا۔ یہ یاد ہی اس موت کا باعث ہے جو مجھ پر طاری ہو رہی ہے اور میرے دل پر ہمیشہ طاری رہے گی۔ زمیو رخصت!"

اس آخری لفظ کی دل دوز آواز اور وہ کوشش جو اس نے مجھ سے جدا ہونے کے لئے کی اب تک میرے تصور میں موجود ہیں۔ اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اے خدا اس تصویر کے نقوش کو اور زیادہ روشن کر دے تاکہ میں اسے اور ایک لمحہ کے لئے دیکھ سکوں بلکہ محسوس کر سکوں کہ میں نے کیا کھو دیا تھا۔ میں دیر تک بے حس و حرکت اسی جگہ کھڑا رہا جہے وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی ــــ اس بدبخت انسان کی طرح پریشان اور مضطرب جس سے کوئی نہایت مہیب گناہ سرزد ہوا ہو۔ جب مجھے گھر جانے کا خیال آیا تو رات ہو چکی تھی۔ ندامت، گذشتہ دنوں کی یاد، مرزا کی مصیبت کا احساس میری روح پر چھا گیا تھا۔ اس کی صورت بار بار میرے سامنے اس طرح آکھڑی ہوتی تھی جیسے اس کی مسرت کے ساتھ اس کی زندگی بھی ختم ہو گئی ہو۔

پھر مرزا کے قبیلے والوں کے ساتھ ہماری جنگ چھڑ گئی اور مجھے بھی ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ میں اس کی نگاہوں میں معزز بننا چاہتا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کا انتخاب غلط نہیں تھا، اور اس محبت کی اہمیت بڑھانے کے لئے بھی جس سے میں نے منہ موڑ لیا تھا۔ مجھے موت کا کچھ خوف نہ تھا۔ اور زندگی کو میں نے ایسی بری طرح صرف کیا تھا کہ میں شاید اسے ایک خفیہ مسرت کے ساتھ خطرے میں ڈال رہا تھا۔ میں خطرناک طور پر زخمی ہوا، لیکن صحت ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ ایک عورت بے حس و حرکت ہو کر میرے دروازے پر پڑی رہتی تھی۔ لیکن ذرا سے کھٹکے پر بھی چونک اٹھتی تھی۔ اور جب ایک دن میری حالت بہت خراب تھی تو وہ غش کھا گئی، لیکن جب اسے ہوش آیا تو کہنے لگی "اس شخص کو میری اس حالت کی خبر نہ دینا جس میں تم لوگوں نے مجھے دیکھا ہے، اس کے لئے میری حیثیت ایک اجنبی سے بھی کم ہے میرے ذکر سے اسے تکلیف ہو گی"۔ آخر کار ایک دن کیسا یادگار تھا وہ دن، جب میں ابھی بہت کمزور اور ناتوان تھا میرے خاندان کے لوگ اور پکاسمیت مجھے ملنے کے لئے آئے۔ اس کی یاد کو بھلا کر جسے میں نے مایوسی کے غار میں دھکیل دیا تھا میں اب سکون کی حالت میں تھا، کم از کم میں یہ سمجھتا تھا کہ مجھے سکون حاصل ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قسمت نے مجھے

اس حال کو پہنچایا ہے۔ اور حقیقت میں مجھ سے یہ باتیں اس طرح سرزد ہوئیں جیسے قسمت مجھ سے یہ سب کچھ کرا رہی تھی، اور میں پشیمانی سے اتنا خوفزدہ ہو رہا تھا کہ اپنے خیالات کو ماضی پر مرکوز رکھنے کے لئے اپنی انتہائی کوشش صرف کر رہا تھا۔ جس قصبے میں ہم رہتے تھے اس میں ہمارے دشمن یکایک گھس آئے۔ ہم مدافعت کرنے کے ناقابل تھے تاہم ہم نے دیر تک مقابلہ کیا لیکن آخر کار وہ کامیاب ہوگئے اور ہمارے بہت سے آدمی انہوں نے قید کر لئے۔ انہیں میں میں بھی تھا۔ میرے جذبات اُس وقت کیا تھے جب میں نے اپنے آپ کو بیڑیوں میں جکڑا ہوا پایا! ظالم ہاٹن ٹاٹ اپنے اسیروں کو صرف مار دیتے ہیں، لیکن ہم جو اُن سے بڑھ کر وحشی ہیں اپنے مشترک دشمنوں کے کام آتے ہیں اور اُن کے جرم کو ان کے ساتھ شریک ہو کر حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ اپنے مخالف قبیلے کی ایک جماعت کے ساتھ ہم رات بھر چلتے رہے۔ جب دن چڑھا تو ہم نے اپنے آپ کو دریائے سنیگال کے ساحل پر پایا جہاں کشتیاں پہلے سے تیار کھڑی تھیں۔ میں نے سفید فام لوگوں کو دیکھا، اور اپنے انجام سے آگاہ ہو گیا۔ ہمارے صیاد فرنگیوں سے اپنے مال کا ذلت آمیز سودا چکانے لگے۔ فرنگی ہماری قوت اور ہماری عمر کو نہایت احتیاط سے جانچ رہے تھے تاکہ اس کی بنا پر معلوم کریں کہ ہم میں سے کون کون ان کی زبوں کاریوں کی دیر تک تاب لا سکتے ہیں۔ میں اپنے دل میں ایک ارادہ کر چکا تھا۔ مجھے امید تھی کہ کشتی میں منتقل ہوتے وقت میری زنجیریں ڈھیلی کر دی جائیں گی اور میں دریا میں کود سکوں گا۔ پھر اگر میرے حریص مالکوں میں سے کوئی مجھے بچانے کے لئے کود ابھی تو لوہے کا بوجھ مجھے اس سے بچا کر دریا کی تہ تک پہنچانے میں پوری مدد دے گا۔ میری آنکھیں زمین پر جمی ہوئی تھیں اور میرے دل میں یہ خطرناک امید تھی جس کا میں نے ذکر کیا، اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنے ماحول سے الگ ہو گیا ہوں۔ یکایک ایک آواز نے جو میرے رنج و حزن کی آشنا معلوم ہوتی تھی میرے دل میں ایک کھلبلی سی ڈال دی اور میرے پُرسکون تفکرات کو اڑا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا؛ سامنے مرزا کھڑی تھی؛ لیکن ایک فانی انسان کی طرح نہیں بلکہ ایک خوبصورت فرشتے کی مانند کیونکہ اُس کے چہرے پر نیکی کا نور جلوہ ریز تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ فرنگیوں کو اپنی بات سنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی آواز لرز رہی تھی؛ لیکن اس کی وجہ نہ خوف تھا نہ کمزوری۔ اس نے کہا: "فرنگیو! تم اپنی زمینوں کی آبادی کے لئے ہمیں غلام بناتے ہو، تمہارا مفاد اور ہماری تباہی لازم و ملزوم ہیں، تم بدی کے دیوتا کی مانند ہو، اور جس مصیبت میں تم ہمیں مبتلا کر دیتے ہو اس سے ہماری جانیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ اس نوجوان کی طرف دیکھو! جو زخموں کی وجہ سے کمزور ہو رہا ہے، یہ نہ تو کوئی طویل سفر کرنے کے قابل ہے نہ کوئی مشقت۔ تم میری قوت اور جوانی بھی دیکھ رہے ہو۔ یہ بھی جان لو کہ میری صنفی کمزوری نے میرے حوصلے کو کمزور نہیں بنایا۔ زمیو کے بجائے مجھے غلام بنا لو۔ اس کی بجائے میں اسیر ہونے کو تیار ہوں۔ کیا تمہارے نزدیک اُس کی آزادی

اپنے غم میں شریک اور تشفی دیتے ہوئے سنتا ہوں، چونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری آئندہ حالت کیا ہوگی، اس لئے میں اپنے دل میں مرزا کے غم کو زندہ رکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنا خاتمہ کر دیا تو اس کی یہ ایک یادگار بھی مٹ جائے گی۔ دو سال گذر چکے ہیں اور صرف آپ کے سامنے میں نے اپنے غم کا افسانہ کہا ہے۔ لیکن میں آپ سے رحم کا متمنی نہیں ہوں۔ کیا اس وحشی پر رحم کرنا چاہئے جو ایک ایسی گرانمایہ ہستی کی موت کا باعث ہوا ہو! صرف مجھ سے یہ وعدہ کیجئے کہ آپ کبھی مرزا کا نام نہیں بھولیں گے، اپنے بچوں سے اس کا ذکر کریں گے، اور اس محبت کے فرشتے اور بدنصیبی کے پیکر کا نام میرے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھیں گے۔"

یہ کہانی ختم کر کے زمیوسکے خوب صورت چہرے پر غم کا ایک سیاہ پردہ چھا گیا۔ میں آنسوؤں میں نہا گیا تھا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی، لیکن بول نہ سکا۔ اس نے کہا "کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ میرے دل کو تسکین دے سکتے ہیں؟ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ میری مصیبت کے اس افسانے میں کوئی بات بھی آپ کی سمجھائی ہوئی نہیں ہے؟ میں چاہتا تھا کہ ان حالات سے آپ کو آگاہ کر دوں، لیکن یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ ان کا کچھ علاج نہیں کر سکیں گے۔ اگر اس کی یاد مجھ سے چھین لی جائے تو میں مر جاؤں گا۔ ندامت کا آتشیں عذاب اس کی جگہ لے لے گا۔ اور میرے دل پر کلیتہً مسلط ہو جائے گا۔ اچھا خدا حافظ۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری کہانی سن لی۔"

اُس کے غم انگیز سکون اور اس کی ناامیدی نے جو آنسوؤں کے ذریعے سے نکلنے کی راہ نہ پاتی تھی جلد ہی مجھے اس بات کا قائل کر دیا کہ اس کو تسکین دینے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میں اس موضوع پر اس سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، کیونکہ مصیبت میں ایک قسم کا رعب بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نہایت آزردہ دل کے ساتھ اس سے رخصت ہؤا۔ اور اب اپنے وعدے کے ایفا میں مرزا کا نام زندہ کرنے کے لئے یہ کہانی آپ کو لکھ رہا ہوں +

(مادام دستیل)

منصور احمد

ساون کے گیت

چوماسہ ہندوستان کی بہار ہے۔ ساون ہندوستان میں وہی کیفیت پیدا کرتا ہے جو مارچ ایران یا بعض دوسرے سرد ممالک میں چوماسہ اساڑھ سے شروع ہو کر اسوج تک رہتا ہے۔ ان دنوں ملک بھر میں بارشیں ہوتی ہیں۔ انتہائی گرمی کے بعد بارش جو لطف پیدا کرتی ہے اس کا بیان مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔ ساون میں چوماسہ اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ ملک کے مزاج میں اعتدال آجاتا ہے۔ زمین اپنے رنگین خزانے اگل دیتی ہے کوئل پپیہے اور مور کی دلکش و دلدوز صداؤں سے فضا معمور ہو جاتی ہے۔ بارش فرحت پیدا کرتی ہے تو مرد چوپالوں میں اور عورتیں گھروں میں جشن مناتی ہیں۔ ساون کی مصروفیات میں "جھولا" نہایت موہنی چیز ہے۔ "پکوان" اور "چرخہ" دوسرے نمبر پر ہیں۔

یہ تین چیزیں برسات کا سنگار ہیں۔ "چرخہ" اس لئے کہ برسات میں فضا نمناک ہوتی ہے اور روئی کی تار باریک نکلتی ہے۔ پکوان اس لئے کہ کچھ تو ٹھنڈ کا مقابلہ آگ سے کیا جائے، کچھ اس لئے کہ ساون میں بھوک بڑھ جاتی ہے۔ بارشوں کی وجہ سے گھر کے معمول میں فرق آجاتا ہے۔ غذا میں تنوع کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، اور سرُود دل کسی قدر اچھا کھانا چاہتے ہیں۔ رہ گیا "جھولا"۔ تو یہ ایک قیامت ہے جو ہر سال ہندوستان میں برپا ہوتی ہے۔ یہ بچوں اور جوان عورتوں کا دلکش شغل ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح "جھولے" کی مختصر تاریخ معلوم ہو جائے۔ لیکن جھولے کی تاریخ پر قدامت کے اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کہ اس کی ابتدا تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔

"جھولا" خالص ہندوستانی چیز ہے۔ اور ملکوں میں اس کا رواج شاذ ہے۔ اس کا رواج ہندوستان میں نشاط و لطف کی ایک دلکش تفسیر ہے۔ لیکن دنیا میں خوشی اور غم توام ہیں۔ جب نوجوان بیوائیں یا مہجور دلہنیں جھولے کے پاس پہنچتی ہیں تو یہی "جھولا" جو لطف و نشاط کا گہوارہ ہوتا ہے آگ کی سیخ بن جاتا ہے اور پھر ان کے دردمند گیتوں سے فضا میں جو ہلکا ہلکا درد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بیان ممکن نہیں۔

عشق و محبت کے کامیاب اور ناکام پہلوؤں کو دیکھنا ہو تو "جھولے" کو دیکھئے۔ اس کے گیت سنئے۔ جو در حقیقت عشق و محبت کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ محبت کے ہر پہلو کی ترجمانی یہاں ہوتی ہے، اور ایسی ایسی چیزیں بیان کی جاتی ہیں جو حقیقتاً آرٹ کی جان ہیں، اور ہمارے اردو شاعروں کو جن کی ہوا تک نہیں لگی

آدھا ساڑھ گذر جاتا ہے بارشیں ہوتی ہیں کڑاہیاں چڑھ جاتی ہیں جھولے پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت اپنے پرائے یاد آتے ہیں۔ ہندوستان میں بیٹی ہمیشہ سے پرایا دھن ہے اور عموماً اپنے گھر سے دو چار کوس کے فاصلے پر بیاہی جاتی ہے۔ ایک نئی دلھن جو ابھی سسرال میں آئی ہے اور کم سن ہے جھولے پر گیت گاتی ہے ۔

نیم کی نبولی پکی، ساون کب کو آئے گا۔ جیوے میری ماں کا جایا گاڑی بھیج بلائے گا
گاڑی کے پہیے چرکے، بیلوں کی ٹالیاں بھائیوں کے چہرے چمکے، بھاوجوں کی چنریاں
نیم کی نبولی پکی، ساون کب کو آئے گا کاکڑی خربوزے پکے، ہم کو کون کھلائے گا
جیوے میری ماں کا جایا گاڑی بھیج بلائے گا

کہتی ہے نیم تو پکنے لگے ساون کب آئے گا۔ کیونکہ اسے یقین ہے کہ ساون کی بہار میں ماں یاد کرے گی وہ بھائی کو بھیج کر بلائے گی۔ لیکن ساون آیا نہ بھائی آیا۔ ککڑی خربوزے کی فصل ہے۔ سسرال میں کچھ شرم کے مارے کچھ ماں جیسا پاؤ نہ ہونے کی وجہ سے کون کھائے کھلائے گا۔ پھر بھائی کو دعائیں دیتی ہے کہ میرا ماں جایا سلامت رہے وہ گاڑی بھیجکر بلائے گا" اور چشم تصور سے دیکھتی ہے کہ گاڑیوں کے پہیے چرکتے آرہے ہیں، بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں، بھائیوں کی پگڑیاں اور بھاوجوں کی چنریاں چمک رہی ہیں اور وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے کہ جونہی یہ گیت جھولے پر شروع ہوتا ہے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔ دلھنوں کو اپنا گھر یاد آتا ہے، سہیلیوں کی یاد ستاتی ہے، ماں باپ کے گھر کی بے تکلفی یاد آتی ہے جس خاک پر کھیل کود کر اتنی ہوئیں وہ یاد آتی ہے۔ اور پھر یہ خیال شدید ہوتا ہے تو آنسو نکل آتے ہیں۔ چند ایسی ہوتی ہیں جن کے بھائی نہیں ہوتے، اُوت نپوت گھر کی ان کا رونا دیکھا جاتا ہے نہ سہا جاتا ہے۔ کنواریاں اس وقت کے تصور سے رو پڑتی ہیں جب وہ پرائے گھر ہوں گی۔ غرض یہ گیت اپنی سادگی اور صداقت سے عجب اثر پیدا کرتا ہے ۔

جھولے" پر ایک مہجور سہاگن گا رہی ہے

میرے تھم کے تلے کی چکنی ماٹی بوند پڑے رس جائے رے
دل برسے کالی بدلی سا
تیری جوتی اوپر چکن ہرکن، تیری پگیا جیسے مور رے
دل برسے کالی بدلی سا

یہ گیت کتنا مختصر لیکن کتنا جامع اور بلیغ ہے۔ جھولنے والی کہہ رہی کہ میرا دل فرقت میں کالی بدلی کی طرح برستا ہے۔

لیکن جس تھم میں جھولا پڑا ہے اس کے آس پاس کی زمین جو بوند گرتی ہے زمین میں رس جاتی ہے۔ اور کسی کو میرے رونے کی خبر نہیں ہوتی اس کے بعد اپنے خاوند کو یاد کرتی ہے کہ تیری جوتی پر چکن کڑھے ہوئے تھے اور تیری پگڑی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مور۔ طرۂ شملہ اور پگڑی کو بحیثیتِ مجموعی مور سے تشبیہ دی ہے مور اور ساون کی رعایت کے علاوہ تشبیہ کتنی بلیغ ہے۔

آج کل مزدوری اور سرمایہ داری میں ایک کاغذی اور لفظی جنگ جاری ہے۔ اُردو شاعر بھی اس جنگ میں بقدرِ ہمت حصہ لے رہے ہیں۔ میں چھوٹے پر ایک مزدور سہاگن کا گیت درج کرتا ہوں۔ اسے پڑھ کر انصاف سے بتایئے کہ اتنی مؤثر چیز آپ نے کسی زبان کے لٹریچر میں دیکھی ہے؟

اماں سب کی دھیاں بابل کے دیس　　ہم کیوں چھوڑے پردیس، ساون آیا
گیلے جو کا پیسنا، موٹا پیسوں کوئی نہ کھائے　　پیسوں مہیں اماں تو اُڑ اُڑ جائے
ہم کیوں چھوڑے پردیس، ساون آیا　　اتنا آٹا میں نے پیسا، جتنا ندیوں ریت
اتنی روٹی میں نے پکائی، جتنے پیپل پات　　روٹی روٹی بٹ گئی اک ٹکیا رہ گئی پاس
چھوٹا سا دیور لاڈلا، وہ بھی لے گیا چھین　　ہوتی جو گھر بابل کے ٹکیا لیتی چھین

دھکے دیتی چار، ساون آیا

یہ گیت لمبا ہے روٹی کے علاوہ لسی کا ذکر ہے، چاولوں کا ذکر ہے۔ گھر غریب ہے۔ نئی آئی بہو کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کو کھلا کر کھائے، سب کو سُلا کر سوئے۔ بہو بچاری نئی ہے وہ دن بھر محنت کرتی ہے۔ آٹا پیستی ہے۔ موٹا پسے تو کوئی روٹی نہیں کھاتا، باریک پسے تو اُڑتا بہت ہے۔ جوں توں کر کے وہ آٹا پیستی ہے۔ روٹیاں پکاتی ہے۔ گھر والے کھا چکتے ہیں تو ایک ٹکیا باقی رہ جاتی ہے۔ باہر سے چھوٹا سا دیور کھیلتا ہوا آتا ہے اور وہ ٹکیا بھی چھین لیتا ہے اُس وقت بہو اپنے ماں باپ کو یاد کر کے روتی ہے۔

ایک اور مزدور عورت کا گیت سنئے۔

دو بنگلے میرے بابل کے دیس بیٹھیں پنچھ پسار　　اُڑ جائیں جو کوسن پچاس بیٹھیں گے مرلی مار
اوروں کی دھیاں بابل کے دیس ہم ہیں ری ماں پردیس　　بھیجو بھیجو اماں میرے لیون ہار، دھی کو لے بلائے
کس کو بھیجوں تجھ کو لینے، باپ مغل کی چاکری　　بھیجو بھیجو اماں بھائی کو۔ بھینا کو لے بلائے

[1] پردہ دار گھروں میں جہاں درخت نہیں ہوتے اور چھتیں کمزور ہوتی ہیں تھم گاڑ لئے جاتے ہیں اور ان میں جھولا ڈالا جاتا ہے۔ [2] لڑکیاں

کیسے بھیجوں بھائی نادان، بھاوج رو رو جائے　　بھیجو بھیجو اماں میرے چچا کو بھتیجی کو دے جائے
اُٹھ کر چچا چلے آدھی رات، آکے چبوترے دی پکار　　کہیے بھتیجی دکھ سکھ کی بات، پھر چلیں اپنے بار
دن کو چاچا چرخے کی لاٹھ، راتوں کو ستھا پھیرنا　　توڑ دے لڑکی چرخے کی لاٹھ، بگڑ کھنڈا دے پینا

جیویں جیویں چچا تیرے پوت، دیا ہے ماں سے ملائے

کہتی ہے کہ میکے میں دو بگلے تھے وہ اپنے آشیانوں میں اطمینان سے پنکھ پسار کر بیٹھتے تھے۔ باہر جاتے تھے تو بھیچ کراور من مار کر بیٹھتے تھے۔ یہی حال میرا ہے۔ اپنے گھر پر بے فکر تھی پردیس میں من مار کر گذارتی ہوں۔ ماں مجھے بلالو۔ ماں پوچھتی ہے کیسے بھیجوں تیرا باپ مغلوں کی نوکری میں ہے۔ بھائی نادان ہے۔ آخر چچا لینے آتا ہے۔ اس کا دکھ سکھ پوچھتا ہے کہتی ہے دن بھر چرخہ کاتتی ہوں رات بھر چکی کا ہتا پھیرتی ہوں چچا کہتا ہے۔ چرخہ توڑ دے پینا پھینک دے۔ وہ چچا کو دعائیں دے کر ساتھ ہو لیتی ہے۔

ایک چھوٹا سا گیت ملاحظہ ہو۔

سانپوں نے چھوڑی کینچلی　　ندیوں نے چھوڑا جل نیر
اب کے چوماسے پیا گھر آؤ
آموں پہ کوکے کوئل　　بن میں کوکے مور
اب کے چوماسے پیا گھر آؤ

ایک سہاگن کا بھائی لینے آتا ہے سسرال والے اُسے بھیجنا نہیں چاہتے۔ دیکھئے

بنگلے میں بیٹھا میرا سسرا بھلا رُت ساون کی　　کہے تو بھیا سنگ جاؤں، رُت ساون کی
مجھے نہ پوچھ مری بھلی بہو، رُت ساون کی　　اپنے تو کنتھا جی سے پوچھ، رُت ساون کی
چرخے پہ بیٹھی مری ساس بھلی رُت ساون کی　　کہے تو بھیا سنگ جاؤں، رت ساون کی
مجھے نہ پوچھ مری بھلی بہو، رُت ساون کی　　اپنے تو کنتھا جی سے پوچھ، رُت ساون کی

چوپال میں خسر بیٹھا ہے۔ بہو جا کر پوچھتی ہے کہ بھائی لینے آیا ہے، مجھے جانے کی اجازت دو۔ وہ کہتا ہے بھلی بہو اپنے خاوند سے پوچھ۔ پھر وہ ساس کے پاس جاتی ہے، وہ بھی یہی جواب دیتی ہے۔ دیکھئے ہندوستانی گھرانوں میں بہو ساس اور خسر کا کتنا آدر کرتی ہے کہ ہر کام میں اُن کی اجازت چاہتی ہے۔ پھر وہ خاندان کے اور لوگوں کے پاس جاتی ہے جو اُس کے خاوند سے بڑے ہیں۔ وہاں بھی یہی جواب ملتا ہے۔ آخر وہ خاوند کے پاس جاتی ہے۔

چوکی پہ بیٹھا میرا ننھا بھلا، رُت ساون کی　　کہے تو بھیا سنگ جاؤں، رُت ساون کی
کوٹھی میں جتنے دھان بھرے ہیں، رُت ساون کی　　سب کے چاول کر جاری، رُت ساون کی
کوٹھی میں جتنے گیہوں بھرے ہیں، رُت ساون کی　　سب کا آٹا کر جاری، رُت ساون کی

خاوند اُسے خانہ داری کے فرائض کا احساس کراتا ہے اور گھر کی ہر چیز کا نام لیتا ہے۔ دھان، گیہوں، کپاس، دودھ، اور کہتا ہے کہ ان سے فراغت پا اور چلی جا۔ گھر کا کام کون کرے گا۔ ماں بوڑھی ہے۔ تیری نند سُسرال میں ہے، اور آخر میں کہتا ہے کہ ابھی تیرے بچہ پیدا ہوگا، وہاں نہ جا۔ اب وہ بھائی سے کہتی ہے۔

اب کیوں بیٹھا ماں کے جائے، رُت ساون کی　　پاپی نے دیا ہے جواب، رُت ساون کی

دوسرا گیت اسی قسم کا ہے۔ ساس دیکھئے کس ترکیب سے بہو کو روکتی ہے۔ بھائی بہن کو لینے جاتا ہے۔ اپنی ماں سے کہتا ہے میں بہن کے گھر جا رہا ہوں بہن کے لئے کپڑے اور اس کی ساس کے لئے سوغات دو۔

اماں گٹھڑی باندھ دے، میٹھا پکا پکوان　　کس کو دے گا گٹھڑی دُلارے، کس کو دیگا پکوان
بہن کو دوں گا گٹھڑی اماں، ماسی کو ساٹ سلام

گھر سے رخصت ہو کر وہ بہن کی سُسرال میں پہنچتا ہے۔

بھیج دے ماسی بہن کو، آیا ہوں میں اُسے لین　　ساون آیا ری
کیسے بھیجوں بہو کو، ڈھاکوں رُندھی ہے راہ　　ساون آیا ری
ڈھاک کٹا کر ماسی، بہن کو لوں گا لنگھا　　ساون آیا ری
کیسے بھیجوں بہو کو، ندیوں رُندھی ہے راہ　　ساون آیا ری
ندی پہ پُل بندھوا کر، بہن کو لوں گا لنگھا　　ساون آیا ری
کیسے بھیجوں بہو کو، سانپوں رُندھی ہے راہ　　ساون آیا ری
سانپوں کو دودھ پلا کر، بہن کو لوں گا لنگھا　　ساون آیا ری
کیسے بھیجوں بہو کو، گود ہے چھوٹا سا پوت　　ساون آیا ری
ماموں بھیا گھوڑے پہ، بہن ڈولی کے بیچ　　ساون آیا ری

ساس کہتی ہے، بہو کو کیسے بھیجوں، ساون کا مہینہ ڈھاک سرسبز ہو رہے ہیں۔ راستے رُکے ہوئے ہیں۔ بھائی کہتا ہے میں ڈھاک کٹوا کر اسے لنگھا (گذار) لے جاؤں گا۔ ساس کہتی ہے، ندیاں چڑھی ہوتی ہیں۔ بھائی کہتا ہے، پُل

بندھوالوں گا۔ ساس کہتی ہے، سانپ راستے روکے ہوئے ہیں۔ بھائی کہتا ہے، انہیں دُودھ پلاتا جاؤں گا۔ ساس کہتی ہے، بچہ چھوٹا ہے۔ بھائی کہتا ہے، ہم ماموں بھانجا گھوڑے پر ہوں گے اور بہن ڈولی میں جائے گی۔ اور آخر بہن کو لے جاتا ہے۔

ایک ساون کا گیت اور دیکھئے کتنا خیال آفریں ہے۔

سرل سینبل میں جھولا پڑا ہے جس میں جھولن میں چلی　　گود بھتیجا، ہاتھ کشیدہ، پادھا پوچھن میں چلی

کھولو تو پادھے اپنی پوتھی، کب گھر آئیں لشکری　　آج نہ آوے بی بی کل نہ آوے، چھٹے مہینے لشکری

کہو کہو نند سپنے کی باتیں، کب گھر آوے لشکری　　آج نہ آوے بھاوج کل بھی نہ آوی پرسوں کو آوی لشکری

داروں پادھے تیری پوتھیاں آگ دھتورا مکھ بھروں

چوموں چاٹوں نند ترا مکھ، پرسوں جو آئے لشکری　　نہائے دھوئے بھاوج کرے سنگار آج گھر آئے لشکری

کہو تو کہو بالم لشکر کی باتیں، کیا کچھ بیتی لشکری　　دن کو تو گوری لشکر میں رہنا، رات اکیلے لشکری

کہو تو گوری تیجن کی باتیں کیا کچھ بیتی گوری جی　　دن کو تو بالم تیجن میں رہنا، رات اکیلی لشکری

کہتی ہے اونچے سیدھے سینبل کے درخت میں جھولا پڑا ہے، میں جھولنے چلی تھی۔ لیکن گود میں بھتیجا ہے، ہاتھ میں کشیدہ ہے، وہ رستہ چھوڑ کر پادھے کے پاس گئی کہ ذرا پوتھی کھول کر دیکھو فوجی کب آویں گے؟ پادھا بتاتا ہے چھ مہینے بعد۔ خاوند لڑائی پر ہے۔ نامہ و پیام کے ذرائع بند ہیں محبت گدگداتی ہے۔ پادھے کے کہے کا یقین نہیں آتا۔ نند سے پوچھا کہ تم نے خواب دیکھا ہو تو بتاؤ۔ نند بتاتی ہے کہ پرسوں لشکری آئیں گے۔ بھائی بھی آئیں گے۔ سہاگن خوش ہوتی ہے۔ پادھے کو گالیاں دیتی ہے کہ تیرے منہ میں آگ دھتورہ! تو نے چھ مہینے بتلائے۔ نند پر خوش ہوتی ہے۔ تیسرے دن خاوند آتا ہے۔ کہتی ہے سناؤ کیسی گذری۔ وہ کہتا ہے دن بھر فوج کا ہنگامہ رہتا تھا رات کو تنہائی محسوس ہوتی تھی۔ تم تیجن (جہاں عورتیں مل کر چرخہ کاتتی ہیں) کا حال سناؤ۔ وہ کہتی ہے دن بھر کاتنے میں گذر جاتا تھا رات کو میں بھی تنہائی محسوس کرتی تھی۔

ایک گیت اور سنئے۔ ہندوستانی لڑکی کے اخلاق کی کتنی سچی تصویر ہے۔ گیت بہت لمبا ہے۔ اس لئے گیت کا وہی حصہ درج کروں گا جہاں لڑکی ایثار سے کام لیتی ہے۔ باقی گیت کا مطلب بیان کر دیتا ہوں۔

نند بھاوج پنگھٹ پر جاتی ہیں۔ بھاوج ایک کچھوے کو دیکھ کر نند کو طعنہ دیتی ہے کہ تیرا منگیتر بالکل اسی وضع کا ہے۔ نند شرماتی کم ہے غصے زیادہ ہوتی ہے، اور گھڑا لے کر مکان پر پہنچتی ہے۔ اب ماں بیٹی کا مکالمہ سنئے!

اٹھ اٹھ ری اماں گھڑا اتار، نہیں دوں گی اس کو پھوڑ
کس نے پیاری بول بولے، کس نے دیں تجھے گالیاں
بھاوج ری اماں بول بولے، بھاوج دے گالیاں
بھاوج کو رانی دوں گی نکلوا، بیر کو بھیجوں ننھیال
بھاوج میری سجنوں کی دھی، اور بیر گاؤں کا چودھری
بھاوج سے میری اماں اپجین گے لال بیل بڑھے گی باپ کی

لڑکی ماں سے کہتی ہے گھڑا اتروا لو نہیں تو پھوڑ دوں گی۔ ماں پوچھتی ہے بیٹا کس نے کچھ کہدیا۔ لڑکی کہتی ہے بھاوج طعنے مارتی ہے۔ ماں کہتی ہے غم نہ کر اُسے نکلوا دوں گی، تیرے بھائی کو ننھیال بھیج دوں گی۔ لڑکی کہتی ہے نہیں ماں بھاوج شریفوں کی لڑکی ہے، بھائی گاؤں کا چودھری ہے۔ بھاوج کی کوکھ سے لال اپجین گے، میرے باپ کی نسل چلے گی، تو مجھے ہی گھر سے دفع کر دے۔ ماں اس کی شادی کا انتظام کرتی ہے۔ برات آتی ہے اب نند بھاوج سے کہتی ہے

اٹھ اٹھ ری بھاوج باغ تماشہ، پھوا بیاہنے آیا ری
میری تو آنکھیں دکھیں بھاوج اٹھ کے دیکھو برات
ساٹھ گھوڑے اور ساٹھ سوار ان میں بنا ہے کون
کالا گھوڑا اور زرد پالان۔ وہی ہے بالم گوری جی

جیویں ری بھاوج تیرے بیر، تیرے طعن نے میری جوڑی ملائی

جاتے وقت بھاوج پر غصہ نہیں ہوتی بلکہ دُعا دیتی ہے کہ تیرے طعن کی وجہ سے میری جوڑی مل گئی، خدا کرے تیرے بھائی جُگ جُگ جئیں!

ایک نہایت دلآویز گیت جو کاغذات میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے درج کرنا چاہتا تھا۔ افسوس کہ نہیں ملتا۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ نند بھاوج میں محبت کم ہوتی ہے اور بھاوج کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ نند دور ہی رہے اور گیت کا ماحصل یہ ہے کہ ایک بھائی ساون میں اپنی بہن کو لئے جاتا ہے۔ رستہ میں ندی چڑھی ہوئی ہے بھائی تو پار لنگھ جاتا ہے، بہن ڈوبنے لگتی ہے اور کہتی ہے۔ پیارے بھائی رخصت، جاؤ! آہ جب تم سے باپ دروازے کے باہر ملے گا اور تم کہوگے تو وہ بھری سبھا میں روئے گا۔ ماں سنے گی تو سر کے بال نوچ نوچ کر روئے گی۔ بھاوج بھی گھونگھٹ کاڑھ کر روئے گی۔ لیکن بھائی اس کا دل ہنسے گا! رخصت پیارے بھائی!

ایک گیت ساون کا اور سنئے۔ سہاگن انتظار میں ہے کہ بالم ساون میں پردیس سے آئے گا۔ لیکن وہ سوچتی ہے کہ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں پار کس طرح ہوگا۔ اب وہ ندی کو مخاطب کر کے کہتی ہے ؎

دھیرے[1] بہو ندیا تو دھیرے بہو
میرا کنتھا اتر جائے پار، دھیرے بہو
گرج گرج کر بادل برسے، بجلی کوندے جی
رات اندھیری جیہ ڈرت ہے، سونا ہے گھر بار

دھیرے بہو ندیا تو دھیرے بہو

[1] آہستہ

ایک آخری گیت درج کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ساون کے گیت نہایت دلچسپ اور بے شمار ہیں دیہات میں یہ مثل مشہور ہے

اتم کھیتی - مدھم بان　　　نکھد چاکری - بھیک ندان

اس لئے گاؤں میں معزز آدمی وہی ہے جو اپنے گھر میں رہے، اپنا کام کاج کرے۔ آج کل تو صنعتی ادارے اور چند ایسے محکمے کھل جانے سے جن میں مزدوروں کی کھپت ہے، دیہات کے لوگ مزدوری کرنے آجاتے ہیں لیکن پہلے کوئی شاذ ہی گھر سے نکلتا تھا اور گھر چھوڑنے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ کسی پر کوئی افتاد آپڑتی تو چپکے سے گھر سے نکل جاتا۔ حمل و نقل اور نامہ و پیام کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے سفر مشکل بھی تھا اور سخت مصیبت میں ہی کوئی نکلتا تھا۔ ایک آدمی اسی طرح پردیس جانا چاہتا ہے۔

کدھر کی یہ گھٹا امڈی کدھر جائی یہ برسن ہار　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا
پچھم کی یہ گھٹا امڈی گوری پورب برسن ہار　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا
چلے بالم جو تم ہو نوکری تو سے چلو ہمیں ساتھ　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا
تیرے پیروں کی پائل باجنی میرے ساتھی سنتی جائیں　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا
پائل نکالوں گھر دھروں مجھے لے چل بالم ساتھ　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا

عورت اصرار کرتی ہے کہ مجھے ساتھ لیچلو۔ خاوند بہانے کرتا ہے کبھی کہتا ہے تمہارے پاؤں کی پایل بجیگی لوگ سنیں گے۔ کبھی کہتا ہے گود کا بچہ روئے گا لیکن عورت نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے میں تمہارے باپ سے ماں سے کہدوں گی اور گاؤں میں شور مچادوں گی۔ لیکن وہ نہیں مانتا اسی طرح تڑپتی چھوڑ کر چل دیتا ہے۔ اب نند کہتی ہے

کری رسوئی ہو گئی ٹھنڈی تم اٹھ کر جیمو بھاوج　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا
میں تو نہ جیموں نند پیاری میرے من کی لیگئے ساتھ　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا
جو ہوتا بالما گھر پر میں رد کھی لیتی کھاتے جی　　　انگوٹھا پیر کا بھیگا

اس طرح وہ دودھ پینے کو کہتی ہے۔ پھر سونے کو کہتی ہے مگر ہجو نہ سہاگن انکار کرتی ہے۔ یہ گیت بھی نہایت ولگداز ہے دیہات کے اور گیت بھی خدا نے چاہا تو کسی فرصت میں پیش کروں گا۔

وقار انبالوی

تجلّیات

دم بہ دم حالِ دلِ زار پہ شفقت کیا تھی　جانئے کیا نگہِ ناز کی نیّت کیا تھی

غرقِ شیرینیِ الفت ہے مری روح ہنوز　ہائے اُن پیار کی باتوں میں حلاوت کیا تھی

یاد ہے کچھ تجھے اُس خلدِ محبّت کی بہار　تیری خو کیا تھی ستمگر مری عادت کیا تھی

تو جوابِ ترکِ محبّت پہ ہے ناحق مائل　اس محبّت میں مری جان قباحت کیا تھی

ہے یہی تیری نوازش تو نوازش کیا ہے　تھی یہی تیری محبّت تو محبّت کیا تھی

بعدِ یک عمرِ جدائی جو ملے ہیں باہم　اب میں کیا تجھ کو بتاؤں تیری غفلت کیا تھی

اب میں کیا تجھ کو بتاؤں کہ تھی فرقت کیا شے　اب میں کیا تجھ کو بتاؤں کہ اذیت کیا تھی

اب میں کیا تجھ کو سناؤں دلِ پُرغم کی حدیث　اب میں کیا تجھ کو بتاؤں مری حالت کیا تھی

اب مجھے یاد بھی ہوں تیرے ستم کی باتیں　اب میں کیا تجھ کو بتاؤں کہ شکایت کیا تھی

ہیں ترے جور بھی سرمایۂ نازِ الفت　لُطف کی تجھ کو مری جان ضرورت کیا تھی

باریابی پہ ہیں اس بزم کی نازاں اکبر
باریابی تھی مگر آپ کی عزت کیا تھی

جلال الدین اکبر

چند الفاظ

مسٹر جسٹس رانڈے کی تاریخ مرہٹہ کے مطالعہ میں چند الفاظ ہماری نگاہ سے گذرے جن سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ مرہٹوں کی حکومت نے اسلامی حکومتوں کے چند دفتری الفاظ کو مرہٹہ لہجہ دے کر استعمال کیا اور چند الفاظ سنسکرتی ترکیب کے اپنی دفتری زبان میں داخل کیے۔ ہم دونوں طرز کے الفاظ ذیل میں درج کرتے ہیں:-

(الف) اسلامی الفاظ

۱۔ بارگیر۔ ظاہر ہے۔

۲۔ مزم دار۔ یہ لفظ معظم دار تھا۔ کوئی اعزازی عہدہ ہوتا ہوگا۔ بنگال میں اب تک ایک بنگالی ذات یا عرف کا نام ہے۔ ظ کے بجائے ج بولتے ہیں یعنی موجمدار۔

۳۔ وک نویس۔ یہ لفظ وقائع نویس تھا۔

۴۔ دبیر۔ وزیر محکمۂ خارجیہ۔ یہ لفظ بعینہٖ استعمال کیا گیا۔

۵۔ تقائی۔ لفظ تقاوی تھا۔

۶۔ قبولیت۔ بعینہٖ لیا گیا۔

۷۔ پیشوا۔ بدلا نہیں۔ معنوں میں فرق آیا۔ شروع میں اس کا مفہوم نیچے کے محکمہ کا افسر یا وزیر حضوری تھا۔ بعدہٗ مرہٹی مجلس نظامیہ کا میر مجلس یعنی صدر ہوگیا۔

۸۔ چت نس۔ یہ لفظ غالباً چٹھہ نویس تھا۔ جو اسلامی حکومتوں نے ہندی لفظ چٹھہ اور فارسی لفظ نویس سے بنایا تھا۔

۹۔ سب نس۔ یہ لفظ سفینہ نویس تھا۔

۱۰۔ کھک نس۔ خاکہ نویس تھا۔

۱۱۔ فرنس۔ فرمان نویس۔ نانا وزیر کے نام کے آگے فرنس لکھا جاتا تھا یعنی احکام لکھنے والا۔ یہ وزیر تھا۔

۱۲۔ سلادار۔ یہ لفظ سلحہ دار تھا۔ یعنی سپاہی فوج۔

(ب) سنسکرتی ترکیب کے الفاظ۔

۱۔ نیا دیش۔ نیا معنی انصاف یعنی جج چیف جسٹس۔
پرانت۔ ضلع یا علاقہ کو کہتے تھے۔ چنانچہ U.P. کو ہندی میں سن تک پرانت لکھا جاتا ہے اور C.P. کو مدھ پرانت لکھا جاتا ہے۔
پٹیل۔ نمبردار یا ذیلدار یا سفید پوش۔
دیس مکھ۔ سربرآوردہ۔ چودھری۔
سینا پتی۔ افسر اعلیٰ افواج کا۔ کمانڈران چیف۔ سپہ سالار۔
منتری۔ پرائیویٹ سیکرٹری
سمنت۔ سیکرٹری خارجیہ
پنڈت راؤ۔ مفتی۔ مجتہد۔ بشپ کے برابر کا لفظ ہے۔
کل کارنی۔ مستاجر۔ یا صوبہ دار۔
کام وسکار۔ کارکن۔ مہتمم۔
دریا سرنگ۔ امیر البحر۔
سوراج۔ اُس رقبہ اراضی کو کہتے تھے جو حکمران کے ذاتی انتظام میں ہو۔ یہ لفظ دادا بھائی نوروجی نے مرہٹہ تاریخ سے اخذ کیا ہوگا۔ اور خود اختیاری کے معنوں میں استعمال کیا جو اس وقت تک اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
نائک۔ نو سپاہیوں پر افسر۔
اشٹا پردھان۔ افسران محکمہ جات کی مجلس منتظمہ جس میں آٹھ ممبر ہوتے تھے۔ زمانہ حال کی کونسل کا نمونہ اس مجلس سے لیا گیا ہوگا۔ اس مرہٹی مجلس میں پیشوا صدر ہوتا تھا۔ اور آٹھ ممبروں کے نام سیناپتی، ساچیہ، امیا منتری، سمنت، پنڈت راؤ، نایا دیش، وزیر تعمیرات (جس کا علیحدہ نام معلوم ہوتا)

نوٹ:۔ الفاظ محال۔ انعام۔ زمیندار۔ حوالدار۔ جاگیردار۔ اور ازیں قبیل بہت سے الفاظ سارے ہندوستان میں رائج تھے۔ مرہٹہ حکومت سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔

شمیم

شرحِ دیوانِ غالب

آشوبِ آگہی

غالب کی تیتیسویں غزل کی شرح

۱۔ یک ذرّہ زمیں نہیں بے کار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا (بیان)

۲۔ بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا (〃)

۳۔ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا (زبانِ دنیا)

۴۔ تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے — تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا (بیان)

۵۔ سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا (〃)

۶۔ بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا (تمثیل بیان)

۷۔ باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل — ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا؟ (استفہامِ بیانیہ)

تمہید:۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے کسی جذبۂ تقدیس کا اثر لے کر یہ غزل لکھی ہے کیونکہ ہر شعر سے اس کا اظہار ہوتا ہے بمصداق ؎ بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟

اور غزل کے پہلے مصرعہ میں جب مرزا صاحب کہتے ہیں کہ ؎ "یک ذرّہ زمیں نہیں بیکار باغ کا" — تو شاعرانہ رنگ میں آیۂ پاک "ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً" کی تفسیر سامنے آجاتی ہے بشرطیکہ "باغ" کو ہم "باغِ دنیا" کے معنی میں لیں۔ ایسی ہی تفسیر ایرانی شاعر نظیری نے بھی اپنے ایک شعر میں نہایت بے تکلفی سے بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اگر لکڑی سے میں منبر نہ بنا سکوں تو دار یا سولی ہی بنا لوں گا" یعنی اس کے وجود کو بے کار کبھی نہ تصور کروں گا غرض دنیا میں کوئی شے بیکار نہیں۔ غزل کا مفہوم مسلسل نہیں مگر جذبات میں تسلسل ضرور ہے۔

۱۔ **مفہوم**۔ باغ کے ذرّے ذرّے سے باغبان کا فیض ظاہر ہے۔

تشریح۔ جادہ معنی رستہ۔ فتیلہ معنی بتی جس سے چراغ روشن کیا جائے یعنی باغ کی روشیں داغِ لالہ کی بتیاں ہیں۔ گُلِ لالہ جس میں داغ ہے گویا ایک چراغ ہے اور باغ کی روش یا پگڈنڈی اس کی بتی۔ تشبیہ دینے کی ضرورت ہے

بُری نہیں۔ کیونکہ زمین ہی سے پانی کھینچ کر پودا نشو و نما پاتا ہے۔ چراغ کی روشنی کا انحصار روغن پر ہے جو اُوپر بتی کے ذریعے سے پہنچکر شعلے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل کے ہندی اشعار اس مفہوم پر مزید روشنی کا باعث ہونگے۔

یعنی ؎
جیسے پودا ندی کنارے ویسے ہم سنسار میں پیارے
پودا نیچے پانی پاتے اوپر اوپر پات ہلاتے
گیانی اپنا ہاتھ بھی ہالے ہم کو بھی کوئی یوں سے پالے (راقم)

اس طرح چراغ لالہ یا داغ لالہ جو روشن ہے یا پھول کی صورت میں شگفتہ ہے وہ رَوشوں کے نیچے سے پانی کھینچ کھینچ کر نشو و نما پاتا ہے۔

مطلب۔ یہ ہے کہ باغ کی زمین کا کوئی ذرہ بیکار نہیں حتیٰ کہ رَوشیں بھی گُلِ لالہ کی نشو و نما کا باعث ہیں۔

۲۔ مفہوم۔ رمزِ خودی پر آگاہی کے لئے بیخودی کا ہونا ضروری ہے۔ جس کے مدارج ہوا کرتے ہیں۔

تشریح۔ "مے" یعنی شرابِ معرفت۔ اگرچہ مرزا صاحب کو طبعًا اس کی طرف زیادہ میلان نہ تھا۔ "آشوبِ آگہی" یعنی انکشافِ رموزِ باطن کا ہجوم جن کو دل میں جگہ دینے کے لئے ظرفِ انسانیت وسیع ہونا چاہیئے۔ "عجزِ حوصلہ" یعنی تنگیٔ ظرف یا عجزِ ہمت۔ ایاغ معنی پیالہ "خطِ ایاغ" یعنی وہ خطوط جو پیالے میں نیچے سے اوپر تک شراب وغیرہ کو ناپنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ مگر یہاں مراد ظرفِ دل سے ہے۔ یعنی جس کے دل میں جتنی وسعت ہوتی ہے اسی اعتبار سے اس میں محبت بھی وسیع ہوتی ہے۔ بمصداق ؎ "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"۔

مطلب یہ ہے کہ بغیر شرابِ معرفت یعنی حقیقی محبت کے انسان علم کا بار برداشت نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ علم کے لئے ایک وسیع ظرف کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کے مختلف مدارج مقرر ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی ایک دم سے ایم۔ اے نہیں ہو سکتا اسی طرح بغیر کامل خلوص کے کوئی عارفِ کامل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مفہوم۔ عشق کی آشفتگی بھی جنون سے کم نہیں۔

تشریح۔ کار و بار یعنی چال ڈھال خندہ معنی ہنسی۔ دماغ کا خلل یعنی جنون۔ دیوانگی۔ سِڑی ہونا۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے عقلمند وہی شخص ہے جو علایقِ دنیا اور اُن کی ذمہ داریوں کو سنجیدگی کے ساتھ برتے۔ عاشق کی طبیعت ان باتوں سے ہٹ جاتی ہے اس لئے اہلِ دنیا اس کو سِڑی دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں مثلاً قیس نجدی کا نام ہی مجنوں ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ بلبل جو پھول پر عاشق ہے اپنی چال ڈھال سے ایک قسم کی وارفتگی کا اظہار کرتی ہے اور پھول جو جذبِ محبت سے آگاہ نہیں اُس کو جنون تصور کرتا ہے اس لئے ہنستا ہے (تشبیہ خوب ہے) اس اعتبار سے عشق کو دماغ کا خلل کہنا

نامناسب نہیں۔

۴ **مفہوم**۔ میرا دل شعر و سخن کی طرف ابتدا ہی سے راغب ہے۔

تشریح۔ تریاکی معنی دود کش یعنی دھواں جو حقہ یا سگریٹ کے ذریعہ سے کھینچا جائے۔ ظاہر ہے کہ آگ یا چراغ کے بغیر اس کا وجود ناممکن ہے

مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو گردشِ ایام نے ابتدا ہی سے شعر و سخن کا اہل بنا دیا تھا اور میرے دل کے داغوں کو "شعلہ بداماں" کر دیا تھا۔ اس لئے میرے سخن میں بھی وہی قدیمی سوز ہے۔ (مرزا صاحب کے سوانح حیات اس پر شاہد ہیں)۔

۵ **مفہوم**۔ ہم نے جنونِ عشق سے بچنے کی کوشش بہت کی مگر دل نہ مانا۔

تشریح۔ "بندِ عشق" یعنی محبت کی پابندی۔ فراغ یعنی اطمینان۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسباب کی بہت کوشش کی کہ دل محبت میں گرفتار نہ ہو اور فارغ البالی سے زندگی بسر ہو جائے مگر افسوس کہ دل خود ہی اطمینان و سکون کا دشمن نکلا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔

۶ **مفہوم**۔ ع نہ ہو مروت جس آنکھ میں گر وہ پھوٹ جائے تو غم نہ ہوگا۔

تشریح۔ "خونِ دل" یعنی خمیرِ محبت۔ "موجِ نگہ" یعنی بصارت کی کرنیں۔ "غبار ہے" یعنی روشن نہیں ہے۔ پہلا مصرعہ آرٹ کی ایک کامیاب تمثیل ہے کسی ٹارچ یا برقی مشعل کو لے کر اگر تاریکی میں کھولا جائے نور وشنی کی موج دوڑ جائے گی اور نہایت صاف ہوگی لیکن مشعل کے منہ پر ایک کثیف کانچ کا ٹکڑا رکھنے پر وہی "موج" غبار آلود معلوم ہوگی۔ "میکدہ" معنی شراب خانہ۔ آنکھ محبت کی شراب کا میکدہ ہے۔ "مے کے سراغ کا" یعنی محبت کی نشانی کا۔ کیونکہ آنکھ ہی سے دل کی محبت کا اندازہ ممکن ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کی آنکھ میں خونِ دل یا محبت کی جھلک نہ ہو تو اس کی نظر نظرِ بد سے بدتر ہے کیونکہ جس طرح کسی کی آنکھ میں غبار پڑنے سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح دوسرے کی آنکھ پر بوالہوس اور بے مروت کی نگاہ پڑنے سے تکلیف ہوتی ہے اور حیادار کی آنکھ جھک جایا کرتی ہے۔ واقعی آنکھ کا میخانہ جو میخانہ دل کا سراغ ہے بغیر مروت و محبت کے خراب ہوا کرتا ہے۔

۷ **مفہوم**۔ تیرا یہ پھلا پھولا باغ کس دل کو خوش کرنے کے لئے ہے؟ اور ابرِ بہار کس کے دماغ کا خمکدہ ہے۔

تشریح۔ یہ شعر استفہام میں ہے۔ پہلا مصرعہ دوسرے مصرعہ سے حرفِ استفہام کے ساتھ ہے "بساطِ نشاطِ دل" یعنی دل کی خوشی کی وسعت کا باعث۔ "خمکدہ" معنی شراب خانہ۔

مطلب یہ ہے کہ اے باغبانِ برحق یہ تیرا سرسبز باغ کس دل کو شگفتہ کرنے کے لئے اپنا سدا بہار حسن قائم کئے ہوئے ہے اور اے ساقیِ ازل یہ ابرِ بہار کس کے دماغ کو مخمور کرنے کے لئے چھایا ہوا ہے۔ (بظاہر اس کا جواب یہی ہے کہ یہ سب خدا کے شکر گذار بندوں کے لئے ہے) سعدی ؎ ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرمانبردار + شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری +

مقبول حسین احمد پوری

حصنِ ابلق

تیمار میں ایک نہایت شاندار و پائدار قلعہ تھا جو سمآل یہودی بن عادیا، کی مِلک میں رہا۔ یہ اپنے مختلف رنگوں کے سبب سے ابلق مشہور ہو گیا۔ (جغرافیہ بائبل دی گریسبے)

حملہ آوروں کے صدمات اٹھانے اور حملے جھیل جانے میں یہ حصن ضرب المثل بن گیا۔ اس سبب سے اس کا ایک نام "الابلق الفرد" بھی پڑ گیا تھا کتاب سمآل کی ابیات اور مقاماتِ حریری ص۲۷ (آغانی (جلد ثانی ص۱۸) سے اس کا بانی عادیا، ظاہر ہوتا ہے جو سمآل کا باپ یا دادا ہے مگر الاعشیٰ نے اس حصن کے متعلق جو شعر کہے ہیں، ان سے اس کے بانی حضرت سلیمان تبادر ہوتے ہیں۔

اگر تاریخی حکایات پر وثوق کیا جائے تو یہ عمارت ہر طرح ان بیان سے جو سمآل کی ابیات میں ہے زیادہ قدیم ثابت ہوتی ہے کیونکہ ملکتہ الزباء کے قصے میں ہے کہ اس نے حصنِ مارد جو دولت الجندل میں ہے اور حصنِ ابلق پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس ملکہ کا زمانہ تیسری صدی عیسوی میں تھا۔ اس ملکہ کی یہ ناکامی ضرب المثل بن گئی تھی جب کسی کو دو طرف سے ناکامی ہوتی ہے تو عرب ملکہ زباء کا قول جو اب ضرب المثل بن گیا ہے اس پر عائد کرتے ہیں۔ فقصد تہما الزباء فعجزت فقالت زباء نے دونوں قلعوں پر چڑھائی کی تھی جب ناکام رہی تو کہنے لگی تمرّد مارد و عزّ الابلق مارد نے سرکشی کی اور ابلق بہت سخت و کرخت ثابت ہوا۔ (منتہی الارب)

حصنِ ابلق کا بیان امرؤ القیس کے زرہ کے واقعہ میں بھی آتا ہے جسے اس نے سمآل بن عادیا، کے سپرد کر دیا تھا جب وہ شاہنشاہِ قسطنطنیہ ثانی سے اپنے باپ کے قاتلوں کے خلاف طالبِ امداد ہو کر گیا تھا۔ (مقدمہ دیوان امرؤ القیس از ڈی اسلین۔)

یاقوت کے زمانہ میں الابلق کے کھنڈر باقی تھے اس نے معجم میں لکھا ہے کہ یہ کھنڈر تیمار کے نزدیک ہیں اور دھوپ سے پکی ہوئی اینٹیں ایر جن سے یہ حصن تعمیر ہوا تھا دیکھنے سے اس قلعہ کی قدیم شہرت یافتہ اور مبالغہ آمیز مضبوطی و استحکام ظاہر نہیں ہوتا۔

یہ بھی ایک قابلِ ملاحظہ امر ہے کہ حصنِ مارد کا نام تو ہمارے زمانے تک مشہور چلا آتا ہے اور مشہور سیاحوں نے مثلاً پالگریو اور ڈوٹی وغیرہ نے اس کے کھنڈر بھی دیکھے ہیں مگر الابلق کا نام کسی سیاح نے نہیں لیا حتیٰ کہ "بنجامین" ساکن ٹوڈیلا جو یہودی سیاح ہے اور بارھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے نیز تاریخ یہود سے متعلق ہر بات کو بیان کرنے کا خوگر ہے اس نے بھی الابلق کو فراموش کر دیا۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

بہر حال ابلق ایک تاریخی حصن ضرور تھا۔ اور اس کے برباد ہو جانے پر محض پڑی ہوئی اینٹوں سے اس کی مضبوطی و استحکام کا انکار بھی معقول نہیں ہے نیز بعد کے سیاحوں نے اگر اس کا ذکر نہیں کیا تو اس سے اس کے تاریخی وجود میں شک و شبہ کرنا درست نہیں ہو سکتا +

حکیم [illegible]

روحِ جذبات

لازم ہے دوستی میں خیالِ احتیاط کا — بیگانگی مآل نہ ہو ارتباط کا

دل پر محیط ہو کے تمہاری نگاہ نے — اندازہ کر لیا ہے ہماری بساط کا

بے خوف کاروبارِ محبت کئے چلو — کیا اِن معاملات میں کام احتیاط کا

رنج و خوشی کو کر دیا مخلوط اے عدمؔ — اور زیست نام رکھ دیا اس اختلاط کا

دل بجھ گیا ہے سوزِ طبیعت کو کیا ہوا — جذباتِ آتشیں کی حرارت کو کیا ہوا

سوہانِ روح بن گئیں دُنیا شناسیاں — اللہ! سادگیِ طبیعت کو کیا ہوا

مانا! نگاہِ شوق کو دھوکا ہوا مگر — کمبخت دل کی تیز بصارت کو کیا ہوا

جی بھر کے غم بھی کھانے کو ہوتا نہیں نصیب

دریا دلوں کے جذبۂ رحمت کو کیا ہوا

عدمؔ

فیروزہ اور سہراب

ڈراما کے افراد

آرگن ۔ وہمی مریض
فیروزہ ۔ اس کی بیٹی
شہرزاد ۔ آرگن کی دوسری بیوی
سہراب ۔ آرگن کا بھتیجا
مزدک ۔ ڈاکٹر
پرویں ۔ ڈاکٹر کا لڑکا
زرینہ ۔ خادمہ

پہلا ایکٹ

(منظر۔ آرگن کے مکان کا ایک کمرہ ۔ میز ادویہ کی شیشیوں سے پٹی پڑی ہے)

آرگن (شیشیوں کو گنتے ہوئے) صرف بیس شیشیاں دوا کی اس مہینے! گذشتہ ماہ تو تیس تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں جلد اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے۔ ——— ! یہ خالی شیشیاں لیجاؤ۔ (کمرہ میں غصے سے نگاہ دوڑاتا ہے) کوئی میری خبر لینے کو نہیں، نامراد مجھے اکیلا چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں مر رہے ہیں۔ (گھنٹی بجاتا ہے لیکن کوئی نہیں آتا) بے غیرت مجھ ایسے مریض کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں (دروازہ کھول کر پکارتا ہے) زرینہ! اری کمبخت! کوئی مر جائے لیکن پروا ہی نہیں۔ (زور سے گھنٹی بجاتا ہے)۔

(خادمہ آتی ہے)

زرینہ ۔ آپ ایک منٹ انتظار نہیں کر سکتے؟ آخر اتنی جلدی کیوں پڑی ہے؟

آرگن ۔ ذلیل! چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا ہے! غلاظت کی پوٹ! نالائق ......

زرینہ ۔ جلدی میں میرا سر دروازے سے لگ کر زخمی ہو گیا ہے۔ لیکن آپ کی بلا سے (مکر سے رونے لگتی ہے)

آرگن ۔ (رحم کھا کر) اچھا! جانے دو۔ یہ خالی شیشیاں لیجاؤ۔ میں ذرا ڈاکٹر سے مل آؤں۔ اس نے مجھے کافی دوا نہیں بھیجی

زرینہ ۔ اُس نے آپ کو لُوٹ لُوٹ کر گھر بھر لیا ہے۔ میں اس سے ذرا پوچھوں تو کہ آپ کو مرض کیا ہے؟

آرگن ۔ بیوقوف! جاہل! میری حالت اس قدر ردی ہے کہ اگر میں بہترین آدمی کا علاج نہ کراتا تو کب کا مر چکا ہوتا۔ فیروزہ

کہاں ہے؟ میں مجھے اُس سے کچھ کہنا ہے۔

(فیروزہ داخل ہوتی ہے)

آرگن۔ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔ نہیں، جانے دو؛ پھر کبھی سہی، میری چھڑی کہاں ہے؟ میں ڈاکٹر سے ملنے جارہا ہوں، یہیں ٹھیرو۔ میں ابھی آتا ہوں (باہر نکل جاتا ہے)

فیروزہ۔ تم اُس سے ملی ہو، وہ حسین ہے نا؟

زرینہ (ہنسکر) کون؟ تمہارے ابا؟

فیروزہ۔ جان بوجھ کر انجان نہ بنو۔ تم خوب جانتی ہو میں کس کی بات پوچھ رہی ہوں تم کبھی پیر ۔۔۔ نہ سہراب سے ملی ہو۔ سچ سچ بتاؤ اسے مجھ سے محبت ہے؟

زرینہ۔ خیر، میں اسے ملی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ میں جلد ہی تمہارے والد سے تمہاری شادی کے لئے درخواست کروں گا۔۔۔ لو تمہارے ابا آگئے!

(باپ کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے)

آرگن۔ پیاری بیٹی کسی نے تم سے شادی کرنے کی درخواست کی ہے۔ تم رضی ہو؟

فیروزہ۔ جیسی آپ کی مرضی! آپ نے ہمیں شادی کی اجازت دے دی ہے۔ تو اب میں آپ سے ایک بات چھپانا نہیں چاہتی۔ میں اتفاقاً پچھلے ہفتے اس سے ملی تھی اور فوراً ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ اس لئے اس نے اب شادی کی درخواست کی ہے۔

آرگن۔ ڈاکٹر نے تو مجھ سے اس کا ذکر تک نہیں کیا لیکن اس کے بھتیجے سے محبت ہے تو۔۔۔۔

فیروزہ۔ کیا سہراب اس کا بھتیجا ہے۔

آرگن۔ سہراب! میں تو اسے نہیں جانتا! سہراب کون؟ جس آدمی کی میں بات کر رہا ہوں وہ ڈاکٹر مزدک کا بیٹا اور میرے معالج کا بھتیجا ہے۔

فیروزہ۔ ضرور کچھ مغالطہ ہے۔ (کمرے سے نکل جاتی ہے)

خادمہ۔ آپ انہیں ضرور ایک ڈاکٹر سے کیوں بیاہنا چاہتے ہیں؟

آرگن۔ تم نہیں جانتیں۔ اس طرح میرے گھر میں تین ڈاکٹر ہو جائیں گے؛ میرا علاج کرینگے۔

خادمہ۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں۔

آرگن ۔ کمبخت، میری صحت بہت خراب ہے ۔

خادمہ ۔ آپ کی صحت قطعاً خراب نہیں، مگر، ہاں ایک طرح سے خراب ہے بھی! لیکن گستاخی معاف! فیروزہ کیوں ڈاکٹر سے صرف اس لئے بیاہ کرے کہ آپ کو دوا سستی ملے؟ وہ تو نہیں ماننے کی!

آرگن ۔ تب اسے راہبہ بن کر زندگی گزارنے پڑے گی۔

خادمہ ۔ آپ سے ہرگز یہ امید نہیں، آپ اتنے سخت دل تو نہیں، آپ جیسے مہربان کب ایسی بات کرنے لگے۔

آرگن ۔ نہیں، میں مہربان نہیں، ظالم ہوں۔ میں تمہیں ایسا سبق دوں گا کہ جیتے جی نہ بھولو گی۔

(چھڑی لے کر اس کے پیچھے بھاگتا ہے شہرزاد داخل ہوتی ہے)

شہرزاد ۔ میرے شوہر کو کون ستا رہا ہے؟

آرگن ۔ مجھے تم پر بہت غصہ آرہا ہے ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ، زرینہ!

زرینہ ۔ یہ فیروزہ کی شادی اپنے ڈاکٹر کے بھتیجے سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ بیاہ ہی نہ کرے۔

آرگن ۔ میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔

شہرزاد ۔ وہ سچ کہہ رہی ہے ۔ لیکن اُف! میرے پیارے ان لوگوں کی بے پروائی سے تمہارا کیا حال ہو گیا ہے! بستر پر لیٹ جاؤ ۔ ایک اور تکیہ چاہیئے؟

آرگن ۔ شہرزاد! یہ میری جان کھا رہے ہیں۔ اگر تم میری خبر نہ لیتیں تو میں کب کا قبر میں لیٹ چکا ہوتا! میں ابھی تمہارے حق میں وصیت کرتا ہوں۔

شہرزاد ۔ ہائے ۔ وصیت کی باتیں نہ کرو ۔ یہ سن کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے ۔

آرگن ۔ اگر تمہارا وکیل موجود ہوتا تو ابھی معاملہ طے ہو جاتا ۔

شہرزاد (باہر جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد ایک وکیل کو بلا لاتی ہے)

شہرزاد ۔ ہائے تم کتنے کمزور ہو گئے ہو!

(آرگن اور وکیل کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)

زرینہ (فیروزہ سے) تمہاری سوتیلی ماں تمہارا حق مار لینا چاہتی ہے۔ دیکھا اب ایک وکیل کو ساتھ لے آئی ہے۔

فیروزہ اس کی تو کچھ پروا نہیں لیکن تم ابھی جا کر سب حال سہراب کو سنا آؤ۔

دوسرا ایکٹ

(منظر:- آرگن کا کمرہ۔ سہراب ایک حسین نوجوان خادمہ سے باتیں کر رہا ہے۔ آرگن داخل ہوتا ہے)

سہراب۔ مس آرگن کو موسیقی سکھانے والا کہیں شہر سے باہر گیا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں۔ اس لئے کہ ان کا حرج نہ ہو اُس نے مجھے انہیں پڑھانے کو بھیج دیا ہے۔

آرگن۔ اچھا! زرینہ میری بیٹی کو بلا لاؤ۔

زرینہ۔ ان کے کمرے ہی میں کیوں نہ چلا جائے۔ آپ کی طبیعت ناساز ہے جتنا شور کم ہو اتنا ہی آپ کے لئے اچھا ہے۔

آرگن۔ نہیں نہیں مجھے موسیقی سننے کا بہت شوق ہے۔ لو! وہ خود ہی آگئی (فیروزہ داخل ہوتی ہے)

فیروزہ۔ (سہراب کو پہچان کر) آغا!

آرگن۔ کیا وجہ ہے! تمہارے استاد نے آج اس آدمی کو اپنی جگہ بھیجا ہے؟

خادمہ۔ ڈاکٹر مزدک اور اس کا بیٹا آپ سے ملنے آئے ہیں۔

(ڈاکٹر اور اس کا بیٹا داخل ہوتے ہیں، ڈاکٹر اپنے لڑکے سے سب کا تعارف کراتا ہے)

ڈاکٹر مزدک۔ ان خاتون کی خدمت میں ادب سے سلام عرض کرو۔

پرویز۔ آپ کو قدرت نے مستحق جان کر یہ رتبہ عطا کیا ہے کہ آپ کو میری منسوبہ کی ماں بنایا ہے کیونکہ حسن اور محبت آپ کی گود میں ......

آرگن۔ یہ میری بیٹی ہے بیوی نہیں۔

پرویز (باپ سے) ابا۔ اب کیا کروں؟

آرگن۔ فیروزہ۔ ان صاحبزادے سے آ کر ہاتھ ملاؤ۔

فیروزہ۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان صاحب کی قدر نہیں کر سکتی۔

آرگن۔ کوئی حرج نہیں۔ جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم خود بخود ان کی قدر کرو گی۔

فیروزہ۔ شادی دل کا معاملہ ہے! یہ زبردستی کا کام نہیں۔

آرگن۔ بس خاموش! میں زیادہ نہیں سننا چاہتا۔

شہرزاد۔ پیارے اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس کا بیاہ کرانے کی بجائے اسے تنہائی کی تعدیں سکھنی اور اسے عمر بھر شادی کی اجازت نہ دیتی

فیروزہ۔ بیگم صاحبہ! بعض عورتیں صرف محبت کے لئے شادی کرتی ہیں بعض صرف یہ چاہتی ہیں کہ ان کا بیمار خاوند جلد مرے اور وہ اس کی دولت سمیٹیں۔

شہرزاد۔ کیا بک بک کر رہی ہے؟

آرگن۔ حضرات! مجھے معاف کیجئے..... ذرا میری بات سنو، فیروزہ..... یا چار دن کے اندر پرویں سے شادی کرو ورنہ جیتے جی بیاہ کا نام نہ لینا۔

(ڈاکٹر اور اُس کا بیٹا چلنے لگتے ہیں)

آرگن۔ ذرا جانے سے پہلے میرا ڈاکٹری معائنہ تو کر لیجئے۔ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی!

مزدک۔ (نبض پر ہاتھ رکھ کر) بیٹا تم اپنے خسر کی دوسری نبض دیکھ کر بتاؤ کہ انہیں کیا بیماری ہے۔

پرویں (نبض پر ہاتھ رکھ کر) کچھ ان کی صحت اچھی نہیں۔

مزدک (متانت سے) نبض کی حرکت مسلسل نہیں، آپ میرے بھائی کے زیرِ علاج ہیں؟

آرگن۔ جی ہاں۔

مزدک۔ آپ کو ان سے بہتر ڈاکٹر نہیں ملے گا۔ ہم پھر کبھی حاضر ہونگے۔ (ڈاکٹر رخصت ہوتے ہیں شہرزاد داخل ہوتی ہے)

شہرزاد۔ تمہیں عجیب بات بتاؤں، نیا ماسٹر صحن میں فیروزہ کو بوسہ دے رہا تھا۔

آرگن۔ میری بیٹی کو بوسہ دے رہا تھا!

شہرزاد۔ ہاں! لیکن مجھے دیکھ کر بھاگ گیا۔

آرگن۔ ہائے! میری بھی کیا زندگی ہے۔ مجھے اپنی بیماری کا فکر کرنے کا بھی موقع نہیں۔

تیسرا ایکٹ

(منظر:۔ وہی آرگن کا کمرہ۔ آرگن کرسی پر لیٹا ہے خادمہ آرگن کے بھائی کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

بھائی۔ اب تو تمہاری صحت بہت اچھی ہے۔

آرگن۔ کیا کہوں مجھ میں بخار سے بولنے کی طاقت بھی تو نہیں۔

بھائی۔ میں تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ فیروزہ اور سہراب کا رشتہ بہت مناسب ہوگا۔

آرگن۔ میری بیٹی کی کوئی بات نہ کرو، میں اسے گھر میں بند کر دوں گا۔

بھائی۔ تمہاری بیوی اس پر بہت خوش ہوگی۔ وہ جو جال تمہارے لئے بچھاتی ہے تم جھٹ اس میں پھنس جاتے ہو۔

خادمہ۔ نہیں صاحب! میری مالکہ تو بہت نیک نہاد ہیں!

آرگن۔ بھائی تم نے اسے میری خدمت کرتے کبھی نہیں دیکھا۔

خادمہ۔ ان کی تیمارداری کا کیا کہنا! میں ابھی آپ کو دکھائے دیتی ہوں کہ انہیں اپنے خاوند سے کتنی محبت ہے (آرگن سے) آپ ایسے لیٹ جائیے گویا جان نہیں۔ وہ بیگم صاحبہ بھی آگئیں۔ دیکھیں وہ آپ کی وفات کا سُن کر کیا کہتی ہیں۔
(آرگن کے بھائی سے) آپ پردے کے پیچھے چھپ جائیے۔ (شہرزاد آتی ہے)

شہرزاد۔ کیا بات ہے؟

خادمہ۔ ہائے کیا کہوں میرے آقا کو کیا ہوگیا... آپ ٹھیک وقت پر آئیں۔ بس اب آخری سانس ہے۔ ہائے ہمیرے آقا!

شہرزاد۔ ایسی فضول باتیں چھوڑو۔ کیا وہ سچ مچ مرگیا ہے؟ شکر ہے کمبخت مرنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ کسی اور کو تو خبر نہیں؟

خادمہ۔ نہیں۔

شہرزاد۔ خوب ہوا۔ آؤ اس کے کاغذات تو دیکھیں۔ کتنے سال میں نے اِس غلیظ بڈھے کھوس کی خدمت کی ہے۔ اب میرا وقت آگیا ہے۔ اس نے سب جائداد میرے نام کر رکھی ہے۔ فیروزہ کو تو ایک کوڑی نہیں ملے گی۔ بڈھا چابیاں کہاں رکھتا تھا؟ (اس کی جیبیں ٹٹولتی ہے)

آرگن۔ (اچھل پڑتا ہے) واہ! کیا محبت ہے!

شہرزاد۔ ہیں! یہ کیا! (بھاگ کر کمرے سے نکل جاتی ہے)

خادمہ۔ (آرگن سے) پھر کرسی پر اسی طرح لیٹ جاؤ اور دیکھو تمہاری بیٹی کیا کرتی ہے (فیروزہ اور سہراب کا داخلہ)

فیروزہ۔ زرینہ رو کیوں رہی ہو! ہائے میرے ابا کو کیا ہوگیا۔

خادمہ۔ انہوں نے ابھی دم توڑ دیا ہے۔

فیروزہ۔ ہائے میرے ابا! اب میں کیا کروں گی! میرے ابا! میرے ابا!

سہراب۔ کتنی بدقسمتی ہے آج صبح ہی تو میں نے تمہارے چچا کو سفارش کرنے کے لئے کہا تھا۔

فیروزہ۔ اب ہمیں شادی کا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔ اب میں تمام عمر شادی نہ کروں گی۔ شاید میری ضد ہی ان کی موت کا باعث ہوئی ہے۔ میں ان کا حکم مانتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا!

آرگن۔ کچھ غم نہ کرو میری بیٹی میں مرا نہیں (سہراب سے) بیٹا! تمہیں اس سے شادی کرنے کی اجازت ہے صرف یہ شرط ہے کہ ڈاکٹر بنجاؤ۔

بھائی۔ تم خود ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے؟ سب سے اچھی بات ہوگی۔

آرگن۔ اب اس عمر میں کیا پڑھوں گا؟

بھائی۔ تم تو اب بھی ڈاکٹروں سے زیادہ جانتے ہو۔ وہ سب ٹھگ ہیں۔ تم بھی چاہو تو روپیہ دیکر ڈگری لے لو۔

آرگن۔ نیک صلاح ہے۔ میں بھی آج ہی ڈاکٹر بنتا ہوں +

(مولیئر)　　عطاء اللہ کلیم

غزل

مریضِ دردِ محبت بنا دیا تو نے
یہ روگ کیا مرے دل کو لگا دیا تو نے

جمالِ شاہدِ معنی دکھا دیا تو نے
مری نگاہ سے پردہ اٹھا دیا تو نے

تری نظر کے تصدق ترے کرم کے نثار
کسے خبر کہ مجھے کیا بتا دیا تو نے

یہ کیا ہوا کہ مری روح رقص کرنے لگی
یہ کونسا مجھے نغمہ سنا دیا تو نے

جھلک دکھا کے حقیقت کی بزمِ ہستی کو
مری نظر میں تماشا بنا دیا تو نے

تمیز نہیں وہ کرم تھا کہ تھا ستم تیرا
اٹھا کے پردہ جو جلوہ دکھا دیا تو نے

تری تلاش نے گم کر دیا مجھے اتنا
خوشا نصیب ٹھکانے لگا دیا تو نے

نہ تھا جو لطف کے قابل ستم کیا ہوتا
یہ کیا کیا مجھے دل سے بھلا دیا تو نے

بلا کا درد ہے تیرے کلام میں پرویزؔ
تمام بزمِ سخن کو رلا دیا تو نے

محمد علاء الدین پرویزؔ

قانونِ ارشمیدس

ایک چھوٹا سا بازاری عرب میرا واقف تھا۔ وہ میرا ہم عمر بھی تھا اور ہم ایک ہی چوراہے میں رہتے تھے۔ وہ ہر بات
میں مجھ سے افضل تھا۔ نہ صرف تجربہ کاری اور جرأت ہی میں بلکہ علمی قابلیت بھی اس کی زیادہ تھی۔ سرخ چاک یا کوئلے
سے لکھ لکھ کر وہ بازار کی تمام دیواریں بھر ڈالتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے تو اس کے لکھے ہوئے الفاظ کی سمجھ تک نہ آتی وہ
نہایت خوفناک آدمی تھا۔ مارے ڈر کے میں اکیلے کبھی باہر نہ جاتا اور اگر جاتا بھی تو دروازے سے اپنی ناک باہر نکال کر پہلے
یہ دیکھ لیتا کہ یہ وحشی مزاج تو آس پاس نہیں میرے صاف ستھرے اور نسبتاً زیادہ بہتر کپڑے اسے ایک آنکھ نہ بھاتے
انہیں دیکھتے ہی اس کا دماغی توازن قائم نہ رہتا۔ بگڑ جاتا۔ دوسری طرف میری یہ حالت ہوتی کہ اس کا خوفناک جثہ
دیکھتے ہی سہم جاتا۔

ایک دن ابا نے مجھے برف پر پھسلنے کی ایک گاڑی لا دی جسے سلیج کہتے ہیں۔ اس پر پھولدار نمدے کا غلاف
چڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے پہیے چمکدار لوہے کے بنے تھے جو سورج کی روشنی سے چمک اٹھتے تھے۔ آگے ایک چھوٹی سی گھنٹی
بھی لگی تھی۔ سلیج لے کر میں پہلے دروازے کی طرف ہی لپکا۔ برف ابھی ابھی گری تھی جس سے فضا مہک اٹھی تھی لیکن مارے
سردی کے میری ناک اسقدر ٹھٹھر گئی کہ مجھے چھینکیں آنے لگیں مسرت کے نشے سے میں کچھ دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اسی لئے
شاید میں اپنی پہلی احتیاط بھول گیا۔ اور دائیں بائیں دیکھنے کے بغیر دروازے سے باہر نکل کر ہرن کے بچے کی طرح
چھلانگیں لگاتا ناچتا چیختا چلاتا باہر آ پہنچا۔

ہمارے دروازے سے ذرا آگے جا کر بازار کا رُخ ڈھلوان ہو جاتا تھا۔ اب میں سلیج پر بیٹھ گیا لیکن اس
طرح جیسے ایک گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور یہ ڈھلان کی طرف پھسلنے لگی۔ یہ جگہ زیادہ ڈھلوان تو تھی نہیں اس لئے
سلیج نہایت آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اس قدر آہستہ کہ مجھے اپنے پاؤں سے بھی مدد لینی پڑتی۔ برفبار ہوا بازار
میں تیزی سے گذر رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کان منجمد ہو گئے ہیں۔ سردی کے مارے میری مسرت جو ایک
ہی لمحہ پہلے لاانتہا تھی پژمردگی میں تبدیل ہونے لگی جب ٹھنڈی اور تیز و تند ہوائیں میرے کپڑوں میں بھی جا گھسیں
تو میری رُوح میں یہ خیال سمانے لگا "افسوس اب وُہ لطف نہیں رہا جو پہلے تھا جب میں اپنی سلیج لے کر دروازے

سے باہر نکلا تھا۔

جب میں یہ خیال کر رہا تھا تو معاً میری نظر "چھوٹے وحشی" پر جا پڑی جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے دروازے سے باہر کھڑا تھا۔ اُف اس کے کپڑے کس قدر غلیظ تھے۔ شاید اسے دق کی بیماری ہو رہی تھی۔ ہر ایک کو اس کی طرف دیکھتے ہی چھپ جانا چاہئے۔ اسے دیکھتے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔

میں اس سے کس طرح بھاگ سکتا تھا۔ دبک کر سلیج پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میری حالت اس خرگوش کے مانند تھی جسے اژدہا اپنی لپیٹ میں لا کر ایک ہی لمحہ میں کچل ڈالنے والا ہو۔ اب میں انتظار کرنے لگا کہ وہ چھوٹا سا مگر خونخوار دشمن کب اپنے دروازے سے نکل کر مجھے آن دبوچتا ہے۔

لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا ——— میری مسرت کی انتہا نہ رہی ——— شاید "محافظ فرشتہ" میری نگہبانی کر رہا تھا۔ چھوٹا وحشی اپنے دروازے سے نہ ہلا بلکہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے وہیں کھڑا رہا اور میری طرف نہایت بے پروائی بلکہ نفرت سے نظر ڈالتے ہوئے بولا:۔

"او بکری کے بچے! اپنے آپ کو پیچھے سے ایک دھکا دے! پھر سلیج تیزی سے پھسلنے لگے گی"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے کوئلے کا ایک ٹکڑا نکالا اور دیوار پر تیزی سے ایک لفظ لکھ کر دروازے میں غائب ہو گیا۔ لیکن میں اس کے الفاظ کی پروا نہ کرتے ہوئے ڈھلان کی طرف بڑھتا گیا۔ رستہ زیادہ ڈھلوان نہ تھا۔ اس لئے میں ساتھ ہی ساتھ سلیج کی حرکت جاری رکھنے کے لئے اپنے پاؤں کی ٹھیں بھی لگاتا جاتا تھا۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں اس وحشی کے بیان میں کچھ حقیقت نہ ہو۔ واقعی اگر میں اپنی سلیج پر بیٹھوں اور کوئی پیچھے سے آ کر میری پیٹھ کو آگے کی طرف ایک دھکا دے تو سلیج ضرور کچھ نہ کچھ دور چلی جائے گی۔ پس اگر میں اب خود اپنی پیٹھ کو دھکا دوں تو قدرتاً اس کا نتیجہ وہی ہوگا۔ جو کسی اور کے دھکیلنے سے ممکن ہے۔ یہ کتنی آسان بات ہے۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں کہ اس بات کو پہلے سے نہ سوچ لیا۔

احتیاطاً میں نے چاروں طرف نگہ دوڑائی کہ کہیں وہ "چھوٹا وحشی" تو نزدیک نہیں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ذلیل بھی یہ دیکھ لے کہ میں وہ کر رہا ہوں جو اُس نے مجھ سے کہا ہے۔

اس کے بعد میں اپنی پیٹھ کو آگے کی طرف زور زور سے دھکیلنے لگا بہتیرے دھکے دئے کئی مکے رسید کئے یہاں تک کہ میں غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں سلیج اپنی جگہ سے سرکتی ہی نہ تھی۔ کسی کی دو خادمائیں بھی میرے پاس آ کھڑی ہوئیں اور انھوں نے مجھ پر ہنسنا شروع کیا۔ لیکن سلیج کہاں آگے کی طرف سرکنے والی تھی۔

اب میں سخت سٹپٹایا اور غصے میں سلیج کو رسی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گھر بھاگ آیا۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ کاش میرا کوئی بڑا بھائی ہوتا جو اس وحشی کو مار مار کر ادھیڑ دیتا۔

کھانے کی میز پر میں نے اپنی اس مہم کا ذکر اپنے باپ سے کیا اور پوچھا کہ آیا ایسا کیوں ہے کہ آدمی سلیج پر بیٹھ کر جب اپنے آپ کو آگے دھکیلتا ہے تو سلیج آگے نہیں سرکتی؟ باپ نہ تو مجھ پر ہنسا اور نہ جیسا کہ اکثر باپوں کی عادت ہوتی ہے مجھے اس نے بیوقوف کہا بلکہ اس نے میرے سامنے اس عقدے کی ایک نہایت منطقی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو اس قدر متضاد بیانات میں پھنسا لیا کہ آخر کار مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ وہ اس معاملے کے متعلق مجھ سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اب میں اس شبہ میں پڑ گیا کہ معلوم نہیں میں کبھی اس معمے کا حل سوچ بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس لئے ابا سے میں نے کہا کہ کم از کم وہ اس "چھوٹے وحشی" ہی کو ایک مرتبہ خوب پیٹ دیں لیکن انہوں نے مجھے صاف جواب دے دیا کہ میرے پاس وقت نہیں۔

گھنٹے پر لگا کر اڑتے ہیں اور سال گذر جاتے ہیں۔

"چھوٹا وحشی" ایک "بڑا وحشی" بن چکا تھا۔ میں خود بھی سکول داخل کیا گیا اور وہاں جا کر بہت کچھ معلوم ہوا لیکن میں اس بات کی تشفی کن تشریح کہیں سے بھی حاصل نہ کر سکا کہ ایسا کیوں ہے کہ آدمی سلیج پر بیٹھ کر جب اپنے آپ کو دھکا دیتا ہے تو آگے کی طرف نہیں نکل جاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رات کے سناٹے میں میں بستر پر لیٹ کر گھنٹوں اس معمے کا حل سوچتا رہتا ہوں۔ اگر کبھی میرا بیٹا بھی پیدا ہوا اور اس نے مجھ سے یہی سوال پوچھا تو میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ ایک قہقہہ لگا کر یہی کہہ دوں گا کہ ——— "تم بھی عجیب بے وقوف لڑکے ہو!"

(ترجمہ) مہدی علی خاں

اعترافِ شکست

ہے غمِ روزگار کا موضوع — اک چمن جس میں گُل نہیں کھلتے
چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں اس پہ — لیکن الفاظ ہی نہیں ملتے

اختر انصاری

مشاہدات

ہمراہ ہے تمکیں کی تکمیل میں پیوستہ　　پہلو میں مرے دل ہے یا نغمۂ نو بستہ
میرا دلِ گم گشتہ میرا دلِ خوں آگیں　　دیکھا ہے کہیں تو نے اے دستِ حنا بستہ
پابندِ محبت میں بیزارِ محبت تم　　اب تم کو میں کیا سمجھوں آزاد کہ پابستہ
وہ ذات کہ جس کی خو خود بینی و استغنا　　وہ میں کہ مری امید اُس ذات سے وابستہ
آغوشِ محبت میں تم ہو تو میں ساکت ہوں　　تسکینِ محبت تک جذبات ہیں پابستہ

خاموش رکھے حیدرؔ کیوں مجھکو مری فطرت
جب صرفِ تلون ہے وہ چشمِ حیا بستہ

جلال الدین حیدرؔ دہلوی

غزل

کوئی ذلیل ہوا کوئی دل فگار آیا　　تمہاری بزم سے جو آیا سوگوار آیا
سکونِ دل کو فقط اک نگاہ کافی تھی　　ہزار بار ترے در سے بیقرار آیا
خزاں میں کٹ گئی عمرِ عزیز وا ویلا　　نہ اس چمن میں کبھی مژدۂ بہار آیا
خبر سنی تھی کسی سے تمہارے آنے کی　　اس اضطراب میں کل در پہ بار بار آیا

کسی کے بزم میں سیفیؔ حواس ٹھیک نہ تھے
نہ پوچھ مجھ سے بہر حال دن گزار آیا

سیفیؔ نوگانوی

میری تیرہ برس کی ایک نوجوان لڑکی ہے ------ "اب تو وہ جوان عورت ہے کس قدر جلد بڑھ رہی ہے" یہ ہیں وہ الفاظ جو ہر اس شخص کی زبان سے نکلتے ہیں جو اسے دیکھتا ہے ------ اس کا قد لانبا ہے اور وہ ایک سادہ مزاج دوشیزہ ہے اور حقیقت میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اسے اپنے بال کھلے چھوڑ دینا یا کم عمر لڑکیوں کی طرح کٹوا کر کم کر لینا چاہئیں۔ وہ آج کل شباب کی منازل طے کر رہی ہے۔ وہ نہ تو اب کودتی پھرتی ہے اور نہ کھلونوں اور گڑیوں سے کھیلتی ہے۔ بلکہ اس کی عزیز پرانی گڑیاں ایک کونے میں رکھی رہتی ہیں اور اسے اپنی گول گول کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہیں۔

میری کہتی ہے "ان کو میں اپنے بچوں کو دے دوں گی۔ بشرطیکہ وہ لڑکیاں ہوئے۔ حالانکہ شاید میں کسی لڑکی کی ماں ہی نہ بنوں گی"۔

میری گھوڑے کی سواری جانتی ہے اور ٹینس کھیلتی ہے۔ اس کے پاس ایک ریکٹ ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ وہ اسے مختلف جگہوں پر چھپاتی رہتی ہے تاکہ اس کا بھائی جیمز اس پر قبضہ نہ کرے ------ وہ اکثر سینما دیکھنے بھی جاتی ہے۔ ایک صندوق میں اس نے سینما کے ہیرو اور ایک یا دو ہیروئنوں کی تصاویر رکھ چھوڑی ہیں۔ کسی وقت وہ ان میں سے کوئی تصویر نکال لیتی ہے اور اپنے باپ سے کہتی ہے۔

"دیکھو۔ کتنا طاقتور ہے! تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے کافی ہے"۔

لیکن ------ اس نے ابھی اپنی زندگی کی تیرہ بہاریں دیکھی ہیں۔

"اس کا انجام کیا ہوگا؟" اس کی ماں دریافت کرتی ہے۔

"جیسی تم تھیں ویسی نہ ہے"۔ اس کا باپ جواب دیتا ہے۔

"میری جوانی میں تو سینما نہ تھے"!

"وہ کتنا غمگین زمانہ ہوگا" میری کہتی ہے اور پھر یہ کہہ کر "اماں تعجب ہے کہ تم زندہ کس طرح رہیں"! اپنا کلام ختم دیتی ہے۔

میری کھیلوں وغیرہ میں حصہ لیتی ہے لیکن ابھی اس کی پُر امید جوان زندگی میں ایک چیز باقی ہے جس میں اس نے

ابھی تک کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔

اس نے کبھی رقص ——— مکمل اور اصلی رقص' گانے اور دوستوں کے ساتھ رقص میں شرکت نہیں کی رقص کی دعوتوں میں کبھی کبھی، والدین بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں لیکن پھر جلدی واپس گھر چلے آتے ہیں۔ اس لئے اس رقص کو اس میں شامل نہ کرنا چاہئے ——— ایسا رقص نہیں بلکہ اصلی رقص ——— قواعد کے مطابق اور نئے طریقوں پر ——— ایک فونوگراف کے ساتھ نہیں بلکہ تجربہ کار آرکسٹرا کے ساتھ ——— اور یہی اصلی چیز ہے۔

ایک رات میری کھانے پر خاموش بیٹھی رہتی ہے اور وہ سالن جس سے وہ نفرت کرتی ہے بیدلی سے کھاتی رہتی ہے" اور پھر تھوڑی دیر تک کھاتے رہنے کے بعد اپنا چمچہ میز پہ رکھ دیتی ہے ——— ہمارا خیال ہے کہ اب وہ ایک لمبی سانس لینے والی ہے ——— لیکن نہیں اس نے ایسا نہیں کیا ——— شاید کوئی اور وجہ تھی ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر آسماں کی طرف دیکھا اور پھر مصنوعی آواز میں' اس طرح کہ سننے والا اس کے کہنے کا یقین کرے بولی" مجھے ہفتہ کے روز رقص کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ آیور نے مجھے دعوت دی ہے"۔

"میں نہیں سمجھا۔ کون آیور؟ اس کے باپ نے پوچھا۔

آیور لامبرگ اور کون؟"

"میں تو اسے نہیں جانتا۔ کبھی مجھے اس سے تعارف کرانے کی عزت نہیں بخشی گئی"۔

"لیکن میں تو اسے جانتی ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ ہم گذشتہ سرما میں ایک دوسرے سے ملے تھے ہفتہ کا رقص حقیقی معنوں میں رقص ہوگا۔ وہ خود موٹر لے کر آئے گا اور سات بجے مجھے اپنے ساتھ لیجائے گا"۔

"کیا موٹر اس کی ذاتی ہے؟"

"یہ ضروری نہیں کہ موٹر اس کی اپنی ہو۔ بیوقوف نہ بنو۔ کیا ہر جگہ موٹروں کی کثرت نہیں ہے اور کیا وہ آسانی سے نہیں مل سکتیں؟ اچھا۔ ہاں۔ تو کیا میں جاسکتی ہوں۔؟"

"بخوشی"

"لیکن تم مکان کس طرح واپس آؤ گی"۔ اس کی ماں نے جو ذرا پریشان ہوگئی تھی' پوچھا۔

"مکان کس طرح؟ جب رقص ختم ہو جائے گا تو میں گھوڑے پر واپس آؤں گی۔ اور یہ تو صاف ظاہر ہی ہے۔ پھر بیوقوفوں کی طرح باتیں کرنے سے فائدہ؟

اس ہفتہ میں تمام انتظام کرنا ہے — ایک دعوت کے لئے نہیں بلکہ رقص کی شرکت کے لئے — میری کی بہترین پوشاک بھی کسی طرح اس رقص کے لئے موزوں نہ تھی وہ تنگ بھی تھی اور پھر رقص میں پہنی بھی نہ جاسکتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کے پاس عمدہ عمدہ گون موجود تھے۔ لیکن اس کے پاس نہ تھا۔ اگر گون ہو تو پھر اس کے ساتھ نیا جوتا بھی ہونا چاہئے اور جرابیں بھی۔ اور ان چیزوں کے ہوتے ہوئے بالوں میں بھی کسی نہ کسی چیز کا ہونا لازمی تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اور چیزوں کا ہونا بھی بیکار ہے۔

میری اپنی ماں کے ہمراہ دو کانوں پر گئی۔ درزیوں سے گفتگو کی بہترین چیزیں خریدیں۔ مشورے کئے بحث ومباحثہ کیا۔ لیکن پھر بھی کئی چیزوں کی بابت کوئی فیصلہ نہ ہوا۔

ایک دن انہوں نے باپ کو بلایا۔ اسے غور سے دیکھا اور کہا "آج کل ہر ایک چیز کتنی قیمتی ہے"۔ باپ نے بھی تائید کی لیکن کیا میری سب سے پہلے اصلی رقص میں اور وہ بھی ایک دوست کے ہمراہ جسے صرف وہی جانتی ہے نہ جائے گی؟ پس یہی ایک ہل چل مچانے والی بات تھی۔ بہر حال جو کچھ ممکن ہوسکتا تھا وہ کیا گیا۔

آخر کار ایک دن انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور ہفتہ آپہنچا۔ اس روز بھی صبح کو میری حسب معمول اسکول گئی۔ وہاں یہ سوچتی رہی کہ اسے جانا چاہئے یا نہیں — اور پھر دوپہر کے کھانے میں شریک ہونے کے لئے مکان پر آگئی۔ اس نے ہال میں قدم رکھتے ہی سوال کیا، کیا میرا لباس آگیا؟ ہیں سب چیزیں یہاں موجود ہیں؟"

وہاں سب کچھ موجود تھا۔ ہر ایک چیز تیار اس کے بستر پر رکھی تھی۔ جب وہ دوبارہ رات کا کھانا کھانے کے لئے آئی اس وقت تک وہ چیزیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں لیکن پوشاک میں اس کے بھائی نے گلاب کی ایک کلی لگا رکھی تھی۔

پہلے میری نے خیال کیا کہ یہ اصلی کلی ہوگی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اس کو آتش دان میں ڈال دیا۔ کیونکہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ کاغذ کی بنی ہوئی تھی۔

آج کھانا بہت لذیذ تھا اور سب لوگ خاموش بیٹھے کھا رہے تھے۔ خاندان کے افراد محسوس کر رہے تھے کہ آج ایک جوان زندگی میں کوئی تعجب خیز بات ہونے والی ہے۔ 'ٹوک' (کتے کا نام) میری کی کرسی کے پاس بیٹھا تھا اس کی ناک اس کے دامن کو چھو رہی تھی۔ اور وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں محبت کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ کھانے کے بعد جب میری اپنے کمرے میں لباس تبدیل کرنے کے لئے جانے لگی تو اس کے بھائی نے کہا "ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ہیں یہ بات ماڈرن انسائیکلوپیڈیا کی آئندہ اشاعتوں کے لئے لکھ لینا چاہئے"۔

میری بغیر کوئی جواب دئے چلی گئی۔ تیرہ برس کے عمل اور تجربہ نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ ایک لفظ دوسرے کی زندگی

کرتا ہے اور یہ کہ آخری لفظ اس آدمی کے لئے جو غلطی پر ہو کافی ہوتا ہے۔

جب وہ سب سے پہلے رقص کے لئے لباس تبدیل کرنے کو اپنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی اُس وقت اس کے چہرے سے خودداری اور تمکنت ظاہر ہو رہی تھی۔

ایک گھنٹے میں وہ تیار ہوگئی اور اب شان و شوکت سے اپنے گول کمرے میں کھڑی ہے۔ خوبصورت لباس کیسا بھلا معلوم ہو رہا ہے اس کے بال گھونگر یالے بنائے گئے ہیں اور ان کو اتنا خوبصورت بنانے میں بیس عورتوں نے حصہ لیا ہے اور دو ز ائیں صرف ہوئی ہیں۔ جرابیں لباس کے ہمرنگ ہیں اور جوتا بھی نئے طرز کا۔ غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس پر نکتہ چینی کی جاسکے۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ پوشاک کن چیزوں سے بنائی گئی ہے اور نہ میں لباس کی ہر ایک چیز کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔

ہم سب اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اور کوئی بولنے کی جرأت نہیں کرتا۔ حسب موقع الفاظ تلاش کر لینا ذرا مشکل بھی ہے۔

"اچھا ہے نا" میری کہتی ہے۔

"خوب" اس کا باپ اس کے لباس کی تعریف کرتا ہے کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور میری بات کرنے کے لئے دوڑتی ہے۔ رسیور اٹھا کر کہتی ہے 'ہلو' پھر خاموش اور ساکت کھڑی ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد رسیور کو رکھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ جاتی ہے ——— کچھ آہیں ——— اور کچھ آنسو ——— میری رقص کو نہیں جائے گی۔ آیور نہیں آسکتا ——— آہ! نصیب!!۔

(ترجمہ) **دیوانہ مصطفیٰ آبادی**

چاندنی

اس روپہلی شرابِ نوریں سے — کاش میں جامِ شعر بھر سکتا

اے شبِ مہ کے منتشر جلوو — کاش میں تم کو نظم کر سکتا

اختر انصاری

سحرِ موسیقی

شعر و موسیقی

مطربہ! تیری سحر کار آواز
لفظوں میں ڈالتی ہے جان
بن کے میری غزل
اس طرح پھر ان سے میری جان
بن کے تن سے نکالتی ہے جان

انساں کا نغمہ

زمزمہ سنج ہے مطربہ جس وقت
طرب افزا سُروں میں گاتی ہے
زندگی کی اندھیری راتوں میں
ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

تان

مطربہ جب صدائے ساز کے ساتھ
اپنی آواز کو اٹھاتی ہے
تھام لیتا ہوں دل کو میں لیکن
منہ سے توبہ نکل ہی جاتی ہے

مطربہ

اے کہ تو راگنی میں ہے پنہاں
اے کہ تو جسم ہے مست تانوں میں
تھمہ گیت اپنے بازوؤں پہ بھی
تو جب تان ہے آسمانوں میں

اختر انصاری دہلوی

دنیائے ادب

برسات کا سماں

علی گڈھ اور راج گھاٹ کے مابین ریل میں

جھیلیں، تال، تالاب، تلیاں جیسے چھلکتا جام — سڑکیں، لیکھیں، باٹ اور بٹیاں ندیاں بنیں تمام
خندق، کھائی، گڑھا گڑھیا پانی سے لبریز — اونچی دھرتی نہائی دھوئی نالے بہتے تیز
کھیت بنے پانی کی چادر ڈوریں جیسے گوٹ — اونچے کیار لنظا ہر سوکھے پر پانی کی پوٹ
جنگل جنگل کوسوں جل تھل گویا ساگر تال — ٹیلے ٹھیئے گھور اور مینڈھیں ٹاپو کی تمثال
ندی نالے سوت اور چشمے کھتیں ڈبرا اور کھار — ایک ہوتے ہیں سب مل جل کر بس ہیں ہی بہتی دھار
کالی ندی وہ آب کی نالی پانی چلو بھر — مارتی ہیں آج اُس کی لہریں کوسوں کا چکر
نیلا پانی پھول چمکتے سمجھو بے وسواس — گویا اترا تاروں والا دھرتی پر آکاس
ایک تو مینہ کی موسلا دھاریں پھر پروا کا زور — کھیت نچیے مکا کے جیسے دُم کو گرائے مور
لانبے پل کیا چھوٹی پلیں ڈاٹوں تک بھرپور — پلٹیں کھاتا جھاگ اڑاتا پانی کرتا شور
تیز ہوا کی ٹکر کھا کر جھیلوں میں اک جوش — لہریں، چکر، بھنور، پٹاریں اٹھتیں دوش بدوش
جھاڑی بوٹی روکھ اور پودے اونچے نیچے پیڑ — بچھ بچھ جاتے چھانٹے سے کھا کر موج ہوا کی ایڑ
ابھی اندھیرا ابھی اجالا بادل تو بر تو! — بوندا باندی کبھی پھوار اور کبھی دھڑا دھڑ رو
جھل مل کھڑکی شیشہ ٹٹی ریل میں سب تھی بند — گدّے تکیے ننھے ننھے پھر بھی بھیگے چند
سارس، بگلے، بط، مرغابی اور پچھے دہ ہزار — اڑتے اک اک اوج ہوا پر کوئی باندھ قطار

ڈبکی ماریں، تیریں، اچھلیں کبھی مچائیں شور
پھر بھی سوکھے واہ رے ان کے پر پرندوں کا زور

ہندی

محبت

بچہ گود میں اٹھا ہؤا ——
آیا ——
پریم سے ——
ہنستا ——
کھیلتا۔
اور ؟
چمٹ گیا ماتا کی گود سے۔
اس نے۔ہی۔ہوں۔کر کے
محبت سے ——
اپنے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے نازک ہاتھ ——
لگا دیئے ——
ماتا کے منہ سے۔
وہ مسکرائی ——

ڈانٹا ——
لیکن دیکھا ——
پریم بھری نگاہ سے۔
وہ مچلا ——
ہنسا ——
اور جپت لگائی ماں کے گال پر۔
پھر بھی وہ سکھی تھی۔
کیوں ؟
گود میں تھا اُس کا دُلارا ——
بچہ۔
اور ؟
تھی اس کے دل میں ——
محبت۔

اندرجیت شرما

بنگالی

امید

خوبصورت کلی کی مست کرنے والی خوشبو نے باآوازِ بلند پکارا "بہار قریب الاختتام ہے.... لیکن افسوس میں پھول کی پنکھڑیوں میں بند ہوں اور موسمِ بہار کی لذتوں سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی"۔

امید نے کہا "اے نادان کلی! دامن امید ہاتھ سے نہ چھوڑ!! تو پنکھڑیوں کی بندشوں سے جلد ہی آزاد ہو جائیگی"۔ اور ایک شگفتہ پھول بن جائے گی۔ پھر جلد ہی تیری زندگی تمام ہو جائے گی، لیکن بہار اور اس کی مسرتیں ختم نہ ہونگی"۔

کھلے ہوئے پھول میں خوشبو نے تڑپ تڑپ کر کہا "وقت ہوا کی مانند اڑا چلا جا رہا ہے ... لیکن آہ!... میں نہیں جانتی کہ میری منزل کتنی دور ہے ..... افسوس!! مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے"۔

امید نے پکار کر کہا "اے نادان پھول! دامنِ امید کو ہاتھ سے نہ دے ..... نسیم بہار تیری تمنا سے بخوبی آگاہ ہے۔ دن کے ختم ہونے سے پہلے تجھے تیری منزل پر پہنچا دے گی"۔

خوشبو نے یاس کی حالت میں کہا "آہ! میں کس جرم کی پاداش میں یہ سزا بھگت رہی ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کا مقصد معلوم نہیں ..... کیا کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ میری ہستی کس لئے عالم وجود میں لائی گئی؟"

اُمید نے آہستہ سے کہا "اے خوشبوئے جانفزا مایوس نہ ہو ... بہت جلد تیری زندگی کو سحرِ حیاتِ جاودانی میں ملائے گی۔ اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا مقصدِ زندگی کیا ہے؟"

نزہت افضل

اقوالِ زرّیں

سفید بال موت کی کلیاں ہیں۔ ایران

ایک باپ دس بچوں کی پرورش کر سکتا ہے۔ لیکن دس بچے ایک باپ کی خبرگیری نہیں کر سکتے۔ جرمن

حجام یتیموں کے سر سے حجامت بنانی سیکھتے ہیں۔ عرب

انتقام خدا کی غذا ہے۔ سپین

ہم اندھیری رات میں رینگتی ہوئی چیونٹی پکڑ لیتے ہیں۔ لیکن اپنے دل میں غرور کی حرکتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ جرمن

موت وہ سیاہ اونٹ ہے جو ہر دروازے پر گھٹنے ٹیکتا ہے۔ سپین

جو منصف عہدہ خریدتا ہے وہ عدالت فروخت کرتا ہے۔ فرانس

مفلس کے دماغ میں بہت سی دانائیوں کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ "

آقا کی ایک آنکھ نوکر کی چار آنکھوں سے زیادہ دیکھتی ہے۔ اٹلی

پیٹ سر کو مغلوب کر لیتا ہے ۔ — روس

نیلام میں منہ کو بند رکھو ۔ — "

چھٹانک بھر مادری ذہانت سیر بھر سکول کی ذہانت سے بہتر ہوتی ہے ۔ — ڈنمارک

تھیلی پُر ہونے سے پہلے اچھی طرح بند ہو سکتی ہے ۔ — پرتگال

کوئی چیز آنسوؤں سے زیادہ جلد خشک نہیں ہوتی ۔ — یورپ

سید یوسف بخاری دہلوی

ناگزیری

میم ق آوارہ

اس بے قرارئ شباب نئی دنیا میں
جی بھر کے عیش کر لئے ہم نے — تم نے اور میں نے
اور اب تہ ہو چکے ہیں ہماری کشتی کے سفید رنگ بادبان،
اور ختم ہو چکا ہے ہمارا زادِ راہ !
کیوں افسردہ ہو گئے ہیں میرے رخسار اپنے وقت سے پیشتر
آہ ان نالوں سے بھاگ گئی ہیں میری مسرتیں
زرد کر دیا ہے غم نے میرے جوان احمریں ہونٹوں کو
اور تباہی بچھا رہی ہے میرے بستر پر چادریں !
لیکن تمہارے لئے یہ ہنگامہ پرورِ زندگی،
کم نہیں ہے ایک چنگ سے ایک نغمے سے یا رباب کا لطیف
جادو ہے، یا سمندر کا راگ،
جو صدائے بازگشت بن کر سیپوں میں خوابیدہ ہے !

"نخلستان"

نقد و نظر

نوجوان ورتھر کی داستانِ غم - یہ جرمنی کے مایۂ ناز فلسفی شاعر گوئٹے کا مشہور افسانہ ہے جس کا ترجمہ جناب ریاض الحسن صاحب ایم۔اے نے اردو زبان میں کیا ہے۔ افسانہ کیا ہے نفسیاتِ شباب کی ایک رومانی تصویر ہے۔ افسانے کا ہیرو ورتھر خطوط کے ذریعے سے اپنی داستانِ عشق اپنے ایک عزیز دوست کی طرف لکھتا ہے۔ اس انوکھے طرزِ بیان نے افسانے کو بہت زیادہ موثر اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ ورتھر کو ایک لڑکی سے محبت ہے۔ وہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن ورتھر کی کم نصیبی سے اس کی شادی کسی اور شخص سے ہو جاتی ہے اور وہ یاس و حرماں کی پر آشوب زندگی سے تنگ آکر آخر ایک دن خودکشی کر لیتا ہے مصنف نے نفسی کیفیات کی ایسی تحلیل کی ہے اور مناظرِ قدرت کو ایسی تفصیل سے لکھا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے ہر موقع کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ریاض الحسن صاحب نے ترجمہ بھی بہت عمدہ کیا ہے۔ اردو والوں کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے ایک ایسی بلند پایہ کتاب کا اردو ادب میں اضافہ کیا۔ آغاز میں مترجم کی طرف سے ۵۰ صفحے کا ایک مبسوط ابتدائیہ بھی ہے جس میں گوئٹے کی زندگی اور اس کے فلسفے پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا حجم ابتدائیہ کے علاوہ ۱۴۴ صفحات ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ لٹریری سنڈیکیٹ ۱۔ بیلی روڈ الہ آباد۔

سلمٰی - یہ جنابِ انصار ناصری کے قلم سے انگریزی زبان کے نہایت ہی مقبول مصنف آسکر وائیلڈ کے ایک بہترین افسانے "سالومی" کا اردو ترجمہ ہے۔ سالومی کی نسبت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ آسکر وائیلڈ کی اُن دو تصانیف میں سے ایک ہے جن کے بارے میں خود مصنف نے اپنی محنت کا اعتراف اور ان کی کامیابی پر ناز کیا ہے۔ یہ ایک شاہزادی کی طوفان انگیز محبت کی کہانی ہے جسے مصنف نے اپنے رنگین اور شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انصار صاحب نے ترجمہ اتنا اچھا کیا ہے اور ایسے خوبصورت اور دلکش الفاظ استعمال کئے ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے حجم ۱۷ صفحے چھوٹا سائز قیمت پانچ آنے۔ ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمایئے۔

تجدیدِ عمل - ایک آزاد خیال نوجوان مرزا عسکری علی خاں صاحب مجازی کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے تمام مذاہب کی مخالفت کی ہے اور انہیں اوہام کا مجموعہ ثابت کیا ہے۔ مرزا صاحب ہندوستانی قوم کو عقلیت کے مذہب کی طرف بلاتے ہیں اور اپنی زندگی کا دستور العمل آپ بنانے کا مشورہ دیتے ہیں حجم ۴۲ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ اردو بک سٹال۔ لوہاری دروازہ لاہور۔

ندیم - بہار نمبر - صوبۂ بہار اُن مقامات میں سے ہے جہاں اردو زبان نے جنم لیا - یہاں شیر شاہ اور اکبر کے عہد میں اردو شعرا کا کلام پایا جاتا ہے - اور جس زمانے میں دہلی و لکھنؤ اردو شاعری کا مرکز تھے اس وقت عظیم آباد بھی باکمال شعرا سے بھرا ہوا تھا - صوبۂ بہار میں تقریباً ڈھائی کروڑ انسانوں کی مادری زبان اُردو ہے - لیکن ان حالات کے باوجود صوبۂ بہار کو اردو زبان کے سلسلے میں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق تھا - اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں اخبارات و رسائل کی ہمیشہ کمی رہی ہے - رسالہ "ندیم" کا بہار پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے ایک ہی نمبر میں اس کامیابی کے ساتھ بہار کے ادبیات وہاں کے ادبا اور تاریخ ادب کو متعارف کرایا ہے کہ اس طرح کوئی ضخیم تذکرہ ہی کرا سکتا تھا - اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نمبر ایک ضخیم تذکرے سے کسی طرح بھی کم نہیں - حجم سوا تین سو صفحات جن میں ساٹھ مبسوط مضامین درج ہیں - پینتیس تصاویر ہیں جن میں کچھ فن کے متعلق ہیں، کچھ تاریخی مقامات اور مناظر کے متعلق اور کچھ شخصیتوں کی ہیں - قیمت ایک روپیہ چار آنے - پتہ دفتر رسالہ "ندیم" پنچائتی اکھاڑہ - گیا -

نخلستان - یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جس میں ادبی تعلیمی اور اصلاحی مضامین شائع ہوتے ہیں - فقیر غلام حیدر صاحب اس کے مدیر مسئول ہیں لیکن گذشتہ دو ماہ سے ہمارے نہایت ہی قابل دوست حضرت راشد وحیدی ایم اے اقتصادیات اور آغا عبدالحمید صاحب بی - اے آنرز بھی اس کی ترتیب میں حصہ لینے لگے ہیں - راشد صاحب کے مفکرانہ اور شگفتہ طرز تحریر سے اُردو رسائل کے ناظرین اچھی طرح واقف ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ان کی نگرانی میں خوب ترقی کرے گا - حجم ۵۶ صفحات - سالانہ چندہ تین روپے - پتہ مینیجر "نخلستان" - ملتان -

رہنمائے تعلیم - ہمارے سامنے اس رسالے کا جوبلی نمبر ہے جو ساڑھے سات سو صفحات پر نہایت شان سے نکلا ہے - موجودہ کساد بازاری کے باوجود اس کے اولوالعزم مالک و ایڈیٹر سردار جگت سنگھ صاحب نے اس پر آٹھ ہزار روپے صرف کر دئیے ہیں - سردار صاحب ایک فاضل اور تجربہ کار ایڈیٹر ہیں اور انہوں نے جہاں اسے بہت سی یک رنگ و سہ رنگ تصاویر سے مزین کیا ہے وہاں معنوی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بہت بلند رکھا ہے - قیمت دو روپے آٹھ آنے - دفتر رسالہ رہنمائے تعلیم - رام گلی - لاہور سے طلب فرمائیے -

کلیدِ عربی (پہلا حصہ) مولفہ مولانا قاری خلیل احمد صاحب لکھنوی فاضل دینیات - اس کتاب میں جدید اصول پر عربی سیکھنے کے لئے آسان مشقیں دی گئی ہیں - قیمت تین آنے - پتہ - بشری بک ڈپو - ۱۳۱ - کتابت خاں سٹریٹ - موئنٹ روڈ - مدراس -

آیات بینات فی حقیقۃ الصلوٰۃ - مولفہ مفتی محمد الدین صاحب وکیل گجرات - اس کتاب میں قرآن مجید کی آیات کے حوالوں سے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں صلوٰۃ کا کیا مفہوم ہے - مفتی صاحب نے جس محنت اور جانفشانی کے ساتھ اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے - حجم ۴۴ صفحات قیمت آٹھ آنے - مفتی نذیر احمد صاحب دائرہ بلوچاں گجرات پنجاب -

اسلام اور غلامی - از مولوی حفیظ اللہ صاحب اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اگرچہ اسلام نے غلامی کو ناجائز قرار نہیں دیا تاہم غلاموں کو تعلیم کی آزادی تھی اور ان کی ترقی میں کبھی مانع نہیں ہوا - کتاب کافی محنت سے لکھی گئی ہے - حجم ۳۲ صفحات قیمت تین آنے - ملنے کا پتہ مینیجر مسلم ایسوسی ایشن بک ڈپو - پھلواری شریف - پٹنہ -

فہرست مضامین

جلد ۹۲ — نمبر ۵

بابت ماہ نومبر ۱۹۳۳ع

تصاویر (۱) گلہائے نوبہار (۲) اورنگ زیب عالمگیر

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	حال و قال	منصور احمد	۲
۲	آئینۂ عالم	"	۳
۳	سودا کے مرثیے	جناب سید طالب علی صاحب بی اے، الہ آباد	۹
۴	درسِ زندگی (نظم)	جناب سید عبدالحمید صاحب عدم	۲۴
۵	چار دن (افسانہ)	جناب ایس ایم ناظم صاحب میرٹھی، ایم ایس سی	۲۶
۶	تجلیات (نظم)	جناب مولانا جلال الدین صاحب اکبر بی اے آنرز	۳۶
۷	مولوی صاحب (افسانہ)	منصور احمد	۳۷
۸	رباعیات	جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری	۴۰
۹	قیصر صحرا	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم، ایم اے	۴۱
۱۰	غزل	حضرت حفیظ جالندھری	۴۴
۱۱	نادر قلی (ڈراما)	جناب محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ	۴۵
۱۲	شوہر سے خطاب (نظم)	جناب کے اے زیدی صاحب، حیدرآباد دکن	۵۲
۱۳	شاہانِ مغلیہ کا خزانہ	جناب مسٹر شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم اے ایل ایل بی علیگ	۵۳
۱۴	راحت کدہ (نظم)	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے	۵۵
۱۵	لندن میں ذرائع آمد و رفت	جناب مسٹر محمد مسعود صاحب بی اے، ایم آر سی وی ایس (لندن)	۵۶
۱۶	غزل	جناب مسٹر عبدالقیوم صاحب نظر بی، اے	۵۹
۱۷	انگنی (افسانہ)	حضرت وقار انبالوی	۶۰
۱۸	رباعیات	جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی	۶۴
۱۹	بھکاری کا دل (افسانہ)	حضرت آسی رام نگری	۶۵
۲۰	گیت	جناب پنڈت آنند رجیت صاحب شرما	۷۰
۲۱	انعامی مقابلہ		۷۱
۲۲	دنیائے ادب		۷۳
۲۳	نقد و نظر		۸۰

سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول ڈاک اور نو آنے کا ... پانچ روپے ـ ممالک غیر سے ...

حال و قال

جب سے "ادبی دنیا" جاری ہوا ہے اُس نے اپنے ذاتی مفاد پر علمی خدمت کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اُس نے کم از کم قیمت
میں اپنے قارئین کو زیادہ سے زیادہ سامانِ دلچسپی فراہم کرکے ہزاروں روپے کا نقصان اُٹھایا ہے۔

"ادبی دنیا" کے دورِ جدید میں اس کے نئے کارپردازوں نے ظاہری و معنوی حیثیت سے اس کا معیار پہلے سے بھی بلند کر
دیا ہے۔ انہوں نے اس کا حجم ۶۴ سے ۷۲ اور ۷۲ سے اسّی صفحات تک پہنچا دیا ہے اور اس کے باوجود اس کی قیمت میں کمی کر
دی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک بہت بڑی ذمہ واری اپنے سر لی ہے۔ اور وہ اس کا سالنامہ ہے "ادبی دنیا" کے معمولی
پرچوں ہی پر اتنا صرف ہو جاتا ہے کہ سالنامہ نکالنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اب تک ۱۹۳۲ء کے سوا "ادبی دنیا" نے کبھی سالنامہ نہیں
نکالا تھا لیکن نئے منتظمین نے ہر سال بالالتزام بغیر کسی زائد قیمت کے مطالبے کے معمولی سالانہ چندے ہی میں سالنامہ دینے کا فیصلہ کیا ہے
۱۹۳۴ء کا سالنامہ دسمبر کے تیسرے ہفتے میں شائع ہونے والا ہے۔ اس کے لئے ہم نے بڑی محنت اور صرفِ کثیر کے ساتھ
ملک کے بہترین ادیبوں کے بلند پایہ مضامین اور مشہور مصوروں کی منتخب تصاویر مہیّا کی ہیں۔ یہ پرچہ جدید علم و ادب کا نہایت دلکش مرقع
ہوگا اور اہلِ ذوق کے لئے نئے سال کا بہترین تحفہ ثابت ہوگا۔

اس پرچے میں حفیظ جالندھری کی ایک دلکش غزل شائع ہو رہی ہے۔ یہ بات میرے لئے مسرت کا باعث ہے کہ اُنہوں نے
میری درخواست پر اپنا نغمہ ریز کلام "ادبی دنیا" کو مرحمت فرمایا اور آئندہ بھی "ادبی دنیا" کی اعانت کا وعدہ کیا۔ حضرتِ حفیظ کا
کلام عام طور پر رسائل میں شائع نہیں ہوتا۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے وعدے کا ایفا "ادبی دنیا" کے معاملے میں نہایت فیاضی
سے کریں گے اور سالنامے کے لئے ضرور ایک گیت لکھیں گے۔

ایس ایم ناظم صاحب میرٹھی کا افسانہ "جاردن" غالباً ایک روسی افسانے کا ترجمہ ہے جو جنگ کی تباہ کاریوں کا ایک خوفناک
نقشہ ہے۔ اس عہد کے مشہور ترین ناول "آل کوئٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ" کا خیال مصنف کو اسی افسانے سے پیدا ہوا
تھا۔ تحدیدِ اسلحہ کی خواہ کتنی کانفرنسیں منعقد کی جائیں جنگ رک نہیں سکتی۔ جنگ کے روکنے کی صرف ایک تدبیر ہے اور
وہ یہ کہ دلوں میں اس سے نفرت پیدا کی جائے۔ یہی مقصد اس افسانے کی تصنیف کا محرک ہوا۔

منصور احمد

آئینۂ عالم

رُوس کی اجتماعیت کا ردِّ عمل

سوویٹ تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ بچوں کو اچھے اشتراکی بنائے، اور اُن کے دلوں میں اشتراکیت کی محبت پیدا کرے انہیں اکٹھے رہنا، اکٹھے کام کرنا، اکٹھے کھیلنا، اکٹھے پڑھنا اور انفرادی خواہشات کو حتی الامکان مٹانا سکھائے۔ چنانچہ کوشش کی جاتی ہے کہ بچے ٹولیاں بنا بنا کر پڑھیں، مل کر مضمون تیار کریں اور یکجا سوال حل کریں۔

ذاتی ملکیت کی خواہش کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ فرد اور اس کے مفاد سے جماعت کی حفاظت کے پیشِ نظر اغماض کیا جاتا ہے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ دیہاتی بچوں کی نئی پود جو سوویٹ مدارس میں تعلیم پا رہی ہے۔ بڑی ہو کر اجتماعی کاشت پر پرانے کسانوں کی طرح معترض نہ ہوگی، بلکہ نئی ملکیت کی انفرادی ملکیت ہی کی طرح غور و پرداخت کرے گی۔

اگرچہ مدارس نے اس ذہنیت کے پیدا کرنے میں بہت کام کیا ہے اور بچوں کے دلوں میں اشتراکیت کی محبت اور روس کے علاوہ دوسری سرمایہ دار دنیا کی مسخ شدہ تصویر دکھا کر اُس سے نفرت پیدا کی ہے لیکن انسانی فطرت کی از سرِ نو تعمیر کی اس کوشش سے بعض غیر متوقع نفسیاتی نتائج بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ماسکو کے بعض مدارس میں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ سوویٹ بچوں کے دلوں میں تخلیے کے لئے اور اجتماعی سرگرمی کے شور و غوغا سے نجات کے لئے ایک عجیب قسم کی دبی ہوئی خواہش موجود ہے۔

ماسکو کے ایک بڑے مدرسے نے حال ہی میں طالب علموں سے یہ سوال کیا کہ وہ اپنی چھٹیاں کس طرح گزارنا چاہتے ہیں جوابات بے نام طلب کئے گئے۔ تمام جوابات غیر متوقع تھے۔ ایک نے لکھا "میں تنہا آوارہ گردی کرنا چاہتا ہوں"، ایک مشہور ماہرِ تعلیم ای سنزاگاف نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جبراً ایک جا رہنے کے خلاف بچوں کی طبیعتوں کا یہ ایک ردِ عمل ہے وہ کہتے ہیں کہ "چھٹیاں صبح سے شام تک یکجا گزاری جاتی ہیں۔ صبح کے وقت سب مل کر سیر و تفریح کے لئے کھلی فضا میں جاتے ہیں، اور شام کو سب سینما یا تھیئٹر دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچے امن و سکون کے لئے بے چین ہو رہے ہیں اور تنہائی چاہتے ہیں"۔

بالکل اسی قسم کے جذبات کا اظہار بعض اُن نوجوان اشتراکیوں کی ڈائریوں سے ہوا ہے جو ایک اشتراکی انجمن

رکن ہیں۔ اکٹھے بیدار ہونے، اکٹھے ورزش کرنے کھیتوں میں اکٹھے کام کرنے، اکٹھے نہانے اور اکٹھے سیاسی کھیل کھیلنے کی زندگی کے بیان کے بعد ان ڈائریوں میں بھی خیالات دہرائے گئے ہیں کہ آرام کے گھنٹے سب سے زیادہ پرمسرت ہیں، "کیونکہ اُس وقت ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں اور جس بات کی نسبت چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں"۔ ایک بچہ لکھتا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو اسے نہایت خوشی ہوتی ہے "کیونکہ اُس وقت ہمیں کسی قدر آزادی ملتی ہے"۔

ایک اور ردِعمل جو پھیکے سیٹھے بے لطف سیاسی اور اقتصادی اوہام کو کمسن بچوں کے سروں میں ٹھونسنے سے پیدا ہوا ہے یہ ہے کہ وہ انتہا درجے کے جذبات پرست ہو گئے ہیں۔ ایک لڑکی اپنی ڈائری میں لکھتی ہے (سوویٹ بچوں میں ڈائری رکھنے کی رسم عام ہے) "اے عورت، جب تو محبت کرتی ہے تو تو ایک غلام ہوتی ہے، لیکن جب تجھ سے محبت کی جاتی ہے تو تو ایک ملکہ ہوتی ہے"۔ پھر اُس نے لکھا ہے "محبت بیوقوفوں کے لئے ایک کھلونا ہے، اور شادی احمقوں کے لئے ایک حافظہٴ غلامی"۔ یہ لڑکی اور اس کی سہیلیاں پڑھنے کی طرف کچھ زیادہ دھیان نہیں رکھتی تھیں بلکہ سینما دیکھنے اور سینما کے مغنیوں کی تصویریں خریدنے میں وقت صرف کرتی تھیں۔

مجلس اقوام کا نیا عظیم الشان محل

مجلس اقوام کا نیا محل جس پر پچاس لاکھ ڈالر صرف ہوئے ہیں، دنیا کی سب سے بڑی پارلیمانی عمارت ہے۔ اس کا طول ایک میل ہے اور اس میں تین ہزار سے زیادہ مدبر، سیاسی، دفتردار، اخبارات کے نمائندے اور حاضرین سما سکتے ہیں۔ یہ عمارت جو طول و عرض میں ورسیلز کے شاہی محل کے برابر ہے اگست ۱۹۳۵ء میں استعمال کے قابل ہو گی۔ سیمنٹ کی تین لاکھ بوریاں، سات لاکھ اینٹیں اور چار ہزار سات سو ٹن وزنی لوہے کے شہتیر اس عظیم الشان محل کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔ اس کی جسامت پانچ لاکھ بہتر ہزار مکعب گز ہے اور چھتیس ہزار چار سو مکعب گز فرانسیسی، اطالوی اور سوئس اینٹوں کو پانچ لاکھ ٹن کنکریٹ سے اس میں جمایا گیا ہے۔

مجلس کے محل کی عام بناوٹ قدیم رومی طرز کی ہے جس میں موجودہ ضروریات کے مطابق سادگی کو کام میں لایا گیا ہے۔ موٹی موٹی دیواریں بے ستون ہونے کے باوجود اپنی قوت اور استحکام کا اثر دل پر ڈالتی ہیں۔ محل اتنا وسیع ہے کہ انسان اس کے اندر جا کر گم ہو جاتا ہے۔ جنوب سے شمال تک اس کے بیچ میں سے گزرنے کے لئے پاؤ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔

چار سو سے زائد فرانسیسی، اطالوی اور سوئس معمار محل کی تعمیر میں سال بھر کام کرتے رہتے ہیں۔ اس کا بنیادی پتھر

یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو رکھا گیا تھا۔ اس پر بھی محل کا افتتاح ستمبر ۱۹۳۵ء سے قبل نہیں ہو سکے گا۔ اگرچہ ابتدا میں یہ تجویز ہوئی تھی کہ محل کی تکمیل ستمبر ۱۹۳۴ء میں کر دی جائے۔

ایوان مجلس کے گرد اگرد مدبرین کے سروں کے اوپر سینما کے بکسوں کی طرح متحرک تصویر سازوں اور اخبارات کے فوٹوگرافروں کے لئے خاص طور پر خانے بنائے گئے ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ ایوان مجلس کے چاروں کونوں کو شیکسپیئر، پاسٹیور، شوپن ہاور اور لیونارڈو دونچی کے مجسموں سے آراستہ کیا جائے۔

اخبارات کے نمائندوں کے لئے بڑی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ان کے لئے ٹین مے خانے پچاس ٹیلیفون مجلس کے کونسل ہال میں ۲۰۶ نشستیں، دو بڑے بڑے لکھنے کے کمرے، دو تار گھر، لاسلکی کا کمرہ، ۵۵ اطلاعات کے دفتر اور بے اندازہ کمرے مہیا کئے گئے ہیں۔ محل کے باغ کو استعمال کرنے کی بھی انہیں اجازت ہوگی۔

اس عمارت کی تعمیر میں پانچ بہت بڑے ماہرین فن کام کر رہے ہیں مسٹر فلیجن ہمیر جو جنیوا کے رہنے والے ہیں ان پانچ میں سے ایک ہیں۔ یونائیٹڈ پریس کے نمائندے کو محل دکھاتے ہوئے وہ اسے موٹر میں بٹھا کر مغربی دروازے سے ایوان مجلس میں لے گئے جس میں ۳۲۰ نمائندے، ۵۱۳ معتمدین اور سیاس ۳۱۹ مدبرین سلطنت ۴۹۶ اخبارات کے نمائندے اور ۲۰۱ پبلک کے آدمی گویا کل ۱۸۶۰ افراد بیٹھ سکیں گے۔

جنیوا کی حکومت نے محل کے سکون و سکوت کی حفاظت کے لئے وہاں سے جنیوا لوزان ریلوے کو پرے ہٹا لیا ہے۔

مجلس کی ایک لائبریری ہوگی جس پر بیس لاکھ ڈالر صرف ہونگے۔ اس میں دس لاکھ کتابیں ہونگی۔ دنیا کے تمام بین الاقوامی معاہدات اس میں رکھے جائیں گے۔

کونسل ہال میں ۵۴۹ آدمیوں کی گنجائش ہوگی جن میں ۲۱ مندوبین، ۲۸ معتمدین اور سیاس، ۱۸۰ اخبارات کے نمائندے ۱۰۰ مدبرین سلطنت اور ۱۰۰ پبلک کے افراد ہونگے۔

معتمدی کا دفتر تقریباً ایک ہزار فٹ طویل ہے، اور اس کے دفتر میں چھ آدمی کام کر سکیں گے۔ سکرٹری جنرل کا کمرہ جو معتمدی کے جنوب مغرب میں واقع ہے نہایت شاندار ہے اور جب مکمل ہو جائے گا تو اس میں لاسلکی کا انتظام بھی کیا جائیگا تاکہ ممالک غیر کی خبریں انہیں وہاں بیٹھے بٹھائے معلوم ہو سکیں اور وہ خود مجلس کے لاسلکی آلہ کے ذریعے دوسرے مقامات سے باتیں کر سکیں۔

ترکی کے دیہاتی اخبارات

مصطفےٰ کمال کی جماعت کے لیڈروں نے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ترکی حکومت نے دیہاتیوں کی تعلیم کے سلسلے میں ایک

نئی کوشش کا آغاز کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ خاص خاص اخبارات کو سرکردیہات میں دیواروں پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ یہ اخبارات دیہات میں رہنے والی رعایا کی ایک بہت بڑی انجمن کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں خبریں نہایت آسان پیرائے میں اور مختصر طور پر دی جاتی ہیں اور ضرورت کے مطابق تصویروں اور نقشوں سے ان کی توضیح بھی کی جاتی ہے۔ یہ تمام کوشش اس لئے کی گئی ہے کہ دیہاتیوں میں اپنے حلقے سے باہر کے معاملات کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو جائے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس سے پروپیگنڈا اور تعلیم دونوں مقصد حل ہو جاتے ہیں اور ہندوستان میں بھی اگر اسے رائج کیا جائے تو مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

دنیا کے سینما

واشنگٹن کے شعبۂ تجارت کی تحقیقات کے مطابق ۱۹۳۲ء میں ساری دنیا کے سینما گھروں کی تعداد ۶۱۹۲۴ تھی۔ ان میں سے ۳۶۹۵۵ بولنے والی تصویریں دکھاتے ہیں۔

اگرچہ یورپ میں ایک براعظم کی حیثیت سے سینما گھروں کی تعداد سب سے بڑھ کر ہے لیکن متکلم فلمیں دکھانے والے سینما مقابلۃً کم ہیں۔ یہاں کل ۳۰۶۲۳ سینما گھر ہیں، اور ان میں سے ۷۸۲۲ ایسی بولنے والے آلے لگے ہیں۔

لیکن دوسرے ملکوں میں سب سے زیادہ یہاں تک کہ ریاستہائے متحدہ سے بھی زیادہ سینما گھر روس میں ہیں۔ ریاستہائے متحدہ میں ۲۵۶۸۸ سینما ہیں، جن میں سے ۱۶۶۰۷ آواز پیدا کرتے ہیں۔ روس میں ۲۷۵۷۰ سینما ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ حکومت فلم کے ذریعے سے سیاسی اور تعلیمی پروپیگنڈا کی اہمیت کو کس قدر سمجھتی ہے۔ روسی سینما گھروں کی کل تعداد میں سے شہروں میں صرف ۸۵۳۹ مستقل سینما ہیں اور ۴۱۹۷ مستقل سینما دیہاتی اضلاع میں ہیں، لیکن ۱۳۴۳۸ سفری سینما دیہاتی اضلاع کے لئے ہیں اور ۸۲۰ شہروں کے لئے۔

روس کے بعد جرمنی میں سینما گھروں کی تعداد یورپ میں سب سے زیادہ ہے، یعنی ۵۰۷۱، دوسرے نمبر پر انگلستان ہے۔ یہاں ۴۹۵۱ سینما ہیں۔

شراب خوار چیونٹیاں

حضرت سلیمان نے کہا تھا "اے سست انسان چیونٹی کی طرف دیکھ!" لیکن پروفیسر جولین ہکسلے نے جو اس وقت مغرب میں ایک بہت بڑے حکیم ہیں اپنی تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ چیونٹیاں بھی انسان کی طرح بہت سی برائیوں

میں مبتلا ہیں حضرت سلیمان کا زمانہ نیکی کا زمانہ تھا جب انسان کو چیونٹیوں کی تقلید کا حکم دیا گیا تھا۔ انسان نے تو چیونٹیوں کی مثال سے سبق حاصل نہ کیا لیکن چیونٹیوں پر انسان کی صحبت کا اثر ہو گیا۔

پروفیسر ہکسلے کہتے ہیں کہ چیونٹیاں آدمی کی طرح شراب پیتی ہیں۔ یہ شراب ایک خاص قسم کے بھنوروں میں سے نکلتی ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے چیونٹیاں ہر صعوبت اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس کے لئے بھنوروں کو اپنے بچے تک کھلا دیتی ہیں۔

چیونٹیوں میں بردہ فروشی بھی موجود ہے۔ ان میں خانہ بدوش لٹیرے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی جان تک لینے سے دریغ نہیں کرتے۔

انسان کے علاوہ یہی ایک مخلوق ہے جو گھروں میں نوکر رکھتی ہے، بچوں سے محنت لیتی ہے، ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتی ہے اور ایک نظام کے ماتحت کھیتی باڑی کرتی ہے۔

ان میں ذات پات کا بھی ایک کامل نظام موجود ہے بعض چیونٹیاں پالتو جانور رکھتی ہیں اور بعض کھیتی باڑی کرتی ہیں۔

آخر میں پروفیسر ہکسلے نے کہا ہے کہ چیونٹیاں کبھی انسان پر فوقیت حاصل نہیں کر سکیں گی۔ چیونٹیوں کا ارتقا کروڑوں سال سے ختم ہو چکا ہے، اور انسان کا ارتقا ابھی شروع ہی ہوا ہے۔

ایک گم شدہ زبان کی تلاش

ایک امریکن عالم گزشتہ بارہ سال سے چین کے صوبۂ یونان میں وہاں کے قدیم قبیلوں کے ساتھ اس لئے قیام پذیر ہیں کہ اُن سے ایک گم شدہ زبان کا سراغ نکالیں۔ یہ ڈاکٹر جے ایف راک ہیں جو سنہ ۱۹۲۱ء میں ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ زراعت کے لئے چین میں تحقیق کا کام کرنے کے لئے آئے تھے۔ آج کل وہ نہایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ ایک کتاب کی ترتیب میں مصروف ہیں جس کا موضوع ایک بھولی بسری قدیم زبان ہو گی۔

ڈاکٹر راک کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی تہذیب میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو زمانہ حجریہ کا تتمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ پہاڑی لوگ پتھر سے آگ پیدا کرتے ہیں اور اپنی جھونپڑیوں کو دیواروں کی درزوں میں مشعلیں نصب کر کے روشن کرتے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف کی صحت ان دنوں اچھی نہیں ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنی کتاب کی تکمیل سے پہلے مر گیا تو یہ زبان صفحۂ ہستی سے بالکل مٹ جائیگی۔ ناشی قبیلہ جو اس زبان کا حامل ہے صرف ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور وہ نہایت سرعت سے

معدوم ہو رہا ہے۔ یہ لوگ پُرامن زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن ایک زمانے میں یہ تمام چین کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے، اور منگ شہنشاہوں کے عہد میں انہوں نے یونان اور زیچوان کے علاقے فتح کر لئے تھے۔

جب یہ لوگ بھیڑوں کی تلاش میں پندرہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر جاتے ہیں تو ڈاکٹر راک بھی اُن کے ہمراہ ہوتے ہیں اور جب شکار کے موسم میں گاؤں کے گاؤں اس سے بھی زیادہ بلندی پر جا پہنچتے ہیں تو بھی وہ اُن کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں وہ لوگ اپنے ہی قبیلے کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور اُن کے علم و فضل کی وجہ سے ان کی عزت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر راک زیادہ تر اس قبیلے کے ساحروں سے میل جول رکھتے ہیں، کیونکہ یہی لوگ ناشی ادبیات سے واقف ہیں۔ یہی شادی بیاہ کی رسمیں انجام دیتے ہیں، پوجا کے شبد پڑھتے ہیں اور مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان کی ادبیات کا سرمایہ صرف اُن کے ذہنوں تک محدود ہے۔ لیکن لکڑی کی تختیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر یادداشت کے طور پر وہ کچھ نشان لگا رکھتے ہیں۔ یہ نشان تصویروں اور حرفوں کا ایک عجیب مرکب ہیں۔ ڈاکٹر راک نے اس طرزِ تحریر کو سیکھ لیا ہے لیکن صرف اُن کو پڑھ لینے سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ ان سے کوئی خاص معانی نہیں بنتے بلکہ یہ صرف ایک ایسا فقرہ ہوتا ہے جس سے اُن لوگوں کے حافظے کو ساری عبارت یاد کرنے میں مدد ملتی ہے۔

سو کچھ اس طرح خانہ بدوش ناشیوں کے ساتھ ڈاکٹر راک اپنی زندگی بیماری اور افسردگی میں صرف کر رہے ہیں؛ اور ان کی ادبیات کو محفوظ کرنے کی کوشش میں وقت کے ساتھ اپنی جان لڑا رہے ہیں۔

دُنیا کی قدیم ترین رصدگاہ

سات سو سال تک موسم کے تغیر و تبدل کا اندازہ کرنے اور مبارک و نامبارک دنوں کی تعیین اور نظامِ فلکی کا مشاہدہ کرنے کے بعد پیکن (چین) کی مشہور رصدگاہ بند کر دی گئی ہے۔ اس کا قیام میلز کے شہرۂ آفاق سیاح مارکو پولو کے سفر چین کے وقت ظہور میں آیا۔ اس کی بنا خاقانِ چین قبلائی خاں نے ۱۲۷۹ء میں رکھی۔ اس کے تین سو سال بعد یورپ کی پہلی رصدگاہ ۱۵۷۶ء میں فریڈرک دوم شاہ ڈنمارک نے تعمیر کی۔ گرینچ کی رصدگاہ ۱۶۷۵ء اور پیرس کی رصدگاہ ۱۶۷۱ء میں بنی اس لئے چین کی رصدگاہ کو دنیا بھر میں سب سے پرانا مانا جا سکتا ہے۔

چینیوں کا ہر کام سرکاری منجموں کے مشورہ سے کیا جاتا تھا۔ کوئی شادی، جنازہ، زمین کی کاشت حتیٰ کہ بچوں کو کھلانا پلانا ستاروں کے مشاہدہ کے سوا نہیں ہوتا تھا۔ چار سو سال تک یہ رصدگاہ عربوں کے زیرِ اہتمام رہی۔ بعد میں عیسائیوں نے اُن کی جگہ لے لی۔

چینیوں کا اعتقاد تھا کہ دو دیو راہو اور کیتھو گرہن کے وقت چاند کو نگل جاتے ہیں اس لئے ان دیووں کو بھگانے کے لئے رصدگاہ کے قریب بندوق کے فیر کرتے اور پٹاخے چلاتے تھے۔ اب رصدگاہ کے کام اور ہر قسم کے تمام سامان کو سرکاری عجائب گھر کے تحت میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

سودا کے مرثیے

اگر آج یہ خبر مشہور ہو کہ مرزا محمد رفیع سودا زندہ ہو گئے تو ہم تصویر بن جائیں گے، آئینہ ہو جائیں گے، دل سے کوشش کرینگے کہ دس ہی منٹ کے لئے ہی ملیں، اپنی کہیں انکی سنیں۔

ہماری گفتگو میں محبت بھی ہوگی اور ادب بھی، مرزا کی زبان پر ہم نکتہ چینیاں نہ کرینگے، ان کے محاورات پر چیں بجبیں نہ ہونگے اس واسطے کہ ہر لمحہ یہی خیال رہے گا کہ ہم ایسے شخص سے باتیں کر رہے ہیں جو ڈیڑھ سو برس پہلے کا ہے، آج سا فر بھی اپنے عہد میں شہنشاہِ سخن تھا جب دنیا کی تہذیب، زبان، رسوم، انداز گفتگو، لباس، معاشرت، سیاست، معیشت، علم، حکمت سب کچھ دس بیس برس میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں تو ۱۳۵۳ھ میں ۱۱۹۸ھ کی زبان کیسے کام دیگی۔

سودا زندہ ہیں زندہ رہیں گے۔ ہم آپ جب چاہیں اُن سے مل سکتے ہیں مگر شہنشاہِ سخن کی بارگاہ میں جانے کے لئے کچھ شرطیں ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ تعصب کا جامہ باہر اتار کر اندر جائیے، دوسری یہ ہے کہ ادب کے موتی اور محبت کی اشرفیاں نذر کیلئے ساتھ لیجائیے۔ آپ خود جب تک بلند نہ ہونگے وہ آپ کی سطح تک نہ جھکیں گے۔

کسی کا کلام پڑھنا اور بات ہے سمجھنا اور چیز۔ اور اتنی مشکل چیز ہے کہ بعض ناقدین نے صاف کہدیا "شعر کہنے سے شعر سمجھنا دشوار ہے" اور بعض نے اعلان کر دیا کہ شیکسپیر کے سمجھنے کے لئے شیکسپیر ہی ہونا چاہئے۔

مگر مایوسی نہ ہونی چاہئے ابھی تک دوسرا شیکسپیر، دوسرا میر اور دوسرا سودا فطرت نے پیدا نہیں کیا۔ لیکن انکے سمجھنے والے پیدا ہوتے اور ہوتے رہیں گے۔

سودا کے مرثیوں کے متعلق آبحیات، تاریخ ادب اردو (سکسینہ) تاریخ ادبیات اردو (بیلی) شعر الہند اور دوسرے تذکرے یا تو سرے سے خاموش ہیں یا ایک دوسرے کے خیالات نقل کر دیتے ہیں اس بے پروائی کی وجہ میری سمجھ میں صرف اتنی ہی آتی ہے کہ انیس اور دبیر کے بے نظیر مرثیوں کے سامنے نہ تو پہلے کے مرثیہ گو نگاہ میں جچتے ہیں نہ بعد کے اور یہ سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر تذکرہ نویسوں نے صرف "روایات" سے کام چلایا ہے، مشاہدہ اور مطالعہ کی زحمت گوارا ہی نہیں کی ہے۔

سودا کے ہم عصر مرثیہ گویوں میں حیدری، سکندر، میر گدا، مسکین، افسردہ، امانی، عاصی، آل علی، درخشاں، مہر، قادر، گمان اور ندیم کا ذکر تو آگیا ہے مگر حالات نہ ہونے کے برابر ہیں اور جن کا تھوڑا کلام موجود ہے وہ ناکافی ہے کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی نہ

موازنہ کیا جاسکتا ہے، اس زمانے کی عزاداری مجلس ماتم اور جلوس کے متعلق بھی کوئی مواد موجود نہیں ہے کہ مدد مل سکے۔ ایسی حالت میں مجبوراً مطبوعہ مراثی کے مطالعہ اور قیاس سے کام چلے گا۔

یہ واقعہ ہے کہ کلام کے تمام پہلو جب تک مجموعی حیثیت سے نظر میں رہیں سچی تنقید مشکل ہے۔ مگر سمجھنے سمجھانے کے لئے تحلیل اور تقسیم کی ضرورت ہے حالانکہ دل دکھتا ہے گلاب کی پنکھڑیاں الگ الگ کر لیجئے اور موتی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو کیمیاوی تشریح ہو جائے گی مگر "وہ بات کہاں" ــــ

زبان

مرزا کی زبان مخصوص ہے تھوڑی سی خصوصیات اس وجہ سے ہیں کہ اردو منجھ رہی تھی صاف ہو رہی تھی ایسا آئینہ تھا جس پر آدھی قلعی ہو چکی تھی آدھی باقی تھی۔ ایسی کلی تھی جو آدھی کھل چکی تھی دکھنی الفاظ اور ترکیبیں شمالی محاورات اور جملوں سے بدل رہے تھے مرزا کو اردو پر عبور ہو یا نہ ہو مگر ان کے خزینۂ ذہن میں جتنے موتی موجود تھے وہ آج بھی جوہری کو دیوار حیرت بنا دیتے ہیں۔

مرزا کے پاس الفاظ بہت تھے اور ہر قسم کے تھے جب وہ فارسی آمیز اردو لکھتے تھے تو دو ہی چار لفظوں کے بدل دینے سے پوری نظم فارسی کی ہو سکتی تھی مگر جب انہوں نے ہندی دوہرے لکھے ہیں یا پنجابی اور پوربی زبان میں مرثیے لکھے ہیں تو عربی فارسی کے الفاظ مشکل سے آئے ہیں۔ میں نے حساب تو نہیں لگایا کہ شکسپیر کی طرح مرزا کو ساٹھ ہزار الفاظ معلوم تھے یا ریمزے میکڈانلڈ کی طرح ایک لاکھ لفظ مرزا عمر گی سے لکھ بول سکتے تھے مگر یہ طے ہے کہ شاید ہی مرزا کے کسی اور ہم عصر کو اتنے زیادہ الفاظ حلقہ بگوش غلام اور زر خرید خادموں کی طرح ملے ہوں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ پرگوئی کی وجہ سے مرزا اکثر جگہ ایسا کچھ لکھ گئے ہیں جس کو دوبارہ دیکھتے تو باقی نہ رکھتے۔ مگر وہ الفاظ کے برتنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے خصوصاً ہم معنی الفاظ میں باریک خصوصیات سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے۔ ایک جگہ میر کے مرثیے پر اعتراض کرنے کے سلسلے میں انہوں نے لفظ "لالی" پر نکتہ چینی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ لالی جب تک خون کی نہ ہو سرخی ہے۔ اسی طرح آوارہ کا مدعی ضروری قرار دیا ہے۔

میرا موضوع صرف مرثیوں کی شان دکھانا ہے لہذا میں اسناد و شواہد میں اپنی تلاش مرثیوں ہی تک محدود رکھوں گا

ہم اب زبان مرزا کی تھوڑی سی خصوصیات گنیں۔

۱۔ مرزا کی طبیعت میں جدت بہت تھی وہ کبھی کبھی الفاظ بھی گڑھ لیا کرتے تھے۔ اور ترکیبیں بھی انوکھی استعمال کر لیا کرتے تھے

مثلاً شہ ـــ محرم میں کھوٹے کرتے ہیں لیک		شہے۔ جتا وار کلا وا۔ اور ساہوری کے متعلق آپ فارسی

کاٹا ہوا وہ سر تھا جو ساچق کا خوانچہ تھا
گردن کا خطِ زخم تھا مشکے کا کلاوا
تھا خسرو خسرلوپہ کا خون اس میں جمایا
دولھا جو سلامی کے لئے سامنے ہی آیا
مینا تھا نشانِ حلق کو پان خوردہ دہن کا

اگھر کو ج - بختیوں' اور نگھوڑا' بھی اس قبیل سے ہیں -

ٹیکسپئر فیلن آصفیہ فیروزنور اللغات امیر اور دوسرے لغات چھان ڈالئے پتہ بھی نہیں چلتا یا تو اسی زمانے میں یہ الفاظ مٹ چکے تھے یا مرزا صاحب کی جدت ہے - بہر حال اس قسم کے الفاظ کم بھی ہیں اب محض سیاق اور قرینہ سے معنی لگائے جاتے ہیں - ہمارے استاد سید محمد حامد علی صاحب نے جتنے معنی بتائے ہیں ان سے بہتر شاید ہی پیدا کئے جا سکیں خسرلوپہ اور پان خوردہ دہن کی ترکیبیں شرح سے بے نیاز ہیں -

۲ - کہتی ہے کی جگہ کہے ہے' یا سنتی ہے کی جگہ سنے ہے - اس قسم کا صیغہ اس وقت رائج تھا اب صرف آنکھوں میں سرمہ کی طرح لگانے کو خال خال ملتا ہے - مثلاً :- کہے ہے ناز سے حور ابہشت ہی اکثر

۳ - قصیدہ گوئی میں مرزا اپنا جواب نہیں رکھتے تھے' قصیدیت کا رنگ انکے ہر صنفِ کلام میں کمال کے درجہ تک موجود ہے الفاظ کے توازن اور شکوہ سے وہ پورا پورا اثر ڈال لیتے ہیں اور روپے میں سولہ آنہ کا نفع اٹھا لیتے ہیں ملاحظہ فرمائیے -

تجھ پہ رورو جب کہے ابرِ سیہ پوش السلام　　　بولے اس کے ساتھ برقِ شعلہ بر دوش السلام

بادل کو کالے کپڑے پہنا کر اور بجلی کو شعلہ جوالہ بنا کر مرزا نے جو تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے وہ کتنی مکمل ہے -

۴ - براؤننگ کی شاعری کا امتیاز بھی ہے کہ وہ ایجاز و اختصار سے بہت کام لیتا ہے اور اکثر سریع المفہوم الفاظ حذف کرتا چلا جاتا ہے مرزا کے یہاں بھی اس قسم کے مستحسن محذوفات موجود ہیں - مثلاً

ہوا ہے سبعہ سیارہ تک یہی اب حکم　　　کہ فاطمہ کے قمر پہ کہو درود و سلام

تک کے لفظ سے ہمارے ذہن فوراً اول سرے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جب ابتدا کی تلاش ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکمِ باری سمک سے سما تک ہی اور ذرہ سے سیارہ تک - یا مثلاً

یہ جبرائیل کا مطلب ہے یعنی اے سودا　　　حسینِ تشنہ جگر پہ کہو درود و سلام

اگر مطلب سے حکم اور فرمائش کے معنی نہ لئے جائیں تو صاف مطلب یہی ہے کہ جبرائیل کی لائی ہوئی وحی کا یہی مطلب ہے - یا یہ کہ دشتِ کربلا میں جبرائیلِ امین کا حضرت کی خدمت میں آنے سے یہی مطلب ہے -

۵ - تعقیدات کثرت سے ہیں - مثلاً

امامِ برحق و مطلق پہ حق تعالیٰ کا　　　ہے امر شام و سحر پہ کہو درود و سلام

جس کی نثر یہ ہوئی کہ

حق تعالیٰ کا امر شام و سحر یہ ہے (کہ) امام برحق و مطلق پر درود اور سلام کہو۔

۶۔ تجھ کا استعمال تیرے کی جگہ — نہیں ہے بدر ہی تجھ در پہ کچھ جبیں فرسا

۷۔ فارسی کی جمع بغیر ترکیب کے — کہے ہے عرش کے رکّاں سے جبرائیل سدا

۸۔ تین کا استعمال کلمہ تخاطب کی طرح یعنی تم واحد اور جمع دونوں کے لئے مگر "تیں" مخاطب واحد حاضر کے لئے استعمال کرتے تھے اب امتدادِ زمانہ سے کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ ہم صرف تحقیر اور تذلیل کے اظہار میں "تیں" کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی نظم میں نہیں۔ سمجھ واں خاک کے ذرے سے بھی تیں کم سلام اپنا۔

۹۔ بعض جگہ الفاظ اور معانی میں اتنے دور کا رشتہ ہوتا ہے کہ ہر لفظ بامعنی مگر پورا شعر نزاکتِ بیان کی وجہ سے بارِ معانی سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہے۔ مثلاً

ضبط کرنے پر تجھے روئیں گے سو دا ہر گھڑی　　دیتی ہے شاہِ شہیداں کی قسم یہ چاندرات

ذرا انصاف سے بتایئے تجھے کی ضمیر کس کی طرف پھرتی ہے سمجھ کر جواب دیجئے ورنہ دامِ شعر میں گرفتار ہو جایئے گا پھر چاندرات کونسی قسم دیتی ہے کیوں قسم دیتی ہے اور کیا قسم دیتی ہے؟

یا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

رکھیں ہیں بات سے تیری یہ آرزو ملکوت　　کہ سرنگوں ہو کریں سب کے اس سے جام سلام

اگر یہ مان لیجئے کہ "بات" کتابت کی غلطی یا تحریف یا اصلاح ہے تو "بات" یا "خاک" سے بدل کر پڑھ لیجئے مگر قبلہ یہ تو بتلایئے کہ "جام" کی تخصیص کیوں ہے؟ اور ملکوت کو شاہدِ زرّین "جام" کیوں دے؟ یہ اہم نکتہ یہاں کیوں صرف ہو؟ —— پورے شعر کے کیا معنی ہیں؟

۱۰۔ نے کا حذف۔ جس کے بدر کو لکھک بھی کہا نبی —— یعنی جس کے پدر کو نبی اسنے "لکھک" بھی کہا۔

۱۱۔ آوے۔ جاوے۔ ہووے۔ یہ سب ابھی ماضی قریب تک مستعمل رہے ہیں اب صرف ہمزہ سے کام چل جاتا ہے واؤ کی ضرورت نہیں پڑتی — ماں جس کی ہووے حضرتِ خاتونِ کبریا —— مگر معلوم نہیں کس مصلحت سے جناب سیدہ کو مرزا صاحب نے "خاتونِ کبریا" کہا ہے۔ اور اس کے کیا مفہوم اُن کے ذہن میں تھے "شیرِ خدا" اور "رسولِ کبریا" کی ترکیب تو سمجھ میں آتی ہے مگر خاتون کی کبریا سے کیا نسبت ہے۔ اکثر جگہ مرزا بھی "مرتبہ در نظر" نہیں رکھ سکتے۔

۱۲۔ سلام کرنے کے لئے کورنش کا استعمال پھر کورنش میں واؤ کا اعلان غائب

جہاں ہے بید اس کے جھکنے میں کورنش کا عالم ہے

۱۳۔ مصدر کا عجیب و غریب استعمال یا مشتقات کا انوکھا صرف

چالیس دن میں آپ کو واں پہنچپنا کیا

یا نقارہ دے رواں ہوئے کربل سے نابکار یا سر دولھا کا تس پہ دھنگانا جیورا کھو دکھلائی ہے۔

۱۴۔ مختلف آوازوں کے لئے مرزا کو فوراً مناسب الفاظ مل جاتے تھے سینہ زنی کی آواز کے متعلق لکھتے ہیں۔

کہ ریتے تھی زمیں ہر آن سینوں کی دھما دم سے

کیا اس میں جھنا چاق تیغش کا لطف نہیں ہے ؟

۱۵۔ مصدر کی تانیثی جمع ۔ مدینے آئیاں جیتا لائیاں۔ ایک پورا مرثیہ اس ترکیب میں ہے۔

۱۶۔ بعض الفاظ کا استعمال جو آج بالکل مختلف معنوں میں یا مختلف شکلوں میں مستعمل ہیں۔ مثلاً

غارت و قتل نہ یاں کچھ سبب نالش ہے　　نالہ و فریاد

یا سے　　جگ بیچ بھسمنت ہو اس گردش افلاک کا طور　　بھسم ہو

۱۷۔ ہندی الفاظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں مثلاً۔ ڈور انسلی جیا وا کلاوا یرن سروا مدن سنگت مت انگار اگن کل انجھواں پون کٹھن پیرا بھاگ اوگن لوتھ وغیرہ

اگر نازک فروق دکھائے جائیں تو شاید ۱۶ کی تعداد دو سو سولہ تک پہنچ جائے گی بہر طور تین باتوں سے انکار نہیں ہو سکتا:۔

۱۔ سودا نے بڑی حد تک زبان صاف کی۔ اگرچہ بعض الفاظ ایسے ایجاد کئے جو زیر قلیب ہو کر زمانے کے ہاتھوں مٹ گئے۔

۲۔ مرزا کا ذخیرہ بہت وافر تھا جن میں پھول اور کانٹے جواہر اور سنگریزے سبھی کچھ تھے۔

۳۔ مرزا لفظوں کے وزن خصوصیات ترنم اور محل صرف سے واقف تھے مگر بعض جگہ ہمہ دانی کے زعم نے اور پُرگوئی کی مشق نے دھوکا دے دیا ہے۔

مرثیہ کی مختلف شکلیں

سودا سے پہلے کے مرثیے عموماً غزلوں کے پیرہن میں ملبوس نظر آتے ہیں وہی دامان وہی گریبان وہی ردیف وہی قافیہ بحری سے پہلے تک تو غزل کی طرح اس نام نہاد مرثیے کا ہر شعر مکمل اور بے نیاز تسلسل ہوتا تھا بعد کو کچھ لوگوں نے فقط اور مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں اور کچھ نے دو بیتی سے چار بیتی یا مربع کر دیا ہے (وقار عظیم بی اے کی تحقیق)

سودانے دوبیتی بھی کہی ہے مربع بھی مثلث بھی مخمس بھی اور مسدس بھی لطف یہ کہ سب کا مستزاد بھی اس طرح دس شکلوں میں سودا کے مرثیے موجود ہیں اور ترکیب بند و ترجیع بند کو دو جداگانہ چیزیں سمجھئے تو بارہ شکلیں ہوتیں پھر دوہرا بند او دوازدہ مصرعہ کو الگ الگ قسمیں مانئے تو شمار معصومین کی طرح چودہ صورتیں ہوگئیں۔

سید محمد ضامن علی صاحب صدر شعبۂ اردو (الہ آباد یونیورسٹی) بڑی متانت اور خموشی سے ادب اردو پر احسان کر رہے ہیں ان کے بیان میں لفاظی نہیں ہوتی نہ دور از کار باتیں ہوتی ہیں، ابھی ہمارے کان ان کی نکتہ رس طبیعت کی ضداد و رسائی کا لطف لے ہی رہے تھے اور ہم قصاید کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگے تھے یعنی ان میں اصلاح اخلاق کے عناصر کی برقی رو اپنا پوشیدہ کام کر رہی ہے کہ موصوف نے سودا کے مرثیوں پر ایک مختصر مگر جامع اور ساطع تقریر فرمائی ایجازی اشارات میں جادو تھا ایک بات تو ایسی عمدہ نکالی ہے کہ اگر آپ اس کی روشنی میں سودا کے مرثیوں کا مطالعہ کریں تو بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور نیا لطف آتا ہے۔

موصوف نے جو کچھ فرمایا وہ الفاظ تو مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں ہیں مگر مطلب یہ تھا کہ سودا نے ضرورتا اور مواقع کے اعتبارات مرثیے کی مختلف شکلیں اختیار کی ہیں کچھ پیشخوانی کے لئے کچھ سوز کے واسطے کچھ ممبر پر تحت کے انداز میں پڑھنے کے واسطے کچھ نوحے ہیں کچھ روضہ خوانی کے لئے ماتمی دستوں کے واسطے ہیں اور کچھ دہاڑ رونے کے طور پر ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہیں جو خطابت اور نقیبانہ انداز سے پڑھے جاتے رہے ہوں گے ظاہر ہے کہ سودا کے زمانے کی رسوم عزاداری کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، ایسی صورت میں محض آج کل کے طریقوں اور خود کلام کے دروبست سے اتنا مفید نتیجہ نکال لینا بے نیاز ستائش ہے۔

اب میں بعض مواقع کی تصویر آپ کو سودا کے مرثیوں میں دکھانا چاہتا ہوں تاکہ موصوف کے دعوے آسانی سے سمجھ میں آجائیں، ذرا تصور اور تخیل سے آپ کو بھی کام لینا ہوگا ورنہ یہ روح فرسا مرقعے افراط نور کی بدولت غیر مرئی ہو جائیں گے جلوے بیتاب ہیں کلیم کی نظر پیدا کیجئے۔ مگر دیکھئے حریص ہوش پر برق حسن گرتے نہ پائے بیہوش ہوگئے تو کیا لطف ہو مزہ تو جب ہے کہ آپ بھی یہی کہیں کہ اگر تمام پردے ہٹ جائیں تو بھی میرے نظارہ میں بال بھر فرق نہ ہو۔

مجلس عزا برپا ہے مرثیہ خوان منبر پر بیٹھا ہوا ہے اور مرثیہ شروع کرنے سے پہلے ہدیۂ سلام اور تحفۂ عقیدت پیش کرتا ہے، غرض یہ ہے کہ لوگ گوہر خلوص سے جیب و دامن بھر کر داد عزا دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

ادب سے بھیجے ہے تجھ پر ترا غلام سلام — قبول ہو تری خدمت میں یا امام سلام

یہاں یہ بات بھی عرض کر دینے کے قابل ہے کہ اکثر ناقدین صرف یہ کہکر اپنا دامن چھڑا لینا چاہتے ہیں کہ ضمیر سے پہلے تک کی مرثیہ

گویٔ صرف رونے رلانے کے لئے تھی' اس عام غلط فہمی کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ یہ حضرات اصل کلام کا مطالعہ ایک سرے سے فرماتے ہی نہیں اور سنی سنائی باتوں پر دھیان رکھتے ہیں۔

سودا کے سلاموں میں بھی (دوبیتی اور چارمصرعی سلام) اکثر ایسے شعار ہیں جن کا تعلق صرف ممدوح کی تعریف سے ہے' جہاں امام حسین یا انکے اسلاف واخلاف یا انصار واعزہ کی جلالت اور عظمت کے مرقعے کھینچے گئے ہیں' سودا نے یہ امر محسوس کر لیا تھا کہ جب تک رجائی اور قنوطی احساسات میں توازن پیدا نہ کیا جائے خالص بہجت یا خالص غم کامیاب نہیں ہو سکتا خلاف فطرت ہو جائے گا آج کے سلام اگر کچھ مختلف ہیں تو اس شان میں کہ موجودہ سلاموں میں رنگ تغزل بھی ہے بہاریہ بھی' اخلاق اور فطرت کی موشگافیاں بھی ہیں' بے ثباتی عالم عبرت انگیزی حیات تحریک توشۂ آخرت کے پہلو بھی ہیں اور ممدوح کی تعریف بھی ہیں کے شعر بھی ہیں۔ سودا سے پہلے سلام یا دوبیتی مرثیے صرف غم انگیز مضامین کے لئے وقف تھے سودا نے اپنی افتاد طبیعت سے بتاثیر جدت سے' مدح وثنا کی نئی راہ بھی نکال لی ہے اور اس کو صنائع کے ساتھ صرف کیا ہے'
شگفتگی اور رنگینی پیدا کی ہے' جی تو یہی چاہتا ہے کہ ہر بات کی مثال الگ الگ پیش کروں مگر طوالت کا خیال قلم گیر ہے خیر چند مثالیں سُن لیجئے۔

تو وہ امام ہے جس پر کہ رُوح نبیوں کی — درود بھیجے ہے دن رات صبح و شام سلام

میر تقی کے اس مصرعہ پر ----- اے نبی کے باطنا رتبہ کے والی السلام پر مرزا صاحب بہت خفا ہوئے ہیں مگر خود حریم مدح میں پہنچ کر ہوش باقی نہیں رہا۔

عبودیت ہے تری فخر ایک عالم کو	ترے غلام کو فغفور چین کرے ہے سلام	صنعت تضاد
یہ موج آب ہی پیاسی ہے بندگی کی ترے	حباب بھی بدم واپسیں کرے ہے سلام	رعایات لفظی اور صنعت تعلیل
طوطی و غنچہ پہ گلشن کے نہیں موقوف کچھ	بوئے تجھ کو دیکھ ہر گویا و خاموش السلام	لف و نشر مرتب
کچھ نہ تنہا دیکھ کر تجھ کو طواف کعبہ میں	بولتا ہے زاہد سجادہ بر دوش السلام	قطعہ
یاد کر تیرا جمال اے ساقی کوثر کے پور	میکدے میں کہتے ہیں مست و مدہوش السلام	

غرض اس عنوان کی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ایک سلام ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ 'ہر سحر پہنچا دے اے صبا میرا سلام'۔ اس میں مرزا نے یہ التزام رکھا ہے کہ جناب ختمی مآب سے لیکر قائم آل عبا تک ۱۴ اشعار میں سلام بھیجا ہے۔ کیا عجب ہے کہ ختم مجلس کے بعد اس زمانے میں بھی مسلسل سلام بھیجے جاتے رہتے ہوں جیسا آج کل بعض جگہ انتشار مجلس کے قبل قطعہ پڑھا جاتا ہے۔ کہیں تو فصیح مرحوم کا مشہور قطعہ پڑھتے

ہیں۔ یا آلہی کریں امام ظہور۔ اور کہیں تحسہ یک فاتحہ خوانی کے لئے' فارسی کا ایک قطعہ۔ بروح پنجتن پاک صاحب کونین پڑھا جاتا ہے
میں نے سلام کے تحت میں مفردہ یا منفردہ مرثیے شامل نہیں کئے' اس کی وجہ یہ ہے کہ حبیب نصرت مرزا کی جدت تھی
سلام کے لئے لازم تھا کہ اس میں یا تو سلام یا السلام کی ردیف ہو۔ یا سلام کا لفظ کہیں نہ کہیں آ جائے جیسا خود مرزا نے میر صاحب
پر عتراض کرتے ہوئے فرمایا ہے' ؎ کہ نہیں السلام کویاں ٹھور۔

مفردہ مرثیوں میں سودا نے اپنی قصیدہ گوئی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ جس مرثیہ کے کچھ شعر میں ذیل میں نقل کرنا چاہتا ہوں اسکی بحر اسکے الفاظ کا مداور روانی' اس کی ترتیب کی شان یہی بتاتی ہے کہ مرثیہ نما قصیدہ ہے اور یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پڑھنے میں یا تو سوز کا انداز ہوگا یا کم سے کم لحن کا دخل ضرور ہوگا۔

دیکھئے مرثیے کا مطلع بالکل تشبیب کے انداز سے شروع ہوتا ہے۔

جس کو دیکھو زیر فلک سو غم ست آج نمدر ہے	اب بجز صورت نظر پڑی ہی خاک کی ڈھیری سر پہ ہے
آہ و فغاں سے بھری ہوئی ہے نگر نگر کی گلی گلی	جوں کوچہ زنجیر کا ہوئے یوں شیون اب گھر گھر ہے

اب گریز ملاحظہ فرمایئے۔

ایسا کوئی اور نہیں ہے جس کی مصیبت سے یوں ہو	مگر وہ جس کا باپ علی ہے فاطمہ جس کی مادر ہے

اس کے بعد مدح کا جو حصہ ہوتا ہے اس کی جگہ مرزا نے واقعات لکھے ہیں اور مرثیہ نگاری کا یہ کمال دکھایا ہے کہ آمد پیاس کی شدت اقربا کی شہادت خیمۂ اطہر کی لوٹ اور لٹے ہوئے قافلہ کا شام جانا سب کچھ مسلسل انداز سے بیان کر دیا ہے یہی تسلسل و تاثیر کی جان ہے۔

سودا نے اکثر مرثیوں میں تشبیب اور گریز سے کام لیا ہے۔ اور آپ خود ملاحظہ فرمالیں گے کہ ان کی تشبیہیں دو ایک موضوع تک محدود نہیں ہیں کہیں بہار و خزاں سے ہم آغوش ہیں کہیں بے ثباتی دنیا ہے۔ کہیں برسات کا منظر دکھایا گیا ہے' یہی چیز آگے چل کر ضمیر کے یہاں منتقل ہوئی چہرہ کہلائی اور انیس و دبیر کے مرثیوں میں چہرے کی وسعت زور اور عمر کی اتنی بڑی کہ ادبی شان پیدا ہو گئی' یہ صنعت استہلال کا صرف پہلے بندوں ہونے لگا اور چہرہ رکن مرثیہ ہو گیا حالانکہ بعد کو بھی بعض بعض مرثیے ایسے ملیں گے جن میں خطابیہ قصیدہ کی طرح فوراً ہی اصل مقصد سے ابتدا کی جاتی ہے مگر ایسے مرثیے اب بہت کم ہیں اور بہت کم کہے جاتے ہیں۔

مفردہ مرثیے کی ایک مثال اور ملاحظہ فرمایئے۔

اے امامِ زمان واویلا　　سیّدِ دوجہاں واویلا

رن میں بے سر پڑا ہی تیرا تن　　شاہِ کون و مکان واویلا

صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ کا ماتم ہو رہا ہے اور سینہ زنی سے فضا میں تلاطم ہے ایک شخص بیچ میں کھڑا ہوا یا یا ایک جماعت ایک طرف کھڑی ہوئی پہلا مصرعہ پڑھتی ہے دوسری جماعت جواباً دوسرا مصرعہ پڑھتی ہے اور ماتم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں ایک تصویر اور دیکھ لیجئے۔ ماں اپنے ششماہے کو یاد کرکے بین کر رہی ہے۔

کیا ہی تو داغ دے گیا دل میں　　ہائے مادر کی جان واویلا

نہیں چادر بھی مجھ کو جس سے　　پوچھوں تیرا دہان واویلا

گویا ہنسلیوں والا منہ سے خون اور دودھ اگل رہا ہے۔

پالنا خالی ہی جھلاؤں تجھے　　کرکے اس میں گمان واویلا

ایک مربع سلام ملاحظہ فرمایئے اور اس بند میں مرزا کی نکتہ اغراق صرفِ استعارہ لطفِ کلام اور لطافتِ بیان کا مزہ لیجئے۔

جہاں ہے بید اس کے جھکنے میں کورنش کا عالم ہے　　جو پھل ہے شاخ کا سر اس کا داں سجدے میں ہر دم ہے

جدھر دیکھو گے ٹہنی گل کی وہ تسلیم میں خم ہے　　کیا باغِ جہاں نے اس کو کس موسم سلام اپنا

مرثیے کے پہلے سلام تبرکاً پڑھے جاتے تھے، مرثیہ خواں اسے شاگردوں یا لڑکوں سے پڑھوا دیتے تھے اس کا ثبوت اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ خود مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

یہ سودا عرض عجز و نیاز کرتا ہے　　شروع مرثیہ ہونے کو اب تمام سلام

مرثیۂ مفردہ کی شان آپ دیکھ چکے ہیں ذرا اس کا مستزاد دیکھئے۔

بانو یوں کہتی ہیں سر در کیا ہوا　　ہے ہے اصغر لاڈلا

ڈھونڈھنے جاؤں میں کیدھر کیا ہوا　　ہے ہے اصغر لاڈلا

اب تو کوئی شک نہیں کہ محمد ضامن علی صاحب کا نظریہ بالکل درست ہے۔ اس مستزاد میں بالکل وہی شان ہے جو آج سے پندرہ بیس برس پہلے نوحوں کی شان ہوتی تھی اب بھی بوڑھی عورتیں اس قسم کے نوحے پڑھتی ہیں اور ماتم کرتی ہیں ممکن ہے اس زمانے میں بھی نسوانی طبقات میں نوحہ کی یہ طرز مقبولِ عام رہی ہو۔

مگر اس مرثیہ میں بھی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جیسے اُہے ہے اصغر لاڈلا کا ٹکڑا مستقل ہے اور ہر دوسرے مصرعے کے بعد دہرایا جاتا ہے ویسے ہی "داوریغا وا دریغ" کا ٹکڑا بھی ہر پہلے مصرعے کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

اب اس کے بعد ہم سودا کا ایک مربع مرثیہ لیتے ہیں۔ مربع کی شان یہ ہوتی تھی کہ پہلے چار مصرعوں میں قوافی کی پابندی ہوتی تھی اور بعد کے بندوں میں تین مصرعوں کے قوافی و ردیف۔ دوسرے مگر چوتھے مصرعہ کا ردیف اور قافیہ مطلع والے ہوتے تھے، بعد کے مراثی میں بیت کو چھوڑ کر ہر چار مصرعہ کو آپ چومصرعی مرثیے کا مطلع سمجھ سکتے ہیں اور رباعی کو (خاص بحر سے قطع نظر) چومصرعی مرثیے کے بند کہہ سکتے ہیں۔

مجھے بڑی حیرانی ہے کہ مرزا کے مرثیوں میں لوگ تسلسل تلاش کرتے ہیں اور ان کو نظر نہیں آتا، زیادہ حیرت تو جب ہوتی ہے کہ ذمہ دار صحاب اور باہوش ناقدین بھی یہی کہہ کر اپنے فرض کر دیتے ہیں کہ ہر بند اپنی جگہ مستقل اور جدا ہوتا ہے تسلسل اور ربط نہیں ہے۔ اگر آپ ربط و تسلسل کا کوئی خاص معیار اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو مجبوری ہے ورنہ سودا کا کوئی مرثیہ ایسا نہیں جو واقعات کے لحاظ سے مسلسل نہ ہو۔

جہاں کہیں جتنے واقعات بیان کئے ہیں سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں اور ذہن انسانی بلا تکلف ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتا جاتا ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ہر مرثیہ میں بیان کا ربط ذہنی تسلسل اور نفسیاتی ترتیب شامل ہے لہذا خود مراثی کا مطالعہ زیادہ مفید ہوگا بہر طور ایک چومصرعی مرثیے کو نمونتاً پیش کرتا ہوں جس سے ربط و تسلسل کے علاوہ عالیجناب مولوی محمد ضامن علی صاحب کے اس دوسرے نظریے کا ثبوت بھی ہو جائے گا کہ سودا کے یہاں قریب قریب وہ تمام جزائیہ موجود تھے جنھوں نے آگے بڑھ کر ضمیر انیس اور دبیر یا دیگر متاخرین کے کلام میں خاص مرتبہ اور خاص مقام حاصل کر لیا۔

مربع مرثیے کی مثال سے پہلے اگر مثلث اور مستزاد مثلث کی ایک ایک مثال دے دوں تو غالباً ترتیب کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہو۔ دیکھئے مثلث مرثیہ ہے۔

بنت نبی کے پیارے لال ہائے حسینا وائے حسین　　　کہاں پڑے ہو آج نڈھال ہائے حسینا وائے حسین

ٹک دیکھو عترت کا حال ہائے حسینا وائے حسین

سارے مرثیے میں ہائے حسینا وائے حسین ردیف ہے اور لال۔ نڈھال وغیرہ قافیہ۔ اور بندوں کے اول دو مصرعے ہم قافیہ ہیں اور زیادہ تر ترجیع کی صنعت رکھی گئی ہے۔ مثلاً

سر سے تا پاؤں مجروح پڑا ہوا ہے لو مذبوح　　　پیاسی گئی بدن سے روح شام تلک ہے پر زصبوح

دھوپ سے ہے تجھ تن یہ زوال

ان بندوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عشرہ کے دن جلوس اور تعزیوں کے ساتھ پڑھتے ہوئے اور ماتم کرتے ہوئے چلتے تھے۔ غالباً ہائے حسینا وائے حسین جواب ماتم ہوتا تھا اور پہلے کے تین ٹکڑے سر دستہ دو تین آدمیوں کے ساتھ پڑھتا تھا۔ تاکہ سب کو دم لینے کی بھی فرصت ہو اثر بھی قائم رہے اور ماتم کا سلسلہ بھی جاری رہے۔

مثلثِ مستزاد کی ترکیب دیکھئے۔

ماں صغرا کی کہتی ہے رو رو بچے کے سو جانے کو
تھپک تھپک سب ہیں لوری دو ہوں ہیں چونکانے کو
ہے ہے اصغر میرے لال

بعض جگہ اب تک شبِ عاشورہ یعنی نویں محرم کا دن گذر کر جو شب آتی ہے اس میں عزادار شب بھر جاگتے ہیں اور ماتم داری کرتے ہیں ذوالجناح نکالتے ہیں بڑے علم کا گشت ہوتا اور ننھے شہید علی اصغر کا جھولا نکالا جاتا ہے غالباً یہ مرثیہ جھولا نکالنے کے وقت کا ہے۔ اس میں سودا نے دکھیا ماں کے جذبات اسی کی زبان سے ادا کئے ہیں اور کیا عجب ہے کہ سر دستہ دو مصرعے پڑھتا ہو پھر پوری جماعت "ہے ہے اصغر میرے لال" دہراتی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زنانے ماتم میں یہ مرثیہ خاص طور پر مقبول رہا ہو۔

ہاں اب ایک مسلسل اور مربوط چو مصرعی مرثیے کے کچھ بند ملاحظہ فرمایئے۔ سقائے سکینہ یا روئے امام کے حال کا مرثیہ ہے۔ لہٰذا صنعت استہلال سے کام لے کر تشبیبی چہرہ برسات سے شروع کیا ہے۔ اِدھر تو پانی کی کثرت اور اُدھر ساقی کوثر کے بچوں کا ایک بوند پانی کو ترسنا ایسا پاکیزہ موازنہ ہے کہ ہم تمام مصائب سننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور کولرج کے دو مصرعوں کا لطف آنے لگتا ہے۔

Water water every where,
But not a drop to drink.

یہی تشبیب آگے بڑھ کر چہرہ ہوتی ہے اور مرثیے میں اس پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔

فلک نے کربلا میں ابر جب دم ظلم کا چھایا
کمانِ جور کو قوسِ قزح کی طرح چڑھوایا
سوا پیکاں کے اک قطرہ نہ اس ظالم نے برسایا
کہوں کیا تیرِ باراں سے نبی کے گھر کو ڈبوایا

دیکھئے کثرتِ آب کے متعلق کہتے ہیں کہ۔ بھرے ہیں جل تھل او سپانی جہاں دیکھو وہاں جاری۔
مگر ——— جگر گوشے کو پیغمبر کے پیاسا ذبح کروایا۔

اس موسم کی ایک اور تصویر ملاحظہ فرمایئے۔

یہ موسم وہ ہے جس میں ہر کوئی چھپر چھواتا ہے
پکھیرو تنکے چُن چُن گھونسلا اپنا بناتا ہے
کوئی اس وقت چیونٹی سے بھی ظالم گھر چھڑاتا ہے
پڑا ہے سرد دیں واں جہاں نے سر چھپایا

اب یہ دکھایا ہے کہ جب آلِ عبا پر پانی بند ہوا تو

حرم کی تشنگی کی دیکھ کر عباس طغیانی — مسلح ہو کے پانی کے لئے مشکیزہ منگوایا

اب اس کے بعد مکمل سین رخصت کا موجود ہے، مختصر مگر جامع۔ بڑی رخصتیں بھی سودا نے لکھی ہیں مثلاً وہ مرثیہ جس میں جنابِ شہربانو امام حسین کو یعنی اپنے شوہر کو روک رہی ہیں۔ اور جس کا مطلع یہ ہے

بانو کہتی تھیں کہ ان کا قصد مت کر سائیاں — مر چکے تیرے کہ تو سب خویش و برادر سائیاں

دونوں مرثیے مربع ہیں مگر فرق ظاہر ہے اوّل تحت لفظ کے لئے موزون ہے اور دُوسرا سوز اور ماتم کے لئے، جس طرح ڈراما کا بہت کچھ لطف سین سینری اور کردار کے لباس و گفتار و رفتار کا تشنہ ہے ویسے ہی مرثیے کے سمجھنے میں موقع کا خیال رکھنا بہت ضروری اور قابلِ سہولت ہے۔

ہاں اب بھائی سے رخصت ہونے کی تصویر دیکھئے۔

——— — کبھو جوں ابر باہم منہ پہ منہ رکھ اشکباری تھی

کبھو مانندِ برق آپس میں ان کو بیقراری تھی — ———

اس کے بعد آمد کا نقشہ دیکھئے اور آغازِ جنگ ملاحظہ فرمائیے۔

چلا عباس جب قربوس زین پر مشک کو دھر کر — تو لائے رُو بمیداں کا فر اس کے قصد پر اکثر

رکھا جن نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر — جہنم کو اُسے دو دستِ اجل کے ہاتھ بھجوایا

اس کے بعد اتمامِ حجت فرماتے ہیں جو بہت کچھ رجز کے طریقے پر ہے۔ اگرچہ بعد کو مرثیہ نگاروں نے رجز کو ایک خاص اہمیت دے کر عربی رجز کے انداز سے پُرشکوہ الفاظ میں اسلاف کی تعریف اور اپنی شجاعت کا بیان دکھایا ہے مگر یہ بھانا بھی رجز ہی شان رکھتا ہے۔ دیکھئے کیا سمجھا رہے ہیں۔

کہا اتمامِ حجت کیلئے عباس نے اُس دم — سنو میرا سخن اے بدترینِ خلقتِ آدم

جو اس پانی کو تم دو گے تو کیا دریا ہی ہو گا کم — دو اب اپنے کو جس پانی سے تم نے سیر کروایا

جب اس موعظے کا کچھ اثر نہ ہوا تو

نچایا جب تو بیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم — لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم

جدھر کو رُخ کیا کشتوں کے پشتے واں ہوئے اُس دم — اودھر خوں کے بہے نالے جدھر اس کا پڑا سایا

گھمسان کی حالت دکھائی ہے۔

کہوں کیا جس طرح چھایا تھا ابرِ آہن اس جا پہ سناں پر تیغ برسے تھی پڑی او تیغ پر خنجر

بعد اس کے آپ کے دونوں ہاتھ کٹ جاتے ہیں اور آپ زمین پر تشریف لاتے ہیں تو کیفیت یہ ہے کہ گرتے جاتے ہیں اور بڑے بھائی کو پکارتے جاتے ہیں ۔

سبب زخموں کے حالت اپ جب طاری ہوئی غش کی ندا گرتے ہوئے کی یا اخا اور کئی اور کئی

اس کے بعد امام حسین کا لاش پر جانا اور بیم کو چور چور پانا دکھایا ہے مگر برسات کا تلازمہ کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا مثلاً امام حسین بھائی کی لاش پر کس طرح پہنچے ہیں ؟

بسانِ ابر گریاں آپ کو اُس پاس پہنچایا

یہاں تک کہ مقطع میں بھی فرماتے ہیں ۔

خمش سودا وگرنہ یاں بہائے جائیں گے نالے ہوئے ہیں اولتی مژگانِ خلق اور چشم پرنالے
جہاں کو دیکھنے آئے جہاں کے دیکھنے والے فلک نے لیکن ایسا مینہ نہ دیکھا ہے نہ دکھلایا

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ موجودہ مکمل مرثیے کے تقریباً تمام عناصر جزئیہ کی حالت میں اس مربع کے اندر موجود ہیں یا نہیں ؟

جی تو یہی چاہتا تھا کہ سودا کی مرقع نگاری اور جذبات کی تصویر کشی پر مفصل طور پر لکھوں مگر مضمون بڑھتا ہی جاتا ہے اس لئے مختصراً لکھتا ہوں ۔

دیکھئے خیمہ کی لوٹ اور مخدرات کے سر سے چادر سکینہ کے کانوں سے گوہر چھن جانے کے بعد کی عریانیوں کا مرقع ایک مصرعے میں ملاحظہ فرمائیے ۔

لٹنے سے بچا وہ کچھ کہئے جسے عریانی

یا ابنِ سعد کی خباثت اور حیلہ تراشی اس کی سیرت اور اخلاق کی کیسی تصویر کھینچی ہے ۔ وہ اپنے درباریوں سے کہتا ہے ۔

لا کر مجھے حسین سے غاصب کا سر دیا

ایک محبِ اہلِ بیت کو سودا سے شکایت ہے کہ یزید کے منہ سے بھی غاصب کا لفظ امام حسین کے لئے اچھا نہیں معلوم ہوتا میری نگاہ میں سودا کی یہی ادبی کامیابی ہے کہ دوستانِ اہلِ بیت کے دل میں یہ مصرعہ سن کر اسی قسم کے جذبات موجزن ہو جائیں ۔ یہی کیفیت اس جگہ بھی ہے جہاں امام زین العابدین کسی سوال کے جواب میں فرماتے ہیں ۔ میں بھی امام اور میرا باپ بھی امام ۔ اس طرح کے فقرے میں میرے ایک نادان دوست کو ابتذال نظر آیا ہے مگر مجھے کوئی پہلو مبتذل معلوم نہیں ہوا ۔

وہ واقعی امام ابن امام تھے اور اس دربار میں جہاں تمام باتیں چھپائی جارہی تھیں حسب ونسب پر بھی پردہ ڈالا جارہا تھا۔ اگر سید سجاد کی زبان سے سودا نے ایک حقیقت کا اظہار کرادیا تو کیا گناہ ہوا۔

ہاں میں سودا کی منظر نگاری دکھا رہا تھا۔ دیکھئے گرمی کا سین دیکھئے فطرت سے کس قدر قریب ہے!

جو چارپایہ ہے جنگل میں ہے ہپاتا ہے　　پکھیرو پاتوں میں روکھوں کے منہ چھپاتا ہے

یا

مثال آگ کے تپتا ہے کوہ اور ہامون　　زیادہ آنچ سے ہے گرم ان دنوں کی لوں
سوار گھوڑوں پہ یا چند کس دل محزون　　چلا وہ جاتا ہے منہ پونچھتا پسینے سے

اب خود ملاحظہ فرمایئے کہ نفسیاتی سلسلہ مرکزی کا مرقع اس سے بہتر نہیں کھینچا جاسکتا نہ خیالات متعلقہ کی کیفیت اس سے بہتر انداز سے بتائی جاسکتی ہے۔

کبھو تو مانگے تھا پانی کسو سے وہ معصوم　　کبھو تو چاٹے تھا ہونٹ اپنی پیاس سے مغموم
کبھو کہے تھا کہ اے وائے قسمت محروم　　پیالہ پانی کا اب مجھ کو جام ہے جم کا

جام جم واقعی آئینۂ عالم رہا ہو یا نہیں اس کا حال تو حکمائے پہلوی سے پوچھئے یا جمشید سے مگر سودا نے جس جام جم سے ہمیں متعارف کیا ہے وہ حقیقتاً امارت سلسلۂ خیال اور آئینۂ غم ہے کیا عجب ہے کہ سید سجاد کو صرف جام آب دیکھ کر تمام دردناک سلسلے ایک ایک کرکے یاد آجاتے ہوں۔

سودا نے باکمال مصوروں کی طرح تصویروں کو مقامی رنگ دیا ہے اور عرب ہستیوں کی رفتار گفتار لباس و آداب سب کچھ ہندوستانی شرفا کا سا دکھایا ہے۔ یہ چیز ادبی بدعت ہے یا نہیں مرثیے کے لئے موزوں ہے یا نہیں اس کی بحث ذرا تلخ سی ہوگی مگر میں صاف لفظوں میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ صدق شعری صدق مادی سے جدا ہے ناقد کا صرف اتنا ہی فرض ہے کہ وہ شاعر کی خلق کردہ دنیا اور شاعر کے خلق کردہ کردار کو دیکھے حدیں معین کرے اور اُن حدوں میں جانچے۔ شاعر تو پھر بھی بہت بلند مرتبت ہے خود ہمارے اور آپ کے استعمال میں صدہا ترکیبیں اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جنکے پورے معنی مفہوم میں آ ہی نہیں سکتے اس کی بحث زیادہ تر فلسفیانہ ہو جائے گی یا مذہبی پہلو آجائے گا۔ اس لئے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اردو مرثیوں کی تکمیل مقصد کے لئے ضروری تھا کہ ہمارے سامنے جو کردار پیش ہوں خواہ وہ کہیں کے ہوں وہ ہم سے بہت زیادہ مشابہ ہوں تاکہ ہم کو ان سے ایک قسم کی یگانگت پیدا ہو اور ہم ان کے رنج و راحت میں بلا تکلف شریک رہ سکیں۔

یہ سچ ہے کہ حضرت قاسم کے حال میں سودا نے جتنے مرثیے لکھے ہیں سب کے سب ضعیف روایات پر مبنی ہیں۔ یا ایک جگہ زید اور جناب سجاد کی گفتگو کشتی کے بارے میں ہے وہ بھی ضعیف ہے۔ نصرانی والی روایت بھی کچھ ایسی ہی سی ہے مگر ہم کو مرثیہ میں علم رجال علم حدیث اور فقہ سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے البتہ اگر کچھ کمزوریاں نظر آئیں تو سودا کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے۔

ہمارے ایک کرم فرما نے "ہندوستانی" جولائی ۳۳ء میں سودا کے مرثیوں پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں سودا کے ان الفاظ کی تشریح یا توجیہہ کی ہے "پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے" مضمون نگار صاحب نے کئی صفحے اس امر کیلئے وقف کرد ئے ہیں کہ سودا کی مراد مرتبہ در نظر سے یہ تھی کہ مختلف کردار کے فروق مراتب نگاہ میں رکھے جائیں۔ میں سودا کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ اس سے مختلف ہے خود موصوف نے مدح میں اغراق اور غلو سے کام لیا ہے اور میر ضاحک پر حسن و فور خلوص کے جرم پر بگڑتے ہیں خود بھی اسی قسم کی تعریف کی ہے کیا عجب ہے کہ سودا کا فقرہ بالا خود میرزا کے اس فقرہ کی تشریح ہو کہ "پس مشکل ترین و فایق مرثیے کا معلوم کیا کہ مضمونِ واحد کو ہزار رنگ میں ربطِ معنی دیا اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا"۔ اگر مرثیہ نگاری کا ادبی مرتبہ پیش نگاہ نہ ہوتا تو شاید ہفت بند بھی حفظِ مراتب اور فروقِ صحت کی میزان میں سبک ٹھہرتا جزئیات کی تفصیل میں سودا کو وہ کمال حاصل ہے جس کا جواب آپ کو دوسری جگہ مشکل سے ملیگا۔ مثلاً حضرت قاسم کے حال کا وہ مرثیہ لیجیے جس کا مطلع یہ ہے۔

یارب ستم تو یہ سنو چرخِ کہن کا ٹھانا ہے عجب طرح سے بیاہ ابن حسن کا سنجوگ یہ کچھ باندھا ہے دولھا سے دلہن کا
جو تار کفن کا ہے سو ڈورا ہے لگن کا

تمام رسوم کا ذکر کرتے ہیں مگر مرثیت کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ ایک ایک رسم کا بیان ہوا اور پوری وضاحت سے تشبیہہ اور استعارات سے پورا فائدہ اٹھا لیتے ہیں مشقِ کلام اور جستجو کی داد دینی پڑتی ہے۔ لگن کے بجائے طاس پر خون کا آنا ٹھہانے جوڑے کی جگہ رنڈ سالہ خلعتِ نوشہ کفن۔ گھر کا جلنا نوبت اور آتشبازی۔ انار و بن غم۔ آہوں کی ہوائی۔ جگر کے شرارے۔ زخمی کی کھاٹ پھلواری کے تختے۔ سمدھن کے رخت تن کاٹ جانا خون کی چھینٹوں سے رنگ کھیلانا۔ براتی خون میں شرابور۔ چڑھاوا ساچق خوان دلھن کا سنوارنا۔ شربت اور چوتھے کی رسم ساہوری آنا (دورا لگنا) دلہن کی رخصت اور دلہن کے بین اپنی نحوست کے متعلق سب کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

قاسم ابن حسن کے حال میں اور بھی بہت سے مرثیے ہیں سب میں عروسی کا ذکر ہے مگر ہر محل پر جداگانہ شان ہے۔

طالب الہ آبادی

درسِ زندگی

چھا گیا ہے رات کا جادو جہاں پر ناگہاں　　جھلملا اُٹھے ستارے آسماں پر ناگہاں
ہلکا ہلکا ابر بھی چھایا ہے مغرب کی طرف　　مضمحل سا کچھ سماں پیدا ہی مغرب کی طرف
بادلوں کی تیرگی میں چاند بھی ہے جلوہ گر　　ظلمتوں میں دھیمی دھیمی روشنی ہے جلوہ گر
شب کا استغراق اور ایامِ رفتہ کا خیال　　کس قدر رنگیں ہے صبح و شامِ رفتہ کا خیال
غرق ہیں خاموش نظریں محفلِ افلاک میں　　فکر کے موتی ہیں رخشاں دامنِ ادراک میں

کل فضائے دہر تھی معمورِ انوارِ طرب　　محفلِ دنیا نظر آتی تھی گلزارِ طرب
آج لیکن ایک غم خانہ ہے بزمِ کائنات　　ایک وحشت خیز ویرانہ ہی بزمِ کائنات
کیا ستم ایجادِ دنیا کا یہی دستور ہے　　کل جو دل اک پھول تھا وہ آج اِک ناسور ہے

اک روش پر ہی نہیں قائم نظامِ کائنات　　ہے تغیر آشنا دائم نظامِ کائنات
رنج ہے تو رنج میں آئینۂ راحت بھی ہی　　چار دن کی زندگی دوزخ بھی ہی جنت بھی ہی
محفلِ عشرت میں ہی سامانِ بزمِ غم کا بھی　　ساغرِ غم میں نہاں ہی خونِ جامِ جم کا بھی
عارضی ہے رنج تو راحت بھی ہے ناپائدار　　آرزو فانی ہے گر حسرت بھی ہے ناپائدار

بھکاری کا دل

(روسی افسانہ نگار گورکی کا ایک افسانہ)

اُس روز آدھی رات کے وقت چوراہے کے ٹھیک موڑ پر اپنی طرح کے ایک بدنصیب اور مفلس آدمی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اُس آدمی نے کہا "دیکھو! اگر ایک بازی مارنا چاہتے ہو تو اسی راستے سے ٹھیک دکھن کی طرف چلے جاؤ۔ سامنے ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان نظر آئے گا۔ اس کی دیواریں اونچی نہیں ہیں۔ دروازہ بھی چھوٹا سا ہے۔ اس مکان میں کوئی آدمی نہیں ہے۔ صرف ایک بوڑھا مالی پہرہ دیتا ہے۔ وہ آج بخار میں پڑا ہے۔ ایک کتا تھا کئی روز ہوئے وہ مر گیا۔ ایسا موقع کبھی نہ پاؤ گے۔ سمجھے؟"

اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اور تیزی سے دکھن کی طرف چلا۔ تھوڑی ہی دور پر پُل تھا۔ پل سے گذرنے کے بعد گھنا تاریک جنگل تھا۔ راستے میں کوئی آدمی نہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس کے بدن پر ایک پھٹا سا کمبل تھا۔ اس وجہ سے اس کا چہرہ اچھی طرح نظر نہ آتا تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سایہ کھسکتا ہوا جا رہا ہے۔ نرم نرم گھاس پر چلنے سے آہٹ بھی نہ ہوتی تھی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔

× × × × × × × × × × ×

وہ تھوڑی ہی عمر میں بڑھاپے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ اس کے سخت چہرے پر رونق اور تروتازگی کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ صرف آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، جن میں اس کے دل کی نرمی چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے غریبوں کے خلاف اس میں یہی فرق تھا۔

وہ چلا جا رہا تھا۔ سامنے جنگل تھا پیچھے بھی جنگل تھا۔ درمیان میں کہیں کہیں چند ایک مکان تھے۔ تھوڑے فاصلے پر وہ مکان بھی تھا۔

اس مکان کے سامنے آکر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہاں کی زمین اور آسمان سب کچھ اس کا ہے" اور کوئی ان چیزوں کا مالک نہیں ہے۔ لیکن یہ کیا؟ نہ پاؤں آگے بڑھتے ہیں۔ نہ ہاتھ اٹھتے ہیں۔ کون اس کے کام میں مخل ہو رہا ہے؟

یہی اس کی پہلی اور آخری چوری تھی۔ اس کے بعد اس نے کبھی چوری نہیں کی۔ بھوک کی ناقابل برداشت تکلیف سے مجبور ہو کر دوسرے کے باغ میں جاکر پھل وغیرہ توڑ کر کھائے ہیں لیکن کبھی نقب لگا کر یا مالا توڑ کر اس نے چوری نہیں کی ہاں تو اس نے ویسی چوری نہیں کی تھی۔ لیکن اب کیوں نہ کرے؟ اس کی کوئی خبر لینے والا نہ تھا۔ صبح سے شام تک اس کے منہ میں اڑ کر ایک کھیل بھی نہ جاتی تھی۔ پیاس سے حلق خشک ہونے لگتا تھا۔ اسے کوئی ایک مٹھی اناج اور ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ تھا۔ جاڑا، برسات، چلچلاتی دھوپ، کچھ بھی ہو۔ وہ رات دن کھلے میدان میں پڑا رہتا تھا۔ اس وقت کوئی اس کی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔

x x x x x x x x x x x

آج سے بہت پہلے جب وہ ماں باپ کو کھو کر مارا مارا پھرتا تھا۔ اس وقت گاؤں کے ایک بوڑھے نے اسے اپنے گھر لیجاکر بڑی محبت سے ٹوکری بنانا سکھایا تھا۔ اس سے کسی طرح اس کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ لیکن اسکے مزاج میں آوارگی تھی۔ اس لئے وہ ایک جگہ نہیں رہ سکتا تھا۔ گاؤں گاؤں مارا مارا پھرا کرتا۔

ایک روز شام کے وقت ایک کنوئیں کے پاس وہ دونوں آپس میں ملے تھے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ کنوئیں سے پانی لے کر آرہی تھی۔ یہ وہاں بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔ وہ کچھ ایسی حسین نہ تھی پھر بھی اس کی افسردہ صورت میں ایک کشش تھی اس کے سر سے بھی بچپن ہی میں والدین کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اسے اپنا کہنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے کبھی آرام کی صورت نہ دیکھی تھی۔ دوسرے کے ہاں نوکری کرکے اپنا پیٹ پالتی تھی۔

ایک طرح کے دو بدنصیب اس شام کو آملے تھے۔ اس لئے ان دونوں میں محبت ہو جانا فطری بات تھی۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے اور انہوں نے شادی کر لی۔

عورت اپنے مالک کے ساتھ ساتھ پھرا کرتی اور گرمی سردی کی تکلیفیں میدان میں برداشت کیا کرتی۔ دونوں وقت کھانا نصیب نہ ہوتا تھا۔ لیکن اسکے لئے ان میں سے کوئی رنجیدہ نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی معیت سے اس قدر خوش تھے کہ ان کو کسی تکلیف کا غم نہ ہوتا تھا۔

اسی طرح ان دونوں کے دن بسر ہو رہے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ان میں ایک اور جان آملی اور وہ تھا ان کا بچہ۔ یہ بچہ تندرست و توانا اور بیحد حسین تھا۔ ایک غریب کے گھر میں ایسا خوبصورت بچہ کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ بالکل شہزادہ معلوم ہوتا تھا۔

اس بچے کو پاکر ان دونوں نے سمجھا کہ ایک بے بہا لعل ہاتھ آگیا۔ فرط مسرت سے دونوں رقص کرنے لگے۔ اتنے دنوں سے دو مصیبت میں گرفتار تھے۔ لیکن بچے کو پاکر سب کچھ بھول گئے۔ وہ اب کسی چیز کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتے تھے۔ انہیں دنیا

کی کسی چیز کی حرص نہ تھی۔

وہ اب تک آزاد ہوا کی طرح پھرا کرتے تھے۔ ان کا کوئی مقصد کوئی مطمحِ نظر نہ تھا۔ لیکن بچہ پالنے کے ساتھ دنیا ان کی نگاہوں میں جادوگر کے کھیل کی طرح مسحور کن معلوم ہونے لگی۔ ہزاروں طرح کی کشش انہیں اپنی طرف کھینچنے لگی۔ کسی طرح لڑکا اچھی طرح رہے۔ اُسے اچھا کھلائیں، اچھا پہنائیں، اس فکر میں انہیں نیند نہ آتی تھی۔ وہ کبھی کسی کے لئے فکر نہ کرتے تھے۔ لیکن بچے کیلئے نہ جانے کہاں سے ان پر فکر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

× × × × × × × × × ×

چار برس گذر جانے کے بعد بچے کی ماں بیمار ہوئی۔ اور اسی مرض میں اس کی زندگی کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ اس وقت سب لوگ کہنے لگے "رات دن۔ راستے راستے مارے مارے پھرے۔ جاڑے کی تکلیف سے ماں تو چل بسی۔ اب بچے کو احتیاط سے رکھو" اس نے لوگوں کی بات پر کچھ توجہ نہ کی۔ اور پہلے ہی کی طرح میدان میں دن بسر کرنے لگا "جان کی حفاظت کے لئے مکان ضروری چیز ہے" اس نکتے کو وہ نہ سمجھ سکا۔ لیکن اس کے دل میں ایک خاص قسم کا احساس ہونے لگا کہ اس کے دکھ سکھ کی ساتھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

بچہ بھی بالکل ماں کی طرح تھا۔ جیسے اسی سانچے میں ڈھلا ہو۔ وہی گھونگھر والے بال، شگفتہ چہرہ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں غرض سب وہی باتیں۔ اسے دیکھ کر ایک حد تک اس کا غم غلط ہو جاتا تھا۔ جس وقت اس کا دل اپنی رفیقۂ زندگی کے لئے بیقرار ہوتا وہ بچے کو سینے سے لگا لیتا۔ اس طرح اس کا دل ٹھنڈا ہو جاتا۔ اس کے سخت دل سے بھی محبت کا شیریں چشمہ ابل کر اس معصوم دل کو بھگو دیتا تھا۔ اس وقت وہی بچہ اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔

لیکن وہ بڑا بدنصیب تھا۔ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک، زندگی کا سہارا، وہ بچہ بھی اسے داغ مفارقت دے گیا۔ ننھا بچہ بھلا گرمی، سردی کی تکلیف کب تک برداشت کرتا؟ جس وقت بچہ مرا۔ وہ ہائے ہائے کہکر چیخ اٹھا۔ وہ سوچنے لگا۔ آہ! میں نے کیوں نہ لوگوں کی باتیں سنیں۔ کیوں نہ اس کی حفاظت کی؟

جب بچے کو قبر میں لٹا دیا گیا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار جاری ہوگیا۔ اتنا رونے کے بعد بھی اس کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جسم کا سارا خون پانی ہو کر آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ اس کے لئے دنیا سنسان اور تاریک ہوگئی۔

اس کی دونوں آنکھیں بیکار بچے کو تلاش کیا کرتی تھیں۔ وہ تخیل کی مدد سے بچے کا ایک مجسمہ تیار کر کے اپنے دل کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا تخیل بھی اتنا بے جان تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کبھی ناکام رہتا تھا۔ بچے کی ایسی کوئی خوبی

نہ تھی۔ جسے دیکھکر وہ سکون حاصل کیا کرے۔ اوڑھنے کی چادر، بچھانے کا کمبل جو کچھ تھا وہ سب اسکے ساتھ قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔ اپنی تمام نشانیوں کو لے کر بچہ اسکے پاس سے چلا گیا تھا۔

اب وہ بالکل مردہ سا رہنے لگا۔ اس کی ساری شوخی ساری شگفتگی کافور ہوگئی۔ اب وہ درندوں کی طرح خونخوار ہو چلا۔

× × × × × × × ×

اس کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا "دوسرے کے باغ سے پھل توڑ کر کھانا اور نقب لگا کر چوری کرنا ایک ہی بات ہے۔ دونوں میں فرق ہی کیا ہے، دونوں چوری ہیں" آج اس مکان کے سامنے اس کے دل میں یہی خیال چکر لگا رہا تھا۔

وہ گھاس پر چپت ہو کر لیٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اس وقت اس کا سینہ پھٹنے لگا۔ آنسو نکلنے لگے۔ رونے کے بعد کچھ سکون حاصل ہوا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور دل ہی دل میں سوچنے لگا اور لوگ بھی تو چوری کرتے ہیں! میں بھی کیوں نہ کر دوں؟ سوچ بچار میں کیوں پڑوں؟"

اس کے بعد ایک چھلانگ میں سامنے کی موری کو پھاند کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ جوں جوں دیوار کے پاس ہوتا تھا اس کے دل میں ایک قسم کی خوشی اور مسرت رقص کرتی تھی۔ شرم و لحاظ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جس وقت اس نے اس دیوار پر ہاتھ رکھا اس کا دل ذرا بھی نہ جھجکا۔ وہ فوراً دیوار پھاند گیا۔ سامنے کے ایک کمرے کے دروازے کے لٹکتے ہوئے تالے کو اس نے ایک ہی جھٹکے میں توڑ ڈالا۔ اس کے بعد وہ اندر پہنچ گیا۔

کچھ دیر تک اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں کمرے کی روشنی سے مانوس ہوئیں جب سب چیزیں اسے نظر آنے لگیں تو وہ متحیر ہو گیا۔ مکان نہایت صاف ستھرا، پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ دیوار پر تصویریں لٹک رہی تھیں۔ مکان سامان سے بھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف قیمتی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے ایسی چیزیں کبھی نہیں دیکھی تھیں وہ کھڑا ہو کر حیرت و تعجب کے دریا میں غوطے کھانے لگا، اور سوچنے لگا۔ یہ سب چیزیں کس کام آتی ہیں؟ اس کا دل حیرت اور خوف سے لبریز ہو گیا۔

وہ فوراً طے نہ کر سکا کہ ان میں سے وہ کن چیزوں کو لے۔ وہ جتنا سوچتا تھا اس کا دماغ اتنا ہی چکراتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ساری چیزیں ایک ساتھ پکار پکار کر اس سے کہہ رہی ہیں "مجھے لے چلو ——— مجھے لے چلو ———!" وہ کسے چھوڑ کے کسے لے چلے؟ اسی خیال میں وہ دیوانہ سا ہو گیا۔

سامنے ایک باجا تھا۔ اس کی طرف بڑھا، اور ایک جھٹکے میں اس کا ڈھکنا توڑ ڈالا۔ باجے کے اندر کچھ زیادہ چیز نہ

تھی۔ کٹے ہوئے تھوڑے سے کاغذات پڑے تھے۔ ایک کونے میں سونے کی دو مہریں چمک رہی تھیں۔ انہیں لینے کے لئے اس نے جوں ہی ہاتھ بڑھایا۔ اس کی نگاہ ایک تصویر پر پڑی۔ دفعتہً اس کے سارے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی —— رگ رگ میں ہیجان پیدا ہو گیا —— اس کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں!

وہ تصویر ایک چھوٹے بچے کی تھی۔ تخیل کی مدد سے وہ جس تصویر کے کھینچنے میں ہزاروں بار ناکام ہوا تھا۔ آج اسی تصویر کو آنکھوں کے سامنے کاغذ پر دیکھ کر فرطِ مسرت سے اچھل پڑا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ کیا کرنے آیا ہے؟ کہاں آیا ہے؟ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ وہ دیوانہ وار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کو دیکھنے لگا۔ وہی بھولی صورت، وہی گھونگھر والے بال، وہی بڑی بڑی آنکھیں، ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ —— ساری باتیں وہی تھیں۔ یہ تصویر کس بچے کی تھی؟ وہ بالکل نہ جان سکا۔ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ اسی کے بچے کی تصویر ہے۔ اس کا دل یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا کہ یہ کسی دوسرے بچے کی تصویر ہے۔

ایک مدت سے اس کا دل جسے پانے کے لئے بیقرار تھا آج اسے پا کر وہ بیحد خوش ہوا۔ اس کا سارا رنج و غم ایک لمحہ میں کافور ہو گیا۔ بچے کی نشانی پانے کے لئے وہ دیوانہ بنا ہوا مارا مارا پھرتا تھا آج اسے ہاتھ میں لے کر فرطِ مسرت میں خود کو بھی بھول گیا —— اس نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔

اس نے زیادہ دیر نہ کی۔ تصویر کو خوب مضبوطی سے پکڑ کر بار بار چوما۔ اس کے بعد اسے سینے سے لگائے ہوئے وہاں سے چل دیا۔

ایک بار اس کے دل کی شگفتگی پھر واپس آگئی۔ یہی چوری اس کی پہلی اور آخری چوری تھی۔ اس روز کے بعد اس کے دل میں پھر کسی چیز کے چرانے کی خواہش نہیں ہوئی۔ جیسے اسے کسی چیز کی کمی ہی نہیں رہی۔

(ترجمہ)

آسی رام نگری

گیت

بھر دے میرا پیالہ بابا

اک پردیسی ہوں دکھیارا
پھرتا ہوں میں مارا مارا
جگ میں کوئی نہیں ہے سہارا
کھول [illegible] کا تالا بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

جوگی ہوں میں دان کا پیاسا
نربدھی ہے گیان کا پیاسا
چنچل من ہے دھیان کا پیاسا
کر دے مجھے متوالا بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

تیرے کارن جوگ لیا ہے
بیوگ میں تیرے سوگ لیا ہے
دنیا بھر کا روگ لیا ہے
پڑا ہے [illegible] میں چھالا بابا
بھر دے میرا پیالہ بابا

اندرجیت شرما

انعامی مقابلہ نمبر (۱)

قواعد: نمبر ۱۔ اگلے صفحے پر ۱۲ تصاویر کا ایک سٹ ہے۔ ان میں سے ہر تصویر ایک مشہور تخلص کی تشریح کرتی ہے۔ آپ کو صرف اس قدر سوچنا ہے کہ کون سا تخلص کس تصویر سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تصویر نمبر ۱ کی تشریح مجروح ہے۔ باقی ۱۱ تصاویر کے نام آپ کو دریافت کرنے ہیں یہ ۱۲ تخلص اس فہرست میں بھی موجود ہیں جو تصاویر کے نیچے درج ہے۔

۲۔ تمام نام چھپے ہوئے کوپن پر جو نیچے دیا گیا ہے نمبروار درج کر دیں۔ اور کوپن کے باقی اندراجات پُر کر کے کوپن پر ۲ کا ٹکٹ چسپاں کر دیں اور اسے ایک لفافہ میں بند کر کے مندرجہ ذیل پتہ [illegible] فرمائیں:۔ **انعامی مقابلہ نمبر ۱۔ دفتر ادبی دنیا پوسٹ بکس ۱۹۷ لاہور** کوپن کے اندراجات میں اگر کوئی کاٹ چھانٹ ہوئی [illegible] شامل مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ آپ اپنے ارسال کردہ حل کی ایک [illegible] اپنے پاس رکھ لیں۔ تاکہ جب ایڈیٹر مقابلہ کا حل اگلے پرچے میں شائع کیا جائے تو آپ اپنے حل کی صحت یا غلطی جانچ سکیں۔ جو حل ایڈیٹر مقابلہ کے حل کے مطابق ہوگا اسے صحیح تصور کیا جائے گا۔ اور ارسال کرنے والے کو مبلغ پچاس روپے کا انعام دیا جائے گا۔ اگر کوئی حل بھی صحیح نہ ہوا تو وہ حل انعام کا مستحق ہوگا جس میں سب سے کم غلطیاں ہونگی اگر ایک سے زیادہ حلوں میں کم از کم غلطیاں ہوئیں تو انعام کی رقم برابر برابر بھیجنے والے اہل مقابلہ میں تقسیم کر دی جائیگی۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر مقابلہ کا فیصلہ قطعی اور قانوناً قابل تسلیم ہوگا۔

۴۔ اگر وصول شدہ ٹکٹوں کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے بڑھ گئی تو انعام کی رقم بھی اسی نسبت سے بڑھا دی جائے گی۔ اور اگر کم رہی تو ہم بقایا اپنے پاس سے ادا کر کے پچاس روپے پورے کر دینگے۔

۵۔ حل دفتر ادبی دنیا میں ۲۸ نومبر ۳۳ء کی شام تک وصول ہو جانے چاہئیں۔ بعد میں آنے والے حل شامل مقابلہ نہیں کئے جائینگے مقامی اصحاب اس تاریخ تک دستی بھیج سکتے ہیں۔

۶۔ آپ جس قدر حل چاہیں ارسال کر سکتے ہیں لیکن ہر حل مطبوعہ کوپن پر ہونا چاہئے اور ہر حل کے ساتھ ۲ کے ٹکٹ شامل کرنے چاہئیں ایک سے زیادہ حل ایک ہی لفافے میں ارسال ہو سکتے ہیں۔

۷۔ لفافے کی پشت پر بھیجنے والے کا نام اور پتہ خوشخط حروف میں درج ہونا ضروری ہے

۸۔ ادبی دنیا کے سٹاف کو اس مقابلہ میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ ۹۔ ایڈیٹر مقابلہ کا حل دسمبر ۳۳ء کی اشاعت میں چھاپ دیا جائیگا۔

کوپن مقابلہ نمبر ۱

اس کی خانہ پُری کر کے اور ۲ کے ٹکٹ چسپاں کر کے ارسال فرمائیں

حل تصویر نمبر ۱	نمبر ۲	نمبر ۳
نمبر ۴	نمبر ۵	نمبر ۶
نمبر ۷	نمبر ۸	نمبر ۹
نمبر ۱۰	نمبر ۱۱	نمبر ۱۲
بھیجنے والے کا نام اور پورا پتہ۔		۲ کا ٹکٹ

تخلصوں کی فہرست ۔ اوپر کی ۱۲ تصاویر کے حل اس فہرست میں موجود ہیں۔ تنا بار۔ بسمل۔ اسد۔ ساغر۔ بہار۔ اکبر۔ سوز۔ قیس۔ آشفتہ۔ عجز۔ اختر۔ ناسخ۔ بیضیا۔ تنہا۔ اصغر۔ آزاد۔ مجروح۔ سیماب۔ یگانہ۔ بیدا۔ فراق۔ جرات۔ انشا۔ عدم۔ حزیں۔ تپش۔ آتش۔ [illegible]۔ جوش۔
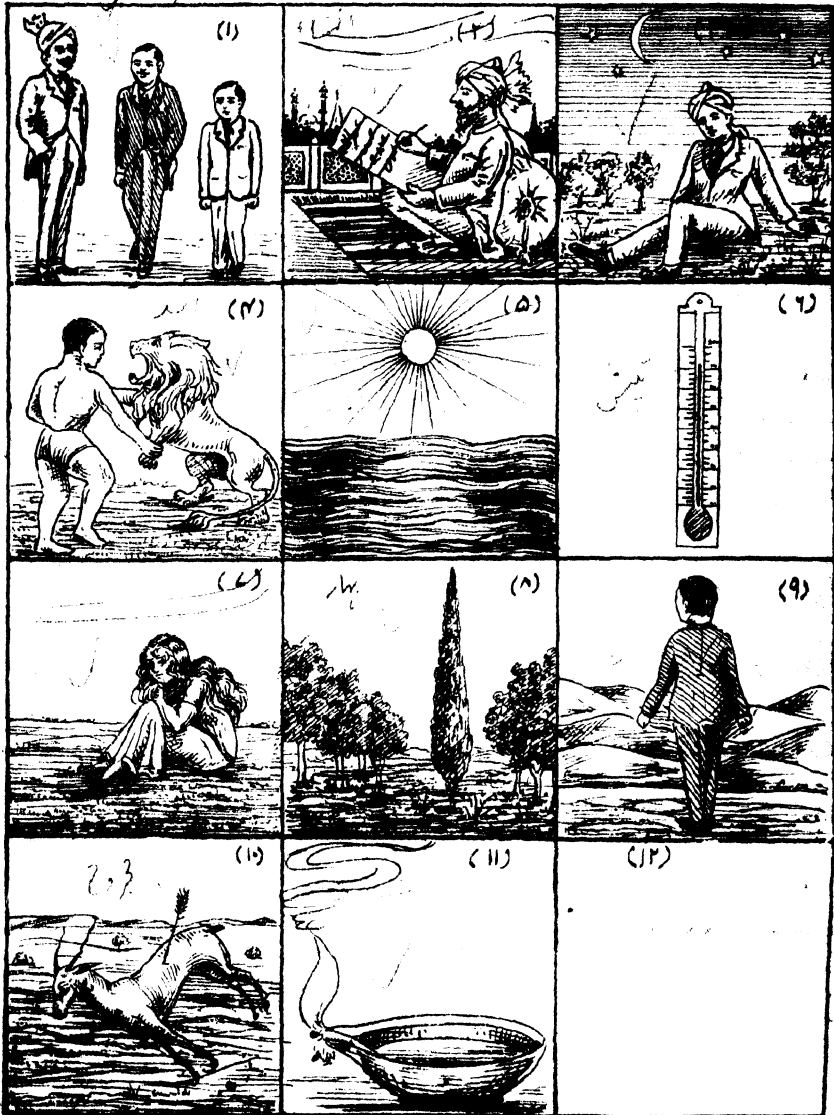
دنیائے ادب

اُردو

چند الفاظ کی اصلیت

لفظِ دیپ کے مشتقات

دفتر، دبیر، دوات، دبستان اور دیوان، عربی، فارسی، ترکی، اور دوسری مشرقی زبانوں میں، بلکہ دبستان کو چھوڑ کر بقیہ سب الفاظ ہماری زبان میں بھی مستعمل ہیں۔ اب تک ان لفظوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان میں سے ہر لفظ الگ مادہ سے مشتق ہے اور بجائے خود مستقل ہے۔ عربی میں یہ تمام الفاظ یقیناً فارسی سے آئے ہیں مگر خود فارسی میں بھی ان کی ٹھیک ٹھیک اصلیت کا پتہ نہیں چلتا تھا قدیم فارسی زبان کی تحقیقات اور علم لغت (فیلالوجی) نے جو ترقی کی ہے، اس سلسلہ میں ان الفاظ کی اصلیت کا بھی پتہ چلایا گیا ہے، فارسی رسالہ ایرانشہر کے سالِ اول و شمارۂ ہشتم میں اس پر ایک تحریر چند سال پہلے شائع ہوئی تھی اُس کی تلخیص درج ذیل ہے:-

فارسئی قدیم میں جو شاہانِ ہخامنشی کے زمانہ میں رائج تھی "دیپ" کے معنی لکھنے اور خط کھینچنے کے تھے اور یہ لفظ سنسکرت کے لیپ اور لیپی کا مرادف تھا جن کے یہی معنی ہیں، داریوش (دارا) کے کتبوں میں اُس کو "دیپیں" لکھا ہے جس سے کتبوں کے خطوط مراد لیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ خطوط خطِ میخی (مسماری) میں ہیں جو لکھے نہیں گئے، بلکہ کھودے گئے ہیں، لیکن چونکہ اس زمانہ میں دستور تھا کہ خطوط کھود کر اُن میں سونے کا پانی یا رنگ بھر دیتے تھے اور اس طرح گویا خطوط کو دوبارہ لکھ دیتے تھے اس لئے "دیپیں" کا لفظ خط اور نوشتہ کے معنی کے لئے مناسب تھا جو داریوش نے استعمال کیا،

اب دیکھو "دیپ" سے کتنے الفاظ مشتق ہوتے ہیں،

۱- دفتر، یہ لفظ عربی نہیں بلکہ فارسی ہے اور اسی دیپ سے نکلا ہے- قدیم یونانی مورخوں نے اس کو "دیپترا" اور "دفترا" لکھا ہے کتزیاس ایک یونانی مورخ جو ۱۵؁ق م میں گرفتار ہو کر ایران آیا اور سترہ سال تک ایرانی دربار میں طبیب رہا تھا، اُس نے تاریخ ایران میں (جس کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے) لکھا ہے کہ ایرانی سلطنت کے سالناموں کو "دفترا" کہتے ہیں مشہور یونانی مورخ ہیرودوٹس

نے بھی لکھا ہے کہ یہ لفظ مغربی ایشیا میں کتاب اور خط کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

۲۔ دبیر (لکھنے والا) ابتداءً اس شخص کو کہتے تھے جو لکھنے سے آشنا ہوتا تھا، کیونکہ قدیم زمانہ میں لکھنا بہت عام نہ تھا بعد میں جب لکھنے کا زیادہ رواج ہوا تو دبیر اُس کو کہنے لگے جو لکھنے کے علاوہ مضمون آفرینی پر بھی قادر ہو (یعنی منشی) اور "دبیرستان" کے معنی "مکتب" کے ہیں (مکتب کا مطلب وہ جگہ ہے جہاں لکھنا سکھایا جاتا ہو)

۳۔ دوات (لکھنے کا سامان) یہ غور کرنے کی بات ہے، کہ عثمانی ترک دوات کو "دویت" لکھتے اور پڑھتے ہیں، جو اصل لفظ (دبیپ) سے بہت قریب ہے۔

۴۔ دبستان (مکتب) بعض ناواقف سمجھتے ہیں کہ دبستاں، ادبستاں یا دالبستاں کا مخفف ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، دبستاں اُس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں لکھنا سکھایا جاتا ہو۔ اور اس طرح یہ مکتب کا مرادف ہے،

یہ نکتہ خیال میں رہنا چاہئیے کہ قدیم زمانہ میں مدارس میں صرف لکھنا اور پڑھنا بتلایا جاتا تھا۔ کتابیں نہیں ہوتی تھی جس سے درس دیا جاتا، کیونکہ علوم بھی مدون و مرتب نہ تھے۔ اس لئے اگر کوئی شخص نوشت وخواند سے آشنا ہو جاتا تو صاحبِ ہنر و صنعت سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بعض قوموں میں ابتدائی مدارس کا ایسا نام موجود ہے جس سے صرف لکھنے کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۔ دیوان یعنی وہ جگہ جہاں تحریریں اور اوراق محفوظ رہتے ہوں، بالفاظِ دیگر "دفترخانہ" شاہانِ ساسانی کے زمانہ میں حکومت کے دفترخانہ کو دیوان کہتے تھے، کیونکہ خراج، مالیات اور صادرات حکومت کے تمام دفاتر یہیں محفوظ رہتے تھے، بعد میں خود اُن دفاتر اور اوراق کو دیوان کہا گیا، پھر اشعار کے مجموعہ کا یہی نام رکھا گیا، عربوں نے اس لفظ کو ایرانیوں سے لے کر مختلف مشتقات پیدا کئے، مثلاً دواوین اور تدوین، پھر لاطینی قوموں نے اُس کو عربوں سے لیکر دوآن (Douane) کر لیا جو فرانسیسی میں آج بھی ادارہ کُرگ (چنگی کے محکمہ) پر اطلاق ہوتا ہے پہلوی میں یہ لفظ "اَنیوان" (دیوان) اور ارمنی میں اتیان ہے، فخری نے آداب السلطانیہ میں عربوں کے ایرانیوں سے دفترداری کے سیکھنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد فخری کی عبارت کا فارسی ترجمہ ہے اور حاشیہ فتوح البلدان بلاذری کے مطالعہ کی بھی سفارش کی گئی ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں ان دفاتر کے ادارہ یعنی محاسباتِ خارج و صادر (آمد و خرچ کے حسابات) کو دیوان کہتے تھے، جو آج کل کی وزارتِ مالیہ کا قائم مقام تھا (شاید اسی بنا پر عثمانی ترک بھی قدیم زمانہ میں وزیر مال یا مستوفی کو "دفتر دار" کہتے تھے،

بعد میں جب خلافت مبدل بہ سلطنت ہوگئی اور ہر محکمہ وسیع پیمانہ پر قائم کیا گیا، تو سلطنت کے ہر ادارہ کے لئے ایک دیوان کی بنیاد رکھی گئی، مثلاً دیوانِ رسائل، دیوانِ کتابت، دیوانِ فوج (دیوان بمید) وغیرہ جو آج کل کے وزارت خانوں کی ابتدائی تشکیلیں تھیں۔ ان دائروں کا صدر صاحب دیوان کہلاتا تھا۔ اس طرح لفظ "دیوان" اپنے تنگ معنی "دفترخانہ" سے نکل کر گو مختلف ادارہ اور محکمہ تک وسیع ہوگیا، عثمانی ترکوں نے قلم کے معنی میں اسی قسم کی تبدیلی کی ہے، پہلے دفترخانہ کو "قلم"

اوطہ سی" یعنی قلم و تحریر کا کمرہ کہتے تھے، کبھی کبھی الحاق کا لفظ حذف ہو جاتا، اور صرف قلم، دفتر خانہ اور ادارہ کے معنی میں مستعمل ہوتا تھا۔ آج بھی کہتے ہیں از قلم می آیم، بقلم می روم، فلانے در قلم مستخدم است،

معارف۔ یہی لفظ دیوان ہے، جس کے معنی پہلے تحریروں اور یادداشتوں کے بحفاظت رکھنے کا مقام تھا جس کو آج دفتر اور آفس کہتے ہیں، ہماری زبان میں اُس کے معنی اس صاحبِ منصب کے ہو گئے ہیں جو سرکاری مالی کاغذات اور حسابی تحریروں کا ذمہ دار ہوتا ہے یعنی جس کے متعلق مالیات کا حساب کتاب ہوتا ہے، آج کل کی اصطلاح میں اُس کو وزیرِ مال کہہ سکتے ہیں اور اسی سے ترقی کر کے بعض ہندو ریاستوں میں دیوان کے معنی مطلق وزیر کے ہو گئے ہیں، غور کیجئے کہ الفاظ کس طرح اپنا قالب اور چولا بدلا کرتے ہیں، "معارف"

ہندی

ملاقات

آج وہ مجھ سے ملے گا ـــــــ ظالم اور سنگدل معشوق ملے گا۔ دنیا نے سماج نے اُس سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے۔ دنیا کیا ہے؟ ایک بڑی تعداد میں انسانوں کی آبادی۔ سماج کیا ہے؟ مطلبی، خود غرض، پرلے گنہگاروں کی بستی۔ ہاں تو دنیا نے اُس سے ملنے نہ دیا!

میں نے دنیا کے خشک قوانین کو سر جھکا کر مان لیا۔

دنیا اپنی اُسی رفتار سے چلنے لگی۔ لیکن دل میں طوفان اُٹھ رہا تھا۔

غم کے طوفان سے جسم پتّے کی طرح ہل رہا تھا، اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔

وہ گلی کے اُس نکڑ پر دکھائی دیا۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ منہ تمتما گیا۔ اف وہ تو اُدھر کا اُدھر ہی چلا گیا۔ دل کو مار کر بیٹھ رہی۔

کتنا سنگدل ہے وہ! میں نے اس کے انتظار میں آنکھیں بچھا دیں مگر ظالم نے اِدھر دیکھا بھی نہیں؟

کیا وہ پریم نہیں کرتا؟ کیا میں اُس کے لائق نہیں؟ نہ کرے وہ پریم! مجھے کنیز ہی سمجھ کر جگہ دیدے۔ نہیں اس کا قصور نہیں! دنیا کا ہے۔ وہ پریم کرتا ہے، لیکن دنیا سے ڈرتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟

کچھ بھی کہے دُنیا، میں آج اس سے ملوں گی۔

تارے آکاش میں ہنس رہے تھے۔ چاند چُپ چاپ آنکھیں کھولے انسانوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ تارے ہنستے تھے، میں سمجھی میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک قدم پیچھے رکھا، پھر ہمت کی۔ راستہ نامعلوم تھا۔ آگے بڑھی۔ دل نے پوچھا "کیا وہ آج ملے گا؟"

اسی راستے سے تو نکلتا ہے۔ میں نے چاند سے التجا کی تھوڑی دیر کے لئے اپنی چندھیا دینے والی کرنیں سمیٹ لو میری التجا قبول ہوگئی چاند نے کالی چادر اوڑھ لی۔

میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ دور ایک پرچھائیں اسی طرف بڑھ رہی تھی۔

"وہی ہے"! پرچھائیں قریب آئی اور آگے بڑھ گئی۔ میں نا امید ہو کر ایک پیڑ سے ٹک گئی۔

پھر ایک پرچھائیں قریب آئی۔ پیر کی چاپ برابر نزدیک نزدیک سننے میں آرہی تھی ــــــ میں نے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ وہ ٹھہر گیا۔ دل نے کہا "وہی ہے"! اُس نے بھی کہا "یہ تو وہی ہے!" اُس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا سینے سے لگا لیا میں نے اپنا سر اُس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ میرے پتلے پتلے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر اُس نے ایک بوسہ دیا۔

چاند نے اپنا سیاہ لباس دُور پھینک دیا اور کھلکھلا کر ہنس دیا۔ تاروں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میں سہم گئی۔ پریمی نے ایک اور بوسہ جڑ دیا ــــــ اب کی کپولوں پر۔

میں نے چندر دیو سے التجا کی کہیں وہ سرج بھگوان سے یہ باتیں نہ کہہ دے۔ انہوں نے التجا سُن لی اور شاید نہ کہا۔

سیّد شرف الحسن آروی

بنگالی

پکار

قطرہ قطرہ بارش کی صورت میں آسمان کے بادل زمین پر اترتے ہیں، اپنے کو زمین کے ہاتھوں میں گرفتار کرانے کے لئے، اسی طرح کہیں سے عورتیں آتی ہیں زمین پر بندشوں میں بندھنے کے لئے۔

ان کے لئے کم جگہ کی تنگ دنیا ہے، تھوڑے آدمیوں کی۔ اتنے ہی میں ان کا اپنا سب کچھ سما جانا چاہئے، ان کی تمام چیزیں، ساری مصیبتیں، ساری فکریں۔ اسی لئے ان کے منہ پر گھونگھٹ ہے، ہاتھوں میں کنگن ہے، گھر میں صحن کا حصار ہے،

عورتیں اس محدود جنّت کی حوریں ہیں۔

آخر کس دیوتا کی حیرت انگیز ہنسی کی طرح بے انتہا شوخی لئے ہوئے ہمارے محلے میں وہ چھوٹی سی لڑکی پیدا ہوئی؟ ماں اسے غصے میں کہتی ہے "ڈائن" باپ اسے ہنس کر کہتا ہے "دیوانی"!

وہ بھاگتے ہوئے چشمے کا پانی ہے، قاعدے اور دستور کے روڑے پتھر کو پھاندتی ہوئی چلتی ہے۔ اس کا دل گویا بانس کی شاخ کا اوپر کا پتہ ہے، جو ہمیشہ فرفراتا رہتا ہے۔

آج دیکھوں تو وہ چنچل لڑکی چھت کی ریلنگ پر جھک کر چپ چاپ کھڑی ہے، برسات کی قوس قزح کی طرح اسکی بڑی بڑی دو کالی بھویں آج پُرسکون ہیں جیسے پان کی ڈالی پر بارش سے بھیگے ہوئے پر کی چڑیا۔ اسے اس قدر پرسکون کبھی نہیں دیکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ندی بہتے بہتے ایک جگہ رک کر تالاب بن گئی ہے۔

کچھ دنوں پہلے دھوپ کی سخت حکومت تھی، اب حدِ نظر تک منظر اداس ہے، درخت کے پتے سوکھی ہلدی کی طرح افسردہ ہو گئے ہیں۔

اتنے میں یکایک پریشان دیوانے سیاہ بادل آسمان کے ایک گوشے میں شامیانہ نصب کر کے جم گئے، سورج کی کرنیں اس طرح نکل پڑیں جیسے نیام سے تلوار۔

نصف شب کو دیکھوں تو دروازے کھڑ کھڑ کرتے ہوئے کانپ رہے ہیں، شہر کے گھونگٹ کو اندھی ہوا نے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اُٹھ کر دیکھا تو گلی کی روشنی دھواں دھار بارش میں شرابی کی گدلی آنکھوں کی طرح نظر آتی اور گرجا کی گھڑی کی آواز جیسے بارش کی آواز کی چادر اوڑھ کر آدھمکی۔

صبح کو بارش کی رفتار اور تیز ہو گئی، دھوپ کو اُس نے اُٹھنے ہی نہیں دیا۔

ایسی بدلی میں ہمارے محلے کی وہ لڑکی چھت پر ریلنگ پکڑے چپ چاپ کھڑی ہے، اُس کی بہن نے آکر اُس سے کہا "ماں بلاتی ہیں"

اُس نے صرف زور سے سر ہلا دیا، اُس کی چوٹی ہل گئی، کاغذ کی ناؤ لئے ہوئے اُس کا بھائی آیا، بہن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اُس نے جھٹک کر ہاتھ چھڑا لیا، اس پر بھی اُس کا بھائی کھیلنے کے لئے کھینچا تانی کرنے لگا، بھائی کے گال پر اُس نے ایک چانٹا مارا۔

مینہ برس رہا ہے، اندھیرا اور بھی گھنا ہو گیا، لڑکی جوں کی توں کھڑی رہی۔

عہدِ ازل میں کائنات کے منہ سے پہلی آواز نکلی تھی، پانی کی زبان میں، ہوا کے گلے سے، لاکھوں کروڑوں برس کو عبور

کرکے وہ بھولی بسری پرانی پکار ابر و باراں کی آوازوں میں اس لڑکی کے کانوں میں آئی، اسی سے وہ آج تمام حدود کے باہر جاکر کھوگئی ہے۔ کتنا بڑا زمانہ ہے۔ کتنی بڑی کائنات ہے کتنے عہود کی کتنی زندگیوں کے پارٹ ہیں۔
اس بُعد بعید نے، اس وسعت نے آج اس لڑکی کی طرف دیکھا، بادلوں کے سایہ اور بارش کی آوازمیں اسے پکارا ــــ اسی لئے وہ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے چپ چاپ کھڑی تھی۔ گویا وہ خود غیر محدود زمانے کی تصویر ہے۔ "افسانہ"

انگریزی

ادیب

میری زندگی کے ایام علمائے رفتہ کی صحبت میں گذرتے ہیں میں اپنے اردگرد ــــ جہاں کہیں یہ متحیر نگاہیں جم جاتی ہیں ــــ زمانہ قدیم کے بڑے بڑے صاحب دماغ لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ یہ میرے وہ سرمدی دوست ہیں جن سے میں ہر روز باتیں کرتا ہوں۔

میں دولت میں انہیں کے طفیل خوشی حاصل کرتا ہوں اور تکلیفات سے اُنہیں کے ذریعے مخلصی پاتا ہوں۔ اور جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں کس قدر ان کا احسانمند ہوں تو اکثر میرے رخسارے شکر گذاری کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے ہیں۔

میرے تخیلات اُن عالموں کے مرہونِ منت ہیں جو مدت ہوئی چل بسے! میں اُن کے محاسن کو لے لیتا ہوں اور معائب کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اُن کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں شریک ہوتا ہوں اور بصد اخلاص اُن سے سبق حاصل کرتا ہوں۔
میری امیدیں علمائے رفتہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میری آخری آرامگاہ اُن کے ساتھ ہوگی، میں مستقبل میں انہی کے ساتھ سفر کروں گا۔ اور اس دنیا میں ایک ایسا نام چھوڑ جاؤں گا جو خاک میں فنا نہ ہوگا۔ عبد الغفور طاہر قریشی

نغمۂ الفت

میں شب کی پہلی خوشگوار نیند میں تجھے خواب میں دیکھتے ہوئے اُٹھا جب کہ بادِ نسیم کے جانفزا جھونکے چل رہے تھے اور ستارے آسمان پر درخشاں تھے۔

میں تجھے خواب میں دیکھتے ہوئے اُٹھا اے پیاری! تیرے کمرہ کی خوشنما کھڑکی تک ایک خاموش روح نے میرے قدموں کی غیر معلوم طریقہ سے رہنمائی کی۔

نغمے کے اُتار چڑھاؤ کا ارتعاش گہرے اور ساکت چشمہ میں غائب ہو جاتا ہے جس طرح ایک مسرور کن خواب کے خیالات محو ہو جاتے ہیں اسی طرح چمپا کی خوشبو و خوشنمائی زائل ہو جاتی ہے۔

ایک حرماں نصیب عندلیب کا نالہ و فغاں اُسی کے نازک قلب پر تڑپ تڑپ کر مٹتا ہے۔ اے میری جان سے عزیز محبوب میری بھی یہی تمنا ہے کہ تجھ پر قربان ہو جاؤں۔

آہ مجھ کو گھاس پر سے جلد اُٹھا، میں بیہوش ہوں، ناکام ہوں، قریب المرگ ہوں، میرے خشک لبوں پر اپنا پژمردہ پپوٹوں پر، تیری محبت بوسوں کی شکل میں برس پڑے۔

دیکھ! میرے رخسار سرد و سفید ہو رہے ہیں، میرا قلب زور اور تیزی سے حرکت کر رہا ہے، آہ! مجھ کو اپنے سینہ سے چمٹانے میں تاخیر نہ کر جہاں وہ آخر کار پاش پاش ہو جائے گا۔

"مکتبہ"

"طیور آوارہ"

"جذبات دوست" کو مذاق میں بھی مجروح نہ کرو ——— سائرس

دوست کو کھو دینا سب سے بڑی گم شدگی ہے ——— "

محبت کی غذا آنسو ہیں ——— رطاسو

اسباب مسرت کی تلاش نہ کرو بلکہ ہر شے سے اکتساب حظ کی کوشش کرو ——— رسکن

محبت کرنا ہمارے اختیار میں ہے اور اس سے علیحدہ رہنا ہمارے اختیار سے باہر ——— سائرس

زندگی کی مسرتوں سے دوستی کو علیحدہ کر دینا دنیا سے سورج کو ہٹا لینا ہے۔ دیوتاؤں نے اس سے اچھی اور خوبصورت چیز ہم کو نہیں دی ہے ——— سسرو

یاد ایک پھول ہے جو اُس وقت تک نہیں مرجھاتا ہے جب تک "اشک ہائے محبت" سے اس کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ بوٹم لے

جو لوگ خود محبت کرنا نہیں جانتے وہ دوسروں کی بے لوث محبت میں بھی شک کیا کرتے ہیں۔

دوست دشمن سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

جب کوئی تم سے اپنے خلوص کا اظہار کرے تو سمجھ لو کہ اس کے خلوص میں خود غرضی کو بھی دخل ہے ——— دیوانہ مصطفیٰ آبادی

نقد و نظر

اقبال، اس کی شاعری اور پیغام شیخ اکبر علی صاحب بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور نے اقبال کی شخصیت اس کی شاعری اور پیغام پر انگریزی میں یہ ناقدانہ کتاب لکھی ہے۔ دراصل یہ اُن مختلف لیکچروں پر مشتمل ہے جو مصنف نے وقتاً فوقتاً لاہور کی مختلف علمی مجلسوں میں دیئے۔ پبلک نے ان کی مساعی کو بنظرِ استحسان دیکھا اور ترمیم و ترتیب کے بعد انہیں کتابی شکل دیدی گئی۔

مصنف نے اقبال کے خاندان، ولادت، مختلف زمانے کے سوانح حیات، فلسفہ، شاعری، غرض ایک ایک چیز پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اس سائنٹیفک طریقہ سے تمام مضامین کو نباہا ہے کہ اقبال کے متعلق اس شرح و بسط سے کبھی کسی زبان میں تبصرہ نہیں ہوا۔ اندازِ تحریر عالمانہ مگر دلچسپ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کے انگریزی طبقہ میں مقبول ہوگی اور اہلِ یورپ کو جو اکثر اقبال کو سمجھنے میں راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں چراغِ راہ کا کام دیگی۔ چونکہ اردو میں بھی آج تک ہمارے اس مایۂ ناز شاعر سے متعلق کوئی ایسی تصنیف موجود نہیں جو اس کی تمام خصوصیات پر حاوی ہو۔ اس لئے اس کتاب کا اردو ترجمہ ادب کی بہترین خدمات میں شمار ہوگا۔ امید ہے کہ اردو کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے شیخ صاحب اب اس طرف توجہ منعطف فرمائیں گے۔

ہم ادبی دنیا کے تمام انگریزی خواں ناظرین سے پرزور سفارش کریں گے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور استفادہ کریں۔ کتاب ۱۸×۲۲ سائز کے ۴۰۳ صفحوں پر چھپی ہوئی ہے اور بظاہر بھی نہایت نظر نواز اور دلآویز ہے قیمت صرف چار روپے۔

ملنے کا پتہ:- شیخ اکبر علی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہسپتال روڈ لاہور

رہبرِ والدین۔ یہ کتاب خان صاحب سید ڈاکٹر حسین شاہ صاحب رضوی نے ان لوگوں کی رہنمائی اور رہبری کے لئے لکھی ہے جو پرورشِ اولاد کے بارے میں بالکل کورے ہیں۔ اور بچوں کی نگہداشت۔ حفاظت اور صحت کے لئے قدم قدم پر ڈاکٹروں اور دواؤں کے محتاج رہتے ہیں۔ ایک جوڑا متاہل زندگی کے آغاز سے لے کر اُس وقت تک جب کہ وہ اپنا صحیح جانشین دنیا میں پیدا کرے اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس میں بچے کی پیدائش رضاعت کے زمانہ کی ضروریات بچوں کی بیماریاں۔ اُن کا علاج۔ مصنوعی خوراک۔ دودھ غرض بچے کی حفاظت کے متعلق مکمل واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ بلکہ بچے دار گھروں میں اس کتاب کی موجودگی۔ ان کے روپے اور اُن کے وقت کو بہت حد تک بچا سکتی ہے۔ زبان نہایت آسان اور عام فہم ہے لکھائی چھپائی عمدہ ہے قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ ۱۶ پارک لین۔ مزنگ۔ لاہور

"خیابان" یہ ایک ماہوار علمی رسالہ ہے جس میں صرف محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "ادبی دنیا" کے فاضل نامہ نگار مسٹر شہنشاہ حسین صاحب رضوی بی اے ایم ایل ایل بی (علیگ) ایڈووکیٹ لکھنؤ اس کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ اس پرچے میں صرف منتخب اور بلند پایہ مضامین دیتے ہیں مضامین کے علاوہ مستند شعرا کا کلام بھی اس میں شائع ہوتا ہے۔ حجم ۸۰ صفحات۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ پتہ مطلع حسب ذیل صاحب منیجر خیابان۔ لکھنؤ

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ جنوری ۱۹۳۴ء

تصاویر:- (۱) کشتی (۲) الحمرا

صفحہ	صاحبِ مضمون	مضمون	نمبر شمار
۲	منصور احمد	آئینۂ عالم	۱
۶	حضرتِ منظور سرورش بھوپالی	سونے کا مسئلہ	۲
۲۱	جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	غزل	۳
۲۲	جناب سید علی حسنین صاحب زیبا (عثمانیہ)	تاثراتِ صبحگاہی	۴
۲۳	منصور احمد	کیا آپ کو معلوم ہے	۵
۲۴	جناب سید وقار عظیم صاحب بی اے،	معصوم فلسفی	۶
۲۵	حضرتِ محشر عابدی - ایم، اے،	اندھیری رات (افسانہ)	۷
۳۶	ح - ب -	حقیقتِ ہستی (نظم)	۸
۳۷	جناب مولانا جلال الدین صاحب اکبر، بی، اے، آرزز	آرزوئے شوق (نظم)	۹
۳۸	جناب سید طالب علی صاحب طالب الہ آبادی	میر تقی میر اور سودا	۱۰
۵۲	جناب میر سعادت حسین صاحب، نجیب	شفق (نظم)	۱۱
۵۳	حضرتِ صدق جائسی	غزل	۱۲
۵۴	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم، ایم، اے،	آتش پرست (ڈرامہ)	۱۳
۵۷	حضرتِ اکبر	تجلیات (نظم)	۱۴
۵۸	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم - ایم، اے،	یوں ہوتا تو کیا ہوتا (نظم)	۱۵
۵۹	جناب حسن عزیز صاحب جاوید	سبز چشمہ (افسانہ)	۱۶
۶۵	حضرتِ وقار انبالوی	دو غزلہ	۱۷
۶۶	جناب خواجہ عبد السمیع صاحب پال اثر صہبائی - ایم، اے -	راحت کدہ (نظم)	۱۸
۶۷	جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدر آباد دکن	جتنے منہ اتنی باتیں (افسانہ)	۱۹
۷۰	حضرات اعظم لکھنوی، آنند گورداسپوری، حفیظ ہوشیارپوری و شاد عارفی	غزلیات	۲۰
۷۱		دنیائے ادب	۲۱
۷۷		انعامی مقابلہ	۲۲
۸۰		نقد و نظر	۲۳

سائینس کی حدود

مسٹر سلیون اپنی نئی کتاب "سائینس کی حدود" میں کہتے ہیں کہ آج کل سائینس کی دنیا اتنی پُراسرار ہو رہی ہے کہ خیال کی ساری تاریخ میں کبھی اتنی پُراسرار نہ ہوئی تھی +

مصنف موصوف اگرچہ سائینس کی ترقیات کے بہت قائل ہیں مگر وہ یہ یقین کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ سائینس کی رسائی بھی ایک محدود مقام تک ہے +

وہ کہتے ہیں کہ "کائنات میں زمان اور مکان کی اس بے حساب وسعت کا انسانی نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی مقصد نہیں۔ مادے کے ان لاکھوں کروڑوں عظیم الہیئت پیکروں کے سامنے جو لاکھوں کروڑوں سال سے مسلسل اور پیہم بعید از قیاس طور پر تند و تیز قوت کو خارج کر رہے ہیں کوئی خاص منزل معلوم نہیں آتی۔ اور انسان ایک نہایت ہی مختصر لمحے کے لئے اس عظیم الہیئت اور بے معنی کارخانے کو دیکھنے کے لئے پیدا ہوا ہے +

اس سے بہت پہلے کہ یہ کارخانہ اپنے انجام کو پہنچے انسان صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکا ہو گا، اور باقی کا چرخہ تمام احساس سے معرا ایک ناقابلِ فہم رات کے اندر چلتا رہے گا۔ یہ ایک چونکا دینے والا انکشاف ہے اور بڑی حد تک خارج از قیاس جب ہم کہتے ہیں کہ یہ مجیر العقول نظام ایک محدود عرصہ گزرا کہ ایک معرضِ وجود میں آگیا۔ یہ اپنے تمام برگ و ساز کے ساتھ محض اس لئے کتمِ عدم سے نمودار ہوا کہ اپنے دل کی آگ سے بجھتا ہوا ایک جاودانی موت کے غار میں جا گرے۔ یہ سائینس کا بیان ہے +

یہ بات شروع سے آخر تک درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ پوری حقیقت یہی ہے۔ اس کے بجائے ہم یہ یقین کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ موجودہ سائینس کی رسائی بھی ایک محدود مقام تک ہے +

کتابِ مقدس کا ایک بے بہا مسودہ

برٹش میوزیم حکومتِ روس سے کتابِ مقدس کا ایک نایاب نسخہ ایک لاکھ پونڈ کو خرید رہا ہے +

یہ ان دو نسخوں میں سے ایک ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں لکھے گئے تھے۔ اور جو دنیا کے اہم ترین مسودوں میں سے سمجھے جاتے ہیں +

میوزیم نے آج تک جتنی نوادر خرید کی ہیں یا خریدنے کی کوشش کی ہے ان سب میں سے یہ مسودہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل یہ مسودہ زار کے قبضے میں تھا +

وزیر اعظم نے حال ہی میں اس کے خریدنے کا اعلان دار العوام میں کیا ہے، انہوں نے کہا کہ مسودہ حکومت کی منظوری سے خریدا جا رہا ہے، جو پبلک کے چندے کے برابر رقم شامل کر کے اس کو حاصل کر رہی ہے۔ وزیر اعظم کا خیال تھا کہ برٹش میوزیم کے ٹرسٹی بہت جلد پبلک سے چندے کے لئے ایک اپیل کریں گے۔ اسی اثناء میں پارلیمنٹ سے درخواست کی جائے گی کہ وہ شاہی خزانے سے حکومت کا حصہ دلوانے کی تجویز منظور کرے +

میوزیم کے نائب محافظ نے ایک نامہ نگار کو مسودے کے متعلق ایک نہایت دلچسپ کہانی سنائی۔ انہوں نے کہا کہ اس مسودے کا سراغ پہلی دفعہ ۱۸۴۴ء میں مشہور فاضل دینیات ٹسکن ڈارف کو سینٹ کیتھرائن کے گرجا میں ملا جو مونٹ سینائی پر واقع ہے۔ ان کو اس کے ۴۳ ورق ردی اشیا کی ایک ٹوکری سے دستیاب ہوئے اور انہوں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ یہ کتاب مقدس کا ایک نہایت ہی پرانا یونانی مسودہ ہے۔ انہوں نے وہاں کے پادریوں سے دریافت کیا کہ آیا ان کے پاس اس کے اور ورق بھی ہیں، تو اگرچہ انہوں نے اس امر کا اقرار کیا۔ لیکن ٹسکن ڈارف کو بقیہ مسودہ نہ مل سکا +

یہ ۴۳ ورق انہوں نے فریڈرک آگسٹس آف سکسنی کو بطور تحفہ پیش کر دیئے۔ یہ صفحات اب لیپزگ کی جامعۂ دینیات میں موجود ہیں ۱۸۵۳ء میں ٹسکن ڈارف پھر مونٹ سینائی واپس آئے تو ان کو کتاب مقدس کا ایک بڑا مسودہ دکھایا گیا ہے انہوں نے فوراً پہچان لیا۔ انہوں نے پادریوں سے یہ مسودہ لے لیا۔ اور آخر کار زار الیگزنڈر دوم کو تحفہ دے دیا +

اسے سینٹ پیٹرسبرگ کے شاہی کتب خانے میں رکھ دیا گیا، جہاں یہ اب تک پڑا ہے +

اس مسودے میں پرانے عہد نامے کا بہت سا حصہ ہے۔ بعض کتابیں نامکمل حالت میں ہیں۔ سادے کا سارا نیا عہد نامہ برنباس کا خط اور ایک رسالہ جس کا نام ہرماس کا گڈریا ہے اس میں موجود ہیں +

اس کے چار کاتبوں میں سے ایک کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ نسخۂ ویٹیکن کا کاتب بھی وہی ہے۔ یہ کتاب مقدس کے دو سب سے پرانے نسخے ہیں ۔۔۔ کیونکہ تیسرا جسے الیگزنڈرین نسخہ کہا جاتا ہے پانچویں صدی کے نصف ثانی میں لکھا گیا تھا۔ پہلے ہی سے "برٹش میوزیم" میں موجود ہے +

انسانی پرواز کی بلندیاں

ہوائی جہاز بنانے والے پیہم کوششیں کر رہے ہیں کہ وہ مسافروں کو آرام کرسیوں میں بٹھا کر زیادہ سے زیادہ رفتار کے ساتھ اُن دُور دراز مقامات پر گھنٹوں میں پہنچا دیا کریں جہاں پہنچنے کے لئے پہلے ہفتے بلکہ مہینے صرف ہوتے تھے +

گذشتہ چند سال کے دوران میں موجدوں نے ہوائی جہازوں کو اُن بلندیوں پر اڑانے کی تجویزیں سوچی ہیں جہاں کی پُر اسرار فضا زمین کی سطح سے میلوں اوپر ہے، اور جہاں نامعلوم وجوہ سے تپش صفر درجے تک آ کر پھر بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ بعض ماہرین نے اس خیال کا مضحکہ اڑایا ہے +

لیکن یہ خیال اب حقیقت کا جامہ پہن رہا ہے، فرانس میں فارمین کمپنی سالہا سال کی تحقیقات کے بعد ایک ایسا ہوائی جہاز بنا رہی ہے جس سے یہ باتیں ممکن ہو جائیں گی۔ یہ ہوائی جہاز ایسی رفتار پر جو اب تک ناقابلِ حصول خیال کی جاتی رہی ہے زمین سے چھ میل سے زائد کی بلندی پر اڑیں گے +

اتنی بلندی پر انسان اور انجن سانس نہیں لے سکتے۔ جہاز میں بیٹھنے والوں اور انجن دونوں کے تنفس کے لئے مصنوعی اسباب بہم پہنچائے جائیں گے چلانے والے کیلئے اور انجن کیلئے ایسی ایجادات کی ضرورت ہوگی جن سے وہ تپش کے اختلافات کا مقابلہ کر سکیں +

بڑی لمبی تحقیقات کے بعد شیل کمپنی نے اس میں چلانے کے لئے ایک خاص مسالہ ایجاد کیا ہے جو اس میں پٹرول کی جگہ استعمال ہوگا کیونکہ معمولی پٹرول اس میں نہیں چل سکے گا +

جہاز کی چھت میں ایک سوراخ ہوگا جس میں سے چلانے والا اور اس کا ساتھی مشین کا محافظ اندر داخل ہُوا کرینگے۔ جب وہ اندر بیٹھ جائیں گے تو دروازہ جس میں سے ہوا کے خارج ہونے کا کوئی رستہ نہیں بند کر دیا جائے گا۔ ہوا باز اس جہاز کو راستہ دیکھے بغیر چلائے گا یعنی صرف آلات کے استعمال سے۔ اس مشین میں اتنے آلات لگے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جن آلات کیلئے جہاز کے اندر جگہ نہیں مل سکی انہیں بازوؤں پر باہر لگا دیا گیا ہے۔ اور ان کے دیکھنے کو سوراخ رکھے گئے ہیں +

مستقبل کا ہوائی جہاز جو اوپر کی ہوا میں زمین والوں کی نظروں سے دُور اڑے گا دو دن کے اندر تمام کرۂ ارض کا چکر پورا کر لے گا لیکن غالباً اس کے بعد بھی انسان وقت اور فاصلے کو اپنی رفتار اور پرواز سے دعوتِ مقابلہ دیتا رہے گا +

روس کا تھیئیٹر

المر رائیس نے جو امریکا کے ایک مشہور ڈرامانویس ہیں اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ عہدِ حاضر کا روسی تھیئیٹر امریکا سے بالکل

مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ہمیشہ کوئی قطعی اور اہم بات مراد ہوتی ہے اور جس سوسائٹی میں اس کا ظہور ہوا ہے اُن کے ساتھ براہِ راست اس کا ایک تعلق ہے +

ان کا بیان ہے کہ روس میں تھیئیٹر سے انسان ایک قوت ایک جوش ایک ولولہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ ایک ایسی چیز جو سوسائٹی کے لئے نہایت ضروری اور نہایت اہم ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا "یاد رکھو، میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس نئے تھیئیٹر کیلئے کوئی شاہکار لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ احتساب کی نرمی اور نوجوان مصنفین کی کوشش سے ایسا بھی ممکن ہے۔ لیکن جب آپ تھیئیٹر سے واپس آتے ہیں تو وہ احساس جس کا میں نے اوپر ذکر کیا آپ ضرور ساتھ لاتے ہیں۔ اس کے برعکس امریکا کے تھیئیٹر کا اثر مُردہ دلی اور بے کیفی ہوتی ہے +

مسٹر رائیس نے کہا کہ روس میں تھیئیٹر سماجی زندگی کا ایک نہایت اہم حصّہ ہے۔ جس کا انتظام اور خرچ حکومت کے ہاتھ میں ہے ایک تھیئیٹر سے جو منافع ہوتا ہے اس سے اُن تھیئیٹروں کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں جن میں نقصان ہوتا ہے +

کھیلوں کا موضوع عام طور پر معاشرتی مسائل ہوتے ہیں اور معاشرہ کے ساتھ ان کو براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ پھر جیسا کہ بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے تمام روسی کھیل اشتراکی نہیں ہوتے +

رائیس نے وہاں شیکسپیئر کے بھی دو کھیل دیکھے۔ ان میں سے ایک "ہملٹ" تھا جو تقریباً چار گھنٹے تک جاری رہا۔ اور اس عرصے میں ایک منٹ بھی بے لطفی میں نہ گذرا۔ سوویٹ ذہنیت کے مطابق حسبِ معمول اس میں سے تمام فلسفہ اور مابعد الطبعیات نکال دیئے گئے تھے اور کہانی محض اتنی رہ گئی تھی کہ ڈنمارک کا بادشاہ کون ہونا چاہیئے۔ یہ غیر معقول بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن رائیس کہتے ہیں کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انسان اس کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا +

انسانی عمر

سائنسدان پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ موجودہ صدی کے اختتام پر انسان کی عمر عام طور پر اسّی سال ہو جائے گی +

موجودہ صدی کے ربع اول میں عمر کا اوسط انگلستان اور امریکا میں بقدر دس سال بڑھ گیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ میں عمر کا اوسط اس وقت اٹھاون سال بتایا جاتا ہے۔ یہ ترقی ابھی جاری ہے اور اس کے جاری رہنے کی توقع کی جاتی ہے +

ایک مشہور پروفیسر جنہوں نے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے کہتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء میں ایک اوسط درجے کا بچہ ۶۹ سال تک زندہ رہ سکے گا۔ ان کا قول ہے کہ یہ اوسط ۱۹۶۰ء میں ۷۲ سال ۱۹۹۰ء میں ۸۰ سال اور ۲۰۰۰ء میں بیاسی سال تک پہنچ جائے گی +

انسان کی عمر کی قدرتی حد ایک سو سال سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ اب تک سو سے زیادہ عمر کی مثالیں شاذ ملتی ہیں +

منصور احمد

سونے کا مسئلہ

سونے کا مسئلہ موجودہ زمانے میں تمام حکومتوں اور تمام ماہرینِ معاشیات کو اپنی جانب متوجہ کئے ہوئے ہے۔ سیاسیاتِ عالم میں اس کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ الاقوام نے حال ہی میں اپنی مالی کمیٹی کو اس پر غور کرنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کمیٹی نے نہایت سنجیدگی اور محنت سے غور کرنے کے بعد اپنی رپورٹ جمعیۃ میں پیش کر دی ہے اور اس رپورٹ میں بعض نہایت اہم اور قیمتی تجاویز پیش کی ہیں۔ اسی طرح انگلستان اور جرمنی کے اکثر بنکوں کے منتظمینِ اعلیٰ نے حصہ داروں کے عام اجتماعات کے مواقع پر اس مسئلے کے متعلق خصوصیت سے اظہارِ رائے کیا ہے، علاوہ ازیں بنک آف انگلینڈ کے منتظمِ اعلیٰ اور ممالکِ متحدہ امریکہ کے اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں سے بھی اس کے متعلق مبادلہ خیالات ہوتا رہا ہے، نیز حکومتِ انگلستان اور حکومتِ فرانس میں بھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے تاریخی سکے یعنی انگریزی پونڈ کی قیمت گر جانے اور اس جدید مالی حکمتِ عملی میں بھی جس پر آج کل انگلستان عمل پیرا ہے اس مسئلے کو بڑا دخل تھا۔

موضوع خشک ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ ہے، اور ہر تعلیم یافتہ انسان اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کے غوامض کو روشنی میں لے آنے کا مشتاق ہے۔ ہم نے اس عام دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے تاکہ اس کے مختلف پہلوؤں پر کسی نہ کسی حد تک روشنی ڈالی جا سکے۔

ہم آسانی کے لئے بحث کو چار بنیادی نکات (Points) پر تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔

(۱) "سونا" کن اغراض کے لئے استعمال ہوتا ہے؟

(۲) حال و مستقبل میں سونے کی پیداوار،

(۳) ضروریاتِ مبادلہ کے مقابلہ میں نقد سونے کی کم مقداری اور موجودہ اقتصادی مشکلات پر اس کا اثر،

(۴) مختلف ممالک کے درمیان سونے کی غیر منصفانہ تقسیم اور موجودہ مشکلات کے ساتھ اس کا تعلق۔

سونا کن اغراض کے لئے استعمال ہوتا ہے

اگرچہ وہ اغراض جن کے لئے سونا استعمال کیا جاتا ہے کثیر المقدار ہیں لیکن زیادہ دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین شعبوں میں منقسم ہے۔ معیارِ قدر کا کام دیتا ہے

(۱) نقدی ضروریات سیاسیات (۲) صنعتی ضروریات (۳) زر اندوزی

نقدی ضروریات۔ ہر وہ شخص جو اقتصادیات کے مبادیات سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے اُن اسباب کو جانتا ہے جنہوں نے اکثر ممالک میں لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سونے کو مبادلے کا ذریعہ اور قیمت کا معیار یعنی "نقد" قرار دیں۔ سونے میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو دوسری اشیا میں جنہیں بعض جماعتوں نے مبادلے میں استعمال کیا اور اب بھی کرتی ہیں مثلاً غلے، میوہ جات، یا مویشی ـــــ مفقود ہیں۔ سونے کی ندرت اس کے سکوں کا باہمی تشابہ و تماثل، حجم کی کمی اور وزن کی قلت کے باوجود قیمتی ہونے کی وجہ سے اس کی سہولتِ حمل و نقل، اُس کی خاص قوتِ برداشت، اس کی یہ قابلیت کہ قیمت کا نقصان اُٹھائے بغیر اسے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اور سب سے آخر میں اس کی ندرت کی بنا پر اس کی قیمت کا استقلال، یہ ہیں اس کی بعض اہم خصوصیات جنہیں ہم نے بطورِ مثال پیش کردیا ہے۔ یہ تمام خصوصیات قریب قریب مستقل ہیں سوائے ابتدائی اور آخری خصوصیت کے، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ سونا ہمیشہ جنسِ نادر بنا رہے گا اور اس کی قیمت کبھی تغیر پذیر نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ انسان اس کی بہت سی کانیں دریافت کرلے اور اس کی مقدار میں ضرورت سے زیادہ اضافہ ہوجائے۔ ایسی صورت میں لازمی طور پر اس کی قیمت گر جائے گی۔ اس وقت دوسرے اسبابِ معیشت کی خریداری کے لئے سونے کی زیادہ مقدار صرف کرنی پڑے گی۔ اس صورتِ حال کو ماہرینِ اقتصادیات "نرخوں کی عام گرانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نرخوں کی عام گرانی کے متعدد دور ہوچکے ہیں، جن میں سے دو مثالیں بطورِ مشتے نمونہ از خروارے یہاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) پہلی مرتبہ سولھویں صدی میں جب امریکہ کا انکشاف ہوا اور وہاں اہلِ ہسپانیہ نے اپنا تسلط قائم کرلیا۔ انہوں نے پیرو اور میکسیکو کی کانوں سے بہت بڑی مقدار میں چاندی اور سونا حاصل کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپانیہ میں ان دونوں کی قیمت ان کی کثرت کی وجہ سے صرف ۱/۳ رہ گئی، جس کی وجہ سے وہاں نرخ نہایت سرعت سے غیر معمولی طور پر گراں ہوگئے۔ آخر کار اس کی تجارتی درآمد پر اس کا بہت خراب اثر پڑا اور اس کی تباہی کے اسباب میں اس سبب کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔

(۲) دوسری مرتبہ انیسویں صدی میں جب ٹرانسوال کی سونے سے لبریز کانیں دریافت ہوئیں اور سونے کی کثرت کی

وجہ سے اس کی قیمت گر گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ نرخ عام طور پر گراں ہو گئے اور عظیم الشان اقتصادی سرگرمی کا آغاز ہو گیا۔

لیکن جس طرح یہ ممکن ہے کہ سونے کی پیداوار میں زیادتی ہو جائے اسی طرح کبھی اس کی مقدار میں نسبتاً کمی بھی آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تمدن کی تعمیم اور تہذیب کی وسعت کے ماتحت اضافۂ آبادی، ترقیٔ صنعت و زراعت اور انسانی ضروریات کے تنوع میں زیادتی کے ساتھ پیداوار اور مبادلے کی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے، اس لئے ان حالات کے مطابق نقد سونے کی مقدار میں اضافہ ہونا ضروری ہے، ورنہ نسبتی طور پر اس کی مقدار میں کمی واقع ہو جائے گی اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے سونے کی قیمت میں اضافہ اور نتیجۃً نرخوں میں ارزانی پیدا ہو جائے گی۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل اسی صورت حال کا وقوع موجودہ اقتصادی مشکلات اور سرد بازاری کا سبب بن گیا ہے۔

عصر حاضر میں اضافۂ دولت اور سرگرمیٔ مبادلہ کا اقتضا ہوا کہ سونے کے ساتھ نقود رتبیہ کے طور پر دوسرے وسائل بھی مبادلے کے لئے رونما ہو جائیں جن میں سب سے اہم مختلف قسم کے تمسکات ہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ داخلی داد و ستد کے لئے عموماً آخر الذکر طریقہ ہی استعمال کیا جانے لگا لیکن اس کے باوجود اکثر ممالک میں سونا ہی مبادلے کی اساس کا کام دیتا ہے کیونکہ تمسکات معمولی حالات میں صرف اس سونے کی بنیاد پر مقررہ نسبت کے ساتھ جاری کئے جاتے ہیں جسے بیرونی کاروبار کرنے والے بنک اپنے خزائن میں محفوظ رکھتے ہیں یا دوسرے ممالک میں ان تمسکات کی بنیاد پر جو سونے کے قائمقام ہوتے ہیں اور سونے کی ضمانت پر جاری کئے جاتے ہیں۔ یہ نسبت مختلف ممالک میں مختلف ہے، لیکن آج کل اصطلاحی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمسکات کی متداولہ مقدار کے مقابلے میں سونے کی مقدار ۱/۳ ۳۳ فیصدی سے کم نہ ہونی چاہئے۔ آج کل اکثر ممالک میں یہ نسبت ۵ فیصدی کے قریب قریب ہے، اور بعض جگہ اس سے متجاوز بھی ہو جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقدی کی داد و ستد کی حالت ابھی تک سونے کی حالت کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے یعنی اگر نقد سونے کی مقدار کم ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسرے نقدی وسائل میں بھی کمی ہو جائیگی، والعکس بالعکس!

صنعتی ضروریات۔ سونے کی تمام سالانہ پیداوار اغراض نقدی ہی میں استعمال نہیں کی جاتی اس کا ایک بڑا حصہ مختلف صنعتوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً زیور سازی، بعض ظروف اور قیمتی فنی اشیا، دندان سازی، طلائی نقش و نگار، گوٹے اور بعض قسم کے کپڑوں کی صناعات میں اس جزو کی صحیح مقدار معین کرنا نہایت مشکل ہے، لیکن اوسطاً سالانہ پیداوار کے ۱/۴ اور ۱/۳ کے درمیان سونا اس ذیل میں صرف ہو جاتا ہے یقین کیا جاتا ہے کہ ہر ملک کے عام تمول اور اس سونے کی مقدار میں خاص تعلق ہوتا ہے جو صنعتی ضروریات کے لئے مستعمل ہو، اور ثانی الذکر کی کثرت و قلت عموماً اول الذکر پر موقوف ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں فرانس کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں سنہ ۱۸۶۹ و ۷۰ء میں صنعتی استعمال

کے سونے کی مقدار کم ہوگئی تھی۔ اور اس کے بعد زیادہ ہوگئی۔ پھر ۱۸۸۹ء کی مالی مشکلات کے اثنا میں دوبارہ گر گئی، اسی طرح جنگ عظیم کے بعد جب اقتصادی (معاشی) بدحالی سے دوچار ہونا پڑا تو اس میں بے انتہا کمی واقع ہوگئی، یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان اس کی مقدار ۳۰۸۰۰ کیلوگرام سے ۱۴۱۰۰ کیلوگرام رہ گئی۔ آخر میں اس طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس سونے کی مقدار علمی ترقی کے اختلاف مدارج کے ساتھ مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح فن زرگری کا مذاق بھی اس پر کافی اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں اکثر ممالک کے باشندے سونے کے سبک زیور خریدنا پسند کرتے تھے جس کی وجہ سے اس عرصے میں زیور سازی کے لئے سونے کی کم مقدار استعمال کی گئی۔

زر اندوزی۔ جب ہم زر اندوزی کے متعلق بحث کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آڑے وقت امداد لینے کی غرض سے یا محض زر اندوزی کی لذت حاصل کرنے کے لئے سونے کو کسی منفعت بخش کام میں لگانے کی بجائے بیکار رکھ چھوڑنا یا تو یہ عمل وقتی ہے یا دوامی۔ دونوں صورتوں میں سونے کی سالانہ پیداوار کا ایک بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ مگر ان دونوں کے نتائج مختلف برآمد ہوتے ہیں۔ وقتی زر اندوزی کا عام طور پر رواج ہے اور اقتصادی (معاشی) مشکلات کے ایام میں جب کاروبار کی حالت اطمینان بخش نہیں رہتی اُس کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ سونے کا مالک اس خوف سے کہ کاروبار میں لگانے کی صورت میں ممکن ہے کہ ضائع ہو جائے، اسے محفوظ خزانے سے باہر لانے کی بجائے وہیں رہنے دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ جنگ اور سیاسی بے چینی کے دوران میں بھی عام طور پر یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس کی بہترین مثال جنگ عظیم کے دوران میں ملتی ہے جب کہ ہر ملک میں عوام اور خصوصاً کاشتکاروں کا طبقہ زر اندوزی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اس قسم کی زر اندوزی نقدی کے متعلق بے چینی پھیلنے کا بڑا سبب بن جاتی ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بازار سے نقدی کی بہت بڑی مقدار یکبارگی باہر چلی جاتی ہے اور وہاں اس کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے وقت یکایک واپسی کی وجہ سے اس میں خلاف معمول زیادتی ہو جاتی ہے دونوں صورتوں میں معاملات پر خراب اثر پڑتا ہے۔

دوامی زر اندوزی اس سے بھی بدرجہا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس طرح دنیا کے سونے کا ایک بہت بڑا حصہ فضول ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ مشرقِ اقصیٰ کے ممالک اور خصوصاً ہندوستان میں بہت زیادہ رواج پذیر ہے۔ یہاں کے لوگ قدیم زمانے سے زر اندوزی کے عادی ہیں اور اب تک اُن میں یہ عادت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب مسلسل بدامنی اور افراد کا دوسری قسم کے سرمایوں کی ملکیت سے مطمئن نہ ہونے کو تصور کرنا چاہیے۔ ابھی تک یہاں کے والیانِ ریاست اور امرا اپنے محلوں میں سنہری سامان کے بے پایاں خزانے محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح عام مہاجنوں وغیرہ کی حالت ہے کہ ذخائر اموال کو محفوظ رکھ چھوڑیں گے اور فقیروں سے بدتر زندگی بسر کر کے اپنی عمر گزار دیں گے۔ جہیز اور دوسری رسوم میں سنہرے روپہلے زیورات وغیرہ دینے کا

رواج بھی زیادہ تر یہیں پایا جاتا ہے اور معابد میں قیمتی چڑھاوے محفوظ رکھنا بھی یہیں کی خصوصیت ہے۔ نیز باوجود افلاس کے ہر طبقے میں زیورات کی غیر معمولی بھرمار بھی اسی ذیل میں شمار ہو گی۔ ہندوستان میں جنگِ عظیم کی وجہ سے جنوبی افریقہ سے سونے کی درآمد موقوف تھی لیکن اگست سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کی اجازت ہوتے ہی جنوبی افریقہ لندن اور نیویارک سے آنے والے سونے کا ایک سیلاب بمبئی کے ساحل پر امنڈ آیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان نے جس قدر سونا درآمد کیا وہ دنیا کے سونے کی پیداوار کا نصف اندازہ کیا گیا ہے عموماً یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مشرقِ اقصیٰ میں سونے کی جو مقدار ہر سال کی جاتی ہے وہ محاصل کی کمی وبیشی اور عام سیاسی اقتصادی حالت کے ماتحت سال بسال تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اسی لئے ہر سال اس میں غیر معمولی تغیرات پیش آتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں بعض ماہرینِ معاشیات نے سونے کی سالانہ پیداوار میں سے مذکورہ بالا اغراضِ ثلثہ کے منجملہ ہر ایک ضرورت کے لئے ایک خاص مقدار متعین کرنے کی کوشش کی۔ لے فیلٹ (Lehfeldt) کا خیال ہے کہ آج کل سونے کی سالانہ پیداوار ۴۰۰ ملین ڈالر تک پہنچتی ہے، جس کے منجملہ صنعتی ضروریات اور زراندوزی میں ۲۰۰ ملین ڈالر یعنی نصف کے قریب صرف ہو جاتا ہے۔ باقی نصف نقدی ضروریات میں استعمال کیا جاتا ہے کچن (Kitchen) جو سونے کے موضوع پر سب سے بڑا ماہرِ خصوصی ہے اندازہ کرتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء میں جو سونا صنعتی اغراض کے لئے مستعمل ہوا اس کی مقدار ۷۵ ملین ڈالر کے قریب ہے۔ اور ۷۰ ملین ڈالر کے قریب چین اور ہندوستان میں زراندوزی کے لئے درآمد کیا گیا۔ باقی جس کی مقدار ۲۷۰ ملین ڈالر کے قریب ہے نقدی ضروریات میں صرف ہوا۔ حال ہی میں جمعیتہ الاقوام کے ماہرینِ مالیات نے بھی اس موضوع پر بحث کی ہے اُن کو یقین ہے کہ غیر نقدی ضروریات کے لئے سونے کا استعمال ایک فیصدی سالانہ کے اوسط سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے اسی لئے انہوں نے اندازہ کیا ہے کہ اگر سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کی مقدار ۱۸۰ ملین ڈالر تھی تو سنہ ۱۹۴۰ء میں ۲۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ دوسری جانب چونکہ وہ مستقبل میں سونے کی سالانہ پیداوار میں کمی کی توقع کرتے ہیں، اس لئے اُن کا خیال ہے کہ نقدی ضروریات کے لئے چونکہ سنہ ۱۹۳۰ء میں (اُن کے خیال کے مطابق) ۲۲۴ ملین ڈالر سونا استعمال کیا گیا تھا اس لئے سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ مقدار گھٹ کر ۱۷۰ ملین ڈالر رہ جائے گی!

حال و مستقبل میں سونے کی پیداوار

سنہ ۱۹۳۰ء میں ۴۰۴ ملین ڈالر کی قیمت کا سونا نکالا گیا جن ممالک میں سونا نکلتا ہے اُن میں سے اہم حسبِ ذیل ہیں جنوبی افریقہ (ٹرانسوال اور روڈیشیا) ممالکِ متحدہ امریکہ کناڈا، روس، سائبیریا، میکسیکو اور آسٹریلیا ان تمام ممالک میں جنوبی

افریقہ کو سب پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہاں کے نکالے ہوئے سونے کی مقدار تمام دنیا کی پیداوار کے نصف سے زیادہ ہے۔ جنوبی افریقہ، ممالک متحدہ، کناڈا اور آسٹریلیا سے جو سونا نکلتا ہے اس کی مجموعی مقدار تمام پیداوار کے ۸۰ فیصدی کے لگ بھگ ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ آئندہ ۲۰ سال میں جنوبی افریقہ میں سونے کی پیداوار کا سالانہ اوسط علی حالہ قائم رہے گا لیکن غالباً ممالک متحدہ کی پیداوار کم ہو جائے گی، کیونکہ وہاں کی بعض کانیں ختم ہو چلی ہیں۔ اور اس لئے اس کی سالانہ پیداوار میں تدریجی کمی محسوس کی جا رہی ہے لیکن کناڈا کی پیداوار مائل بہ ترقی ہے۔ کیونکہ وہاں کچھ ہی عرصہ پہلے بعض لبریز کانیں دریافت ہوئی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کناڈا کی افزائش پیداوار قریب قریب ممالک متحدہ کی کمی کے مساوی ہو جائے گی۔ جنگ عظیم اور اشترا کی انقلاب کی وجہ سے روس کی پیداوار بہت زیادہ گر گئی تھی، لیکن سوویٹ حکومت نے آخر میں اس مسئلہ کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول کی اور اس کی پیداوار میں پھر سالانہ اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں ۱۹۱۳ء کی پیداوار کے مساوی ہو گئی، روس کا ۹۰ فیصدی سونا سائبیریا سے آتا ہے۔ آسٹریلیا کی سونے کی پیداوار تیزی کے ساتھ اور مسلسل رو بہ انحطاط ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہاں کی اکثر بہترین کانیں خالی ہو چکی ہیں اور معمولی کانوں میں کاروبار شروع کرنا اس لئے ناممکن سمجھا جاتا ہے کہ مصارف غیر معمولی طور پر زیادہ ہو جاتے ہیں اور سونے کو دوسری دھاتوں سے جدا کرنے میں بھی سخت دشواری پیش آتی ہے۔

۳۔ ضروریات مبادلہ کے مقابلے میں نقد سونے کی کم مقداری اور موجودہ اقتصادی مشکلات پر اس کا اثر!

تمام دنیا کے اندر سونے کی پیداوار میں جو کمی بیشی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے نرخوں میں جو تغیرات ہوئے اُن پر ماہرین اقتصادیات کی ایک جماعت نے خاص طور پر غور کیا ہے۔ پروفیسر کیسیل (Cassel) نے اس موضوع پر غور کرتے ہوئے معلوم کیا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں نرخوں کا معیار ۱۸۵۰ء کے معیار کے مساوی تھا، در آنحالیکہ اس دوران میں دنیا کے نقد سونے کی مقدار ۸ء۲ فیصدی سالانہ کے تناسب سے زیادہ ہوتی رہی ہے۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس اثنا میں ٹھیک اسی نسبت سے اقتصادی سرگرمی بڑھتی رہی ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر نقد سونے کی زیادتی کے ساتھ پیداوار اور مبادلہ کی حالت ۱۹۱۰ء میں بھی وہی رہتی جو ۱۸۵۰ء میں تھی تو نرخ عام طور پر گراں ہو جاتے۔ سر اسٹراکوش (Sr. Strakosh) کی تحقیقات کا نتیجہ بھی یہی برآمد ہوا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اقتصادی سرگرمی ۳ فیصدی سالانہ کی نسبت سے ترقی کر رہی ہے۔ یہ نتیجہ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۷ء کی درمیانی مدت کے اعداد و شمار سے نکلتا ہے جن پر موصوف نے اپنی تحقیقات کی بنیاد قائم کی ہے۔ حال ہی میں اس موضوع کی جانب جمعیتہ الاقوام کے ماہرین مالیات نے توجہ کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ نقد سونے کی طلب میں سالانہ ۲ فیصدی اور ۳ فی صدی کے مابین اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے اُن کی رائے میں ضروری ہے کہ مستقبل میں دنیا کے نقد سونے کی مقدار اسی تناسب

سے بڑھتی رہنی چاہیئے تاکہ قلتِ نقود کی وجہ سے نرخوں کا عام معیار گرنے نہ پائے لیکن بعض ماہرین خصوصی مثلاً علامہ کچن Kitchen کے اندازوں سے واضح ہوتا ہے کہ آج کل سونے کی جو مقدار نکالی جا رہی ہے وہ دنیا کی نقدی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوتی ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ مقدار آئندہ سالوں میں بتدریج گھٹتی رہے گی، کیونکہ سونے کی بعض کانیں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں، درآنحالیکہ دنیا کی سونے کی ضروریات مسلسل ترقی کر رہی ہیں، اس لئے غالباً سنہ ۱۹۴۰ء میں سونے کی جو مقدار نکالی جائے گی وہ دنیا کی ضروریات سے نصف ہو گی۔ جمعیتہ الاقوام کی مالی کمیٹی کی رپورٹ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ اگر سونے کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام نہ لیا گیا تو مستقبل میں نقد سونے کا قحط پڑ جانا بعید از امکان نہیں ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار جو جمعیتہ الاقوام کی مالی کمیٹی نے سونے کے مسئلہ پر رپورٹ پیش کرتے ہوئے بیان کئے ہیں اور ملین ڈالروں کی شکل میں دیئے گئے ہیں، اس کی تائید کرتے ہیں۔

سنہ	سونے کی مجموعی پیداوار کا اندازہ	نقدی ضروریات کے لئے سونے کی طلب	نقدی ضروریات کے لئے باقی رہنے والے سونے کی مقدار	نقد سونے کی مقدار میں جس قدر اضافہ ہونا چاہیئے تاکہ ضروری ضمانات اور تمسکات کے اضافے کے اوسط پر ۳۳ فیصدی کی نسبت سے کفایت کر سکے: ۲ فیصدی سالانہ	۳ فیصدی سالانہ	مطلوبہ اضافہ کے مقابلے میں نقدی ضروریات کے لئے استعمال ہونے والے جدید سونے کی مقدار کی کمی و بیشی تاکہ ضروری ضمانات اور تمسکات کے اضافہ کے اوسط پر ۳۳ فیصدی کی نسبت سے کافی ہو سکے: ۲ فیصدی سالانہ — کمی	۲ فیصدی سالانہ — بیشی	۳ فیصدی سالانہ — کمی	۳ فیصدی سالانہ — بیشی	کیفیت
۱۹۳۰	۴۰۴	۱۸۰	۲۲۴	۱۶۷	۳۵۳	۰	۵۷	۲۹	۰	سونے کی مجموعی پیداوار کی مقدار میں سنینِ گزشتہ کی توفیر بھی شامل سمجھنی چاہیئے
۱۹۳۱	۴۰۲	۱۸۲	۲۲۰	۱۷۰	۳۶۰	۰	۵۰	۴۰	۰	
۱۹۳۲	۴۱۰	۱۸۴	۲۲۶	۱۷۴	۲۶۹	۰	۵۲	۴۳	۰	
۱۹۳۳	۴۰۷	۱۸۶	۲۲۱	۱۷۸	۲۷۶	۰	۴۳	۵۵	۰	
۱۹۳۴	۴۰۳	۱۸۸	۲۱۵	۱۸۰	۳۸۵	۰	۳۵	۷۰	۰	
۱۹۳۵	۳۹۸	۱۹۰	۲۰۸	۱۸۴	۲۹۴	۰	۲۴	۸۶	۰	
۱۹۳۶	۳۹۷	۱۹۲	۲۰۵	۱۸۸	۳۰۲	۰	۱۷	۹۷	۰	
۱۹۳۷	۳۹۲	۱۹۴	۱۹۸	۱۹۲	۳۱۱	۰	۶	۱۲۳	۰	
۱۹۳۸	۳۸۴	۱۹۶	۱۸۸	۱۹۶	۳۲۱	۸	۰	۱۳۳	۰	
۱۹۳۹	۳۷۰	۱۹۸	۱۷۲	۲۰۰	۳۳۰	۲۸	۰	۱۵۸	۰	
۱۹۴۰	۳۷۰	۲۰۰	۱۷۰	۲۰۴	۳۴۰	۳۴	۰	۱۷۰	۰	

ان اندازوں نے اکثر ہم عصر ماہرین اقتصادیات کو مستقبل کے متعلق متردد و متشائم بنا دیا ہے، کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ انسان کا سونے کو مبادلہ کا ذریعہ قرار دینا عنقریب اس کی اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہوجائے گا۔ اس لئے کہ موجودہ اقتصادی نظام کے ماتحت سرمایہ، مبادلہ کے ذریعہ سے ہی منفعت بخش بن سکتا ہے، لہٰذا وسیلۂ مبادلہ کی قلت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ مبادلات کی سرگرمی رخصت ہوجائے گی جس کی وجہ سے پیداوار کم ہوجائے گی، اور یہ ایک ایسا امر ہے جو ہمارے مادی تمدن کا معیار پست کردیگا۔

لیکن یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سونے کے علاوہ دوسرے ذرائع مبادلہ موجود نہ ہوتے تو یہ خطرات حق بجانب تھے، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ہر ملک میں سونے کے علاوہ مختلف قسم کے نوٹ بھی رائج ہیں اسی طرح اور ذرائع بھی ہیں جو ادائے قرضہ جات میں استعمال کئے جاتے ہیں اور نقدی کے استعمال سے (خواہ وہ معدنی سکوں کی صورت میں ہو یا تمسکات کی صورت میں) بے نیاز کردیتے ہیں۔ مثلاً چک اور ہنڈیاں اور دوسرے ذرائع جنہیں بنک بطور معاوضہ استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اندازہ کیا گیا ہے کہ جن ملکوں میں سونا نقدی کے نظام کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے وہاں ہر ۱۰۰ فرانک سونے کے مقابلے میں ۶۰۰ یا ۷۰۰ فرانک دوسرے نقدی وسائل مستعمل ہوتے ہیں جن کی بنیاد اس سونے پر قائم ہوتی ہے ۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۰ء تک ان ذرائع کا استعمال نہایت کثرت سے رائج رہا، اور اس طرح گویا دنیا کے نقد سونے کی مقدار میں عظیم الشان اضافہ ہوگیا۔

یہ اصول اپنی جگہ پر بالکل درست ہوتا اگر ایک دوسری وجہ پیدا نہ ہوتی جس نے اس زیادتی کے اثر کو کالعدم یا کم از کم خفیف کردیا ہے یعنی ۱۸۵۰ء میں ایسے ملکوں کی تعداد بہت کم تھی جو طلائی سکے کے نظام پر کاربند تھے لیکن ۱۹۱۰ء تک ان ملکوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا چنانچہ پرتگال، جرمنی، اسکنڈینیویا (سویڈن، ناروے) مصر، رومانیا، آسٹریا، ہنگری، جاپان، پیرو اور سیام وغیرہ ممالک نے اس درمیان میں طلائی سکے کا نظام اختیار کرلیا، نیز بعض ممالک مثلاً ہندوستان نے نقرئی سکے کے یکرنگ نظام کو دوعملی نظام میں تبدیل کردیا یعنی طلائی و نقرئی مسکوکات مساویانہ طور پر نقود رئیسی میں شمار ہونے لگے۔ ان میں سے ہر ایک کا طلائی نظام نقدی اختیار کرنا سونے کی طلب میں ایک جدید اضافہ کا موجب بنتا رہا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۵۰ء اور ۱۹۱۰ء کی متعینہ مدت میں موثرات نقدیہ نرخوں پر متضاد اثر ڈال رہے تھے، ایک حیثیت سے ہم دیکھتے ہیں کہ تمسکات اور ادائے قرض کے دوسرے وسائل کا رواج گویا سونے کی مقدار میں ایک قسم کا اضافہ تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ نرخ گراں ہوجاتے۔ دوسری حیثیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ممالک سونے کو اپنے سکے کی اساس قرار دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے سونے کی طلب میں اضافہ ہوکر اس کی قیمت بڑھ جانی چاہئے یعنی عام طور پر نرخ گرجانے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ جو ماہرین اقتصادیات یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اس مدت میں تمام دنیا میں نقدی سونے کی مقدار ۲.۸ یا ۳ فیصدی سالانہ کی نسبت سے زیادہ ہوگئی جیسا کہ بیان کیا گیا ——— اور اسی کو مدت مذکورہ میں اقتصادی ترقی کا معیار بھی

قرار دینے میں وہ ضمناً تسلیم کرتے ہیں کہ متذکرہ بالا ہر دو موثرات کی تاثیر ایک دوسرے کے مساوی تھی!

اب ہم ۱۹۱۴ء تک پہنچتے ہیں اس لئے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ یہ مسئلہ جنگِ عظیم کے زیرِ اثر کیونکر انقلاب پذیر ہوا۔ یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ اس جنگ کے شرارے دو اقتصادی مظاہر کی وجہ سے بھڑکے تھے۔

(۱) پیداوار و مبادلہ کی کمی یا دوسرے لفظوں میں اقتصادی گرم بازاری کا ضعف۔

(۲) برسرِ پیکار حکومتوں کا سونے کے خالص نظامِ مسکوکات سے روگردانی کر کے کاغذی نقود کا الزامی نظام اختیار کر لینا (جو خود کوئی قیمت نہیں رکھتے) بعض مخصوص ممالک کے علاوہ کوئی ملک اس لعنت سے محفوظ نہ تھا، ممالکِ متحدہ امریکہ بھی انہی ممالک میں شامل ہے جنہوں نے اپنے طلائی نظامِ مسکوکات کو برقرار رکھا۔ اور اسی وجہ سے اس کے پاس سونے کے عظیم الشان ذخائر جمع ہو گئے۔ یہ دو مظاہر تھے جنہوں نے نرخوں کو عام طور پر گراں کر دیا تھا، یہاں تک کہ بعض مواقع پر ان کا تناسب ۲۰۰ تک پہنچ گیا اور یہ اُس وقت ہوا جب پیداوار کا اوسط انتہائی پست ہو گیا، پھر ردِ عمل کے طور پر اس کے برعکس جب پیداوار میں اضافہ ہونے لگا۔ کاغذی نقدی کا الزامی نظام تمام زمانۂ جنگ اور اس کے بعد چند سال تک قائم رہا، اس سے خطرناک اقتصادی اور اجتماعی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ کیونکہ ایک طرف تو کاغذی اعتباری نقدی کی قیمت گر گئی اور پھر اس قیمت میں بھی استقلال مفقود ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں جنیوا میں باخبر ماہرینِ مالیات کا ایک اجتماع اس غرض سے منعقد ہوا کہ اس صورتِ حال کے علاج کا بہترین طریقہ دریافت کیا جا سکے۔ ان سب نے بالاتفاق اس کی کامیاب دوا یہی تجویز کی کہ طلائی نظامِ نقدی کی جانب رجوع کیا جائے۔ مختلف حکومتوں نے اس رائے کو فوراً قبول کر لیا اور ۱۹۲۶ء تک کرۂ زمین کی ۶۰ فیصدی آبادی سونے کو بطورِ اساسِ تعاملی استعمال کرنے لگی۔ یہ معاملہ صرف اُن ممالک تک محدود نہیں رہا جو جنگ سے پہلے سونے کے تنہا معدنی نظام پر چل رہے تھے بلکہ جو ممالک دو عملی نظام یا چاندی کے تنہا معدنی نظام کو اختیار کئے ہوئے تھے انہوں نے بھی گزشتہ نظام ترک کر کے طلائی نظامِ نقدی کو قبول کر لیا اور اس کا امکان اس طرح پیدا ہو گیا کہ نقد سونے کو بڑے بڑے بنکوں کے خزائن میں روک لیا گیا اور داخلی داد و ستد کی ضروریات دوسرے نقدی وسائل سے پوری کر دی گئیں جن کی بنیاد اس سونے پر قائم ہوئی تھی لیکن اس کا تناسب ۶۰۰ یا ۷۰۰ فیصدی تھا! یہ امر اس موازنہ سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں ۴۵ فیصدی نقد سونا لوگوں کے عام استعمال میں تھا اور ۵۵ فیصدی مرکزی بنکوں میں محفوظ تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اول الذکر مقدار کی نسبت ۸ فیصدی اور ثانی الذکر کی ۹۲ فیصدی ہو گئی۔ اس طرح کسی حد تک اُن مشکلات پر قابو پا لیا گیا جو نقد سونے کی کم مقداری سے پیدا ہو رہی تھیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ بعض اُن ممالک نے جو سونے کے لحاظ سے مفلس تھے اپنے محفوظ طلائی سرمایہ کے ضمن میں (جو کاغذی نقدی کی ضمانت کے طور پر رکھا جاتا ہے) دوسرے اُن ممالک کے سکے بھی نقد سونے

کی حیثیت سے استعمال کئے، جہاں طلائی نظامِ نقدی رائج تھا - ماہرینِ خصوصی کی رائے ہے کہ اس طریقہ کا اتباع کر کے داخلی داد وستد
میں طلائی نقود کے استعمال سے پرہیز نہ کیا جاتا تو مختلف ممالک میں طلائی نظامِ نقدی کا تتبع خطرناک اقتصادی حادثہ تک پہنچا دیتا۔

اس کے باوجود آج کل اکثر ممالک جس اقتصادی سرد بازاری کی تباہیوں سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد
تک جنگِ عظیم کے بعد طلائی نظامِ نقدی کے رواج پر عاید کی جاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں جمعیۃ الاقوام کی اقتصادی سب کمیٹی
کے صدر مسٹر لوڈے (Loveday) کے قیمتی بیانات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے مجموعی
وسائلِ نقدیہ، روس اور بعض چھوٹے ممالک کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد ۱۹۲۸ء میں ۱۹۱۳ء کی بہ نسبت دوچند ہو گئے، یعنی تقریباً ۲۰۰
فیصدی، درآنحالیکہ ۱۹۲۸ء میں نرخوں کا معیار ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں صرف ۵۰ فیصدی زیادہ ہوا۔ یعنی اگر یہ معیار ۱۹۱۳ء
میں ۱۰۰ تھا تو ۱۹۲۸ء میں ۱۵۰ ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۲۰۰ اور ۱۵۰ کا فرق اُن جدید نقدی وسائل کی مقدار کو بتاتا ہے جنہیں
اس مدت میں پیداوار و مبادلہ کے اضافہ کے بالمقابل ایجاد کر لیا گیا ہے، اس فرق کا اوسط ۲ فیصدی سالانہ ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں
کہ اس مدت میں صنعت و حرفت نے کس قدر ترقی کر لی ہے اور اعداد و شمار ہمیں بتاتے ہیں کہ عام پیداوار کے فروغ میں کس قدر
عظیم اضافہ ہو چکا ہے تو ہم پر واضح ہوتا ہے کہ نقدی وسائل کی دو فیصدی کے اوسط سے زیادتی بہت ہی معمولی زیادتی ہے جو
اقتصادی ترقی کے لئے کوئی نسبت نہیں رکھتی اور اس طرح نقدی اضافہ اور اس ترقی میں تباین واقع ہو گیا ہے۔ یہ تباین
عام اقتصادی مشکلات کا یا صحیح لفظوں میں موجودہ اقتصادی سرد بازاری کا بہت بڑا سبب[1] ہے۔ کیونکہ عملی دنیا میں وسائلِ
نقدیہ کی عدمِ کفایت کمیِ مبادلات اور پھر کمیِ استعمال تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ
دونوں کا توازن عود کر آئے۔ لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک نرخ اس قدر نہ گر جائیں کہ بعض عاملین کو شکست
دے کر پیدائش سے دستبرداری پر مجبور کر دیں اور بقیہ کو تقلیلِ پیدائش پر آمادہ کر دیں، اور یہی موجودہ سرد بازاری اور عام مشکلات
کی علامات ہیں۔ آج کل ماہرینِ اقتصادیات اس امر سے بہت پریشان ہیں کہ چین طلائی نظامِ نقدی کا تتبع کرنا چاہتا ہے جیسا
کہ وہاں کے بعض ذمہ دار اصحاب کے خیالات سے پتہ چل سکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسرے ممالک میں سونے کی
قلت بڑھ جائے گی۔ روس کی پنج سالہ اسکیم بھی ماہرینِ اقتصادیات کو خوفزدہ کئے ہوئے ہے جس کا منشا یہ ہے کہ روسی

---

[1] "عام اقتصادی مشکلات" کی اصطلاح سے وہ اضطراب مراد لیا جاتا ہے جو اقتصادی توازن پر اچانک طاری ہو جاتے ہیں۔ اور
یہی وہ نقطہ ہوتا ہے جہاں سابقہ سرگرمی اور پیدا شدہ سرد بازاری کی حدود ملتی ہیں۔ آخری عام اقتصادی مشکلات اکتوبر ۱۹۲۹ء
میں ممالکِ متحدہ امریکہ سے شروع ہو کر دوسرے تمام ممالک پر چھا گئیں اور اس کے نتیجے میں موجودہ سرد بازاری کا عہد
رونما ہوا۔

پیداوار سے خارجی بازاروں کو پاٹ دے۔ کیونکہ اس کا یہ اثر ہوگا کہ وہاں سونا جمع ہو جائے گا اور دوسرے ممالک میں اس کی مقدار اور بھی کم ہو جائے گی۔

ماہرینِ خصوصی جنہوں نے سونے کے مسئلے پر بہت غور سے نظر ڈالی ہے ایسی تجاویز پیش کرنے سے غافل نہیں رہے جو سونے کی قلت سے پیدا ہونے والی مشکلات میں تخفیف کر سکیں۔ مثلاً جمعیۃ الاقوام کی مالی کمیٹی نے اس موضوع پر غور کرنے کے بعد بعض مفید تجاویز پیش کی ہیں جن میں سے صرف دو تجویزیں ہم یہاں ذکر کریں گے۔

(۱) پہلی تجویز یہ ہے کہ جس طرح بعض بنک اپنے احتیاطی طلائی سرمایہ کے ضمن میں اُن غیر معمولی تمسکات کو بھی شامل کر لیتے ہیں جو سونے یا اور نقودِ رئیسیہ کی ہم قیمت تصور کی جاتی ہیں، اسی طرح یہ طریقہ عام کر دیا جائے۔ لیکن اس طریقے کی عمومیت میں یہ قوی احساس حائل ہوتا ہے کہ اس سے قومی وقار کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اسی لئے دیکھا گیا ہے کہ بعض وہ ممالک جو اس طریقہ پر عمل کرتے تھے اسے چھوڑ کر اسی جانب رجوع کر رہے ہیں کہ تمام محفوظ سرمایہ سونے پر مشتمل ہونا چاہئے۔

(۲) دوسری تجویز یہ ہے کہ احتیاطی سونے اور متداول تمسکات کے درمیان مقررہ نسبت گھٹا دی جائے۔ عموماً یہ نسبت ۳۳ ⅓ فیصدی ہوتی ہے۔ لیکن اکثر بڑے بنک اسے ۴۰ فیصدی بلکہ ۵۰ فیصدی تک بڑھا دیتے ہیں تاکہ اُن کے نقدی وسائل میں زیادہ ساکھ پیدا ہو جائے۔ اس طریقہ پر ماہرینِ اقتصادیات سخت تنقید کرتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ یہ احتیاطی سونا بنک کی تجوریوں میں بے کار پڑا رہتا ہے۔ حالانکہ مالی بازار کو اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جمعیۃ الاقوام کی مالی کمیٹی کی رپورٹ میں بھی اس احتجاج کی صدائے بازگشت گونجتی ہے، اور اس میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ احتیاطی سونے کی کم سے کم مقدار متعین کر کے اسے محفوظ رکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمسکات کی ساکھ قائم رہے۔ کیونکہ وہ ان معاملات میں شامل نہیں ہے جن میں سونا استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، یقینی ہے کہ اس معیار کو گھٹا کر زیرِ ضمانت تمسکات کی قیمت پر کوئی خراب اثر ڈالے بغیر سونے میں بڑی کفایت شعاری کی جا سکتی ہے۔

اس کے ساتھ اس رپورٹ میں یہ اہم نوٹ بھی ملتا ہے کہ چونکہ مذکورہ بالا نسبت کے ساتھ احتیاطی سونے کی تعیین بڑی حد تک مختلف ملکوں کے باہمی اعتماد اور تعاون پر منحصر ہے اس لئے اگر کوئی ایک ملک اس نسبت کو گھٹائے تو اُس کے مالی تمسکات کی ساکھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس پر اقدام کرنے سے قبل ضروری ہے کہ حکومتوں کے درمیان اس خاص مسئلہ میں ایک معاہدہ مرتب کر لیا جائے۔ یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ اس معاہدے کی راہ میں زیادہ دشواریاں حائل ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ ہم مستقبل قریب میں ایک بین الاقوامی مؤتمر کے انعقاد کی خبر سنیں جو خاص طور پر دنیا کے بڑے بڑے بنکوں میں احتیاطی سونے کے معیار کو گھٹانے کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے منعقد ہو!

۴۔ مختلف ممالک کے درمیان نقد سونے کی ناقص تقسیم

اور موجودہ مشکلات کے ساتھ اُس کا تعلق

تمام اقتصادیین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آج کل سونا مختلف ممالک کے درمیان غیر منصفانہ طریقہ پر تقسیم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے نقدی ذرائع بھی نامناسب طور پر تقسیم ہوگئے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ طلائی نظام والے ممالک میں نقدی وسائل کی مقدار مضبوطی کے ساتھ سونے کی مقدار سے وابستہ ہے۔ موجودہ دور میں نقدی وسائل کی ناقص تقسیم پر مشہور ماہرِ خصوصی مسٹر لوڈے کی اس رپورٹ سے زیادہ کوئی چیز روشنی نہیں ڈالتی جو جمعیۃ الاقوام میں پیش کی گئی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۸ء کے مابین مختلف نقدی وسائل کے اضافہ کا اندازہ لگانے سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۱۳ء کے نقدی وسائل کی مقدار کے مقابلے میں فیصدی نسبت سے درج کئے گئے ہیں۔

نمبر شمار	نام ملک	۱۹۲۸ء کے نقدی وسائل کی مقدار	
۱	یورپ (باستثنا روس و بعض ممالکِ صغیرہ)	۱۶۳٫۶	فیصدی
۲	شمالی امریکہ	۲۷۳٫۳	"
۳	جنوبی امریکہ	۲۱۳	"
۴	جنوبی افریقہ اور بحری آبادیاں	۱۰۳	"
۵	تمام دنیا کا اوسط	۲۱۳٫۶	"

ان اعداد و شمار میں دو چیزیں زیادہ جاذبِ توجہ ہیں :-

(۱) اول یہ کہ اگرچہ یورپ میں نقدی وسائل ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۸ء کی درمیانی مدت میں سو سے ۱۶۳٫۶ تک پہنچ گئے ہیں لیکن ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ اس مدت میں نرخوں کا معیار ۱۰۰ سے ۱۵۰ تک ترقی کر چکا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۲۸ء میں مختلف مصنوعات کی کثرت اور ثقالت ان کی ادائی کے لئے نقدی کی بہت بڑی مقدار استعمال کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ ۱۹۲۸ء میں یورپ کے پاس ۱۹۱۳ء کی طرح اسی قدر نقدی وسائل موجود تھے جو محض مبادلات کے لئے بمشکل کافی ہو سکتے باوجودیکہ اس وقفہ میں صنعت و تجارت کی ترقی کا اقتضا یہ تھا کہ نقدی وسائل کی زیادہ سے زیادہ مقدار استعمال کی جاتی۔ اسی لئے یورپ بحیثیت مجموعی آج کل نقدی افلاس کی مصیبت میں مبتلا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ۱۹۲۸ء میں شمالی امریکہ فارغ البالی کے اس درجہ تک پہنچ گیا جس کی اس سے قبل کوئی مثال نہیں ملتی چنانچہ اگر ۱۹۱۳ء میں اس کے نقدی وسائل کی مقدار ۱۰۰ تھی تو ۱۹۲۸ء میں بڑھ کر ۲۷۳٫۳ ہو گئی۔ یہ امر اس کی اقتصادی سرگرمی کا ثبوت ہے اگرچہ یہی اس سرگرمی کی وجہ بھی ظاہر کرتا ہے۔

اگر دنیا کے صرف نقد سونے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۲۸ء میں اس کا نصف دو ملکوں ہی جمع تھا: ممالکِ متحدہ امریکہ اور فرانس۔ اس کے بعد معاملہ اور زیادہ خطرناک ہوگیا کیونکہ آج کل انہی دونوں ملکوں میں تمام سونے کے ۳/۵ حصے سے زیادہ جمع ہوگیا ہے؛ ۲/۵ ممالکِ متحدہ میں اور ۱/۵ فرانس میں حالانکہ ممالکِ متحدہ اور فرانس کو اپنی نقدی ضروریات کے لئے اس مقدار کی حاجت نہ تھی۔ اسی لئے اس کا بڑا حصہ خزائن میں معطل پڑا ہے ماہرینِ خصوصی کی رائے ہے کہ ممالکِ متحدہ کے مرکزی بنک فیڈرل ریزرو بورڈ (Federal Reserve Board) کے مجتمعہ سونے کا ۱/۳ حصہ اور بنک آف فرانس کے احتیاطی سونے کا ۲/۵ حصہ کسی مصرف میں نہیں آتا، حالانکہ دوسرے ممالک کو نقد سونے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال ہے اور مالی حلقوں میں اسے نہایت درجہ قابلِ ملامت تصور کیا جاتا ہے۔ فرانس خاص طور پر اپنے ہمسایہ ممالک کی جانب سے شدید صحافتی حملوں کا مورد بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اگرچہ ممالکِ متحدہ کے پاس فرانس سے دو چند سونا موجود ہے لیکن اس کی مادی ثروت فرانس سے بدرجہا زیادہ ہے، نیز اس کی صنعت و زراعت زیادہ نتیجہ بخش اور اس کی آبادی فرانس کی آبادی سے سہ چند ہے!

موجودہ غیر معمولی صورتِ حال کا صحیح تصور قائم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار کا معائنہ کرنا چاہئیے:۔

فرانس میں ہر فرد کے مقابلے میں ۱۳۰۰ طلائی فرانک، ممالکِ متحدہ میں ۸۰۰، انگلستان میں ۴۰۰ سے کم، جرمنی اور اطالیہ میں ۲۰۰ سے کم اور اکثر دوسرے مغربی ممالک میں اس سے بھی کم پڑتے ہیں۔ مشرقی ممالک اور بالخصوص ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا جہاں کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہونے ہیں ۱۹۲۶ء تا ابتدائے ۱۹۳۰ء چار سال کی مدت میں فرانس کے اندر سونے کی مقدار دو چند ہوگئی حالانکہ اس کی وہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ بعض ماہرینِ اقتصادیات نے اندازہ کیا ہے کہ ہر ۱۰۰ طلائی فرانک جو فرانس میں داخل ہوتے ہیں دوسرے ممالک کے ۷۰۰ یا ۸۰۰ فرانک کے نقدی وسائل کو بیکار کر دیتے ہیں، درانحالیکہ وہ فرانس میں صرف ۲۰۰ یا ۳۰۰ فرانک کے وسائلِ نقدیہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ فرانس میں ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۰ء کی درمیانی مدت میں ۲۶ ملیار طلائی فرانک کے داخلے نے دنیا کے تقریباً ۱۴۰ ملیار فرانک کے نقدی وسائل کو جو اس مقدار پر مبنی ہوتے مفقود کر دیا، یعنی مجموعی حیثیت سے تقریباً ۹ فیصدی!

فرانس میں سونے کی اس عظیم الشان مقدار کی درآمد کا سبب موسیو پوانکارے کی وہ مالی حکمتِ عملی ہے جس پر انہوں نے ۱۹۲۶ء میں عمل درآمد شروع کیا تھا جب کہ فرانسی فرانک کا نرخ قائم کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے یکبارگی قانونی طور پر نرخ قائم نہیں کیا بلکہ اس سے بہتر ایک طویل مہلت دی جس کے دوران میں فرانک کی نرخ کی بہتری کے لئے متواتر کام ہوتا رہا۔ اس امر نے بیرونی سرمایہ داروں کو لالچ میں ڈال دیا اور وہ خطرۂ عظیم کا احساس کئے بغیر فرانک کی قیمت بڑھانے میں مصروفِ مقابلہ رہے۔ موسیو پوانکارے کے سر برآرائے حکومت ہونے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جو اطمینان اور اعتماد پیدا ہوگیا تھا اس نے اس فرانسی سرمایہ کا غالب حصہ واپس لوٹانے میں بڑی امداد کی جو سابقہ وزارتوں کے عہد میں ممالکِ غیر میں چلا گیا تھا۔ اس طرح بنک آف فرانس کے نزدیک دوسرے ممالک کے تمسکات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا جو عند الطلب سونے کی صورت میں تبدیل ہو سکتا تھا۔ بنک آف فرانس نے ان تمسکات کو سرعت کے ساتھ سونے کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے سونے کی مقدار اس کے

خزائن میں زیادہ اور دوسرے ممالک کے خزائن میں کم ہوگئی۔ ۲۵ جون ۱۹۲۸ء کو قانونی طور پر فرانک کا نرخ قائم ہوگیا۔ اس کے بعد انتظار تھا کہ وہ بیرونی سرمایہ جو مقابلے کے سلسلے میں وہاں داخل ہوگیا تھا فرانس سے نکل آئے گا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہوا۔ کیونکہ اکثر ممالک میں سیاسی و مالی اضطراب پھیلنے اور اقتصادی مشکلات واقع ہونے کی وجہ سے اس سرمایہ کو فرانس ہی میں رکھنا مناسب سمجھا گیا۔ بلکہ جدید بیرونی سرمایہ بھی سمٹ کر وہیں آگیا کیونکہ اُس کے اصلی ممالک میں اطمینان و اعتماد کا فقدان تھا۔ جب سے انگریزی پونڈ کی قیمت گری ہے اس حرکت میں شدت سے اضافہ ہوگیا ہے اور اس طرح بنک آف فرانس کی تجوریوں میں مسلسل سونے کا انبار لگتا جا رہا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ سے انگلستان نے بھی اسی پالیسی پر عمل درآمد شروع کردیا ہے چنانچہ مسٹر میکڈانلڈ کی نیشنل گورنمنٹ (قومی حکومت) قائم ہونے کے بعد سے انگلستان میں سونے کی درآمد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ عنقریب یہاں بھی وہی تمام واقعات اپنے آپ کو دہرائینگے جو فرانس میں رونما ہوچکے ہیں۔ لیکن اس طرح اگرچہ انگلستان کی ساکھ قائم ہوجائیگی اور پونڈ کی قیمت میں استقلال پیدا ہوجائے گا مگر دنیا کی اقتصادی بے چینی میں کمی ہونے کے بجائے شاید اس طریق کار سے اضافہ ہی ہوجائے!

عمومی حیثیت سے یہ منظر ——— یعنی مذکورہ بالا طریقہ پر سونے کی تقسیم کا منظر ——— موجودہ اقتصادی نظام کا بدترین عیب سمجھا جاتا ہے کیونکہ دو ملکوں کا جن کی آبادی زیادہ سے زیادہ ۱۶۰ ملین ہے، دنیا کے نقد سونے کے ۳/۵ حصہ پر مالکانہ قبضہ جما لینے کے یہ معنی ہوتے کہ دوسرے ممالک کو جن کی آبادی کم از کم ۰۰۰ ملین ہے قوتِ خرید کے بڑے جزو سے محروم کردیا گیا جس کی وجہ سے ان کی حالت نہایت ہی ابتر اور قابلِ رحم ہوگئی۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر اس کا کوئی کامیاب حل تلاش نہ کیا گیا تو بین الاقوامی آویزش پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے جس سے دنیا کا امن و امان فنا ہوکر رہ جائے گا۔ یہاں اُس ہٹ دھرمی کی جانب بھی اشارہ کردینا چاہئے جو امریکہ کی جانب سے قرضہ جنگ کے سلسلے میں حلفا کے ساتھ روا رکھی جارہی ہے۔ کیونکہ اس کا مطالبہ ہے کہ اس کو اس کے قرضہ کی اقساط مع سود کے سونے کی شکل میں ادا ہونی چاہئیں نہ کہ اسبابِ تجارت کی شکل میں۔ باوجودیکہ اُس کے پاس فی الوقت جو سونا جمع ہے وہ اس کی ضروریات سے زیادہ ہے اس بنا پر بعض اقتصادیین دولِ یورپ کے سامنے یہ تجویز کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ سونے کو اپنے سکے کی بنیاد قرار دینے کا اصول ترک کردیں اور ان کے بنکوں میں جو سونا جمع ہے وہ امریکہ کے حوالے کردیں۔ اس طرح اُن کے سر سے بھی قرض کا بوجھ اتر جائے گا اور قرض خواہ کو بھی بے رحمی کا کافی معاوضہ مل جائیگا۔ کیونکہ امریکہ ڈر رہا ہے کہ مجوزہ طلائی ذخیرہ وہاں منتقل ہوجانے کے ساتھ اس کی قیمت غیر معمولی طور پر گر جائے گی۔ اس لئے کہ صرف امریکی ملکوں میں اس کی کثرت ہوگی اور دوسرے ممالک اسے نقدی ضروریات میں استعمال کرنے سے دستکش ہوجائینگے۔

باقی رہا فرانس تو ماہرینِ اقتصادیات و سیاسیات اس کا یہ جرم کبھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ اُس کے خزائن میں جمع شدہ سونے کا نصف تقریباً بیکار محض پڑا ہوا ہے۔ گویا مشہور انگریز ماہر مالیات مکینا (Mackenna) کے مقولہ کے مطابق اس کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے وہ بھی

کانوں سے برآمد ہی نہیں ہوا۔ فرانس کے بعض ذمہ دار اشخاص اُن خطرات کا احساس کرنے لگے ہیں جو اُن کے ملک پر سونے کے مسئلے کے سلسلے میں منڈلا رہے ہیں۔ فرانس کے بعض مالی حلقوں میں اس جانب بھی رغبت کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ سونے کی ایک مقدار دوسرے ملکوں کے مرکزی بنکوں کو مقررہ شرحِ سود پر قرض دے دی جائے۔ حکومتِ فرانس چند مواقع پر اس تجویز کو عملی جامہ بھی پہنا چکی ہے مثلاً جب حکومتِ برطانیہ نے انگریزی پونڈ کی ساکھ کو مضبوط رکھنے کے لئے گذشتہ سے پیوستہ موسمِ گرما میں اس کی امداد طلب کی تو اُس نے حکومتِ ممالکِ متحدہ کے اشتراکِ عمل سے یہ قبول کر لیا کہ بنک آف انگلینڈ کے لئے سونے کی ذمہ داری کا کھاتہ کھول دے۔ ایسا دو مرتبہ کیا گیا۔ پہلی بار جولائی ۱۹۳۱ء میں، اور ذمہ داری کی مقدار ۲۵ ملین انگریزی پونڈ تھی، اور دوسری بار اگست ۱۹۳۱ء کے آخر میں، اور ذمہ داری کی مقدار ۸۰ ملین پونڈ تھی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور بنک آف انگلینڈ نے دونوں ذمہ داریوں کو تیزی کے ساتھ ختم کر دیا جب اُسے یقین ہو گیا کہ اس کا سونے کا ذخیرہ بیک وقت تمسکات کی ذمہ داری لینے اور حکومتی حسابات کی ادائی کے لئے ناکافی ہے تو ۲۸ اپریل ۱۹۲۵ء والے قانون پر عمل درآمد ملتوی کرنے کا فیصلہ شائع کر دیا گیا۔ اس قانون کے مطابق بنک آف انگلینڈ پر لازم تھا کہ جو شخص باہر سونا بھیجنا چاہے اُس کے لئے سونا مہیا کرے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ معاملاتِ خارجہ میں انگریزی پونڈ کے نوٹوں کو سونے کی صورت میں تبدیل کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور الزامی کاغذی نقدی نظام کی جانب رجوع کر لیا گیا جو ۱۹۲۵ء تک موجود تھا۔ اس واقعہ نے تمام دنیا میں شدید ردِ عمل برپا کر دیا جس کا فرانس کے مالی بازار پر بہت ناگوار اثر پڑا اور ماہرینِ اقتصادیات کا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے فرانس کو اور بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بیرونی مرکزی بنکوں کو قرض دینے کے نظریہ کے ساتھ فرانس میں ایک تحریک اور پھیل رہی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ فرانسی سرمایہ کو غیر ملکی کاروبار میں لگایا جائے کیونکہ اس سرمایہ کی کثرتِ برآمد کا یہ نتیجہ ہوگا کہ فرانس سے سونے کا کچھ ذخیرہ باہر جانے لگے گا۔ مگر موجودہ حالت میں جب کہ ممالکِ غیر کے اقتصادی حالات خراب ہو رہے ہیں اہلِ فرانس وہاں اپنا سرمایہ لگانے پر تیار نہیں ہوتے۔

لیکن صرف یہ امور سونے کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں بلکہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس مسئلے پر ہر پہلو سے غور کرنے اور اس کے متعلق فیصلہ کن اور عملی تجاویز مرتب کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی موتمر منعقد کی جائے۔ ورنہ وہ دن عنقریب آنے والا ہے جب انسان سونے کی غلامی برداشت کرنے کے قابل نہ رہے گا اور طوقِ لعنت سے اپنی گلو خلاصی کر لے گا۔ خصوصاً اس لئے کہ وہ حیاتِ انسانی کے لئے کوئی لازمی چیز نہیں ہے اور اس کا استعمال صرف ایک بد "طلائی معاہدہ عمرانی" کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ لوگوں نے زمانہ دراز سے اسے اپنا ذریعہ مبادلہ بنا لینے پر عملاً اتفاق کر لیا تھا اور انسان کو حق حاصل ہے کہ جب اس کی قیود ناقابلِ برداشت ہو جائیں تو معاہدے کو فسخ کر دے لیکن ہم فلاسفہ سے سوال کر سکتے ہیں کہ:۔

"انسان اُن قوانین کی غلامی سے کب تک نجات حاصل کر سکے گا جنہیں اُس نے اپنی مرضی سے اپنے سر پر مسلط کر لیا ہے ——؟"

منظور سروش (بھوپالی)

کیا آپ کو معلوم ہے

آرتھر شوپنہاور کہتا ہے:۔ زندہ رہنے کی خواہش ترک کردو! اس دنیا میں خوشی، اس زندگی میں امید ایک جرم ہے!

ابیقور کے اُن چند اقوال میں سے جو ہم تک پہنچے ہیں ایک یہ ہے:۔
کم از کم مجھے معلوم نہیں کہ نیکی کے معنی ماکولات کی لذتوں، دل کی خواہشوں اور ایسی مسرتوں کے سوا جو حسِ سامعہ اور حسِ باصرہ کے ذریعے سے ہمیں حاصل ہوتی ہیں کچھ اور بھی ہوسکتے ہیں۔

امانوئل کانٹ کا خیال ہے کہ نیکی کی منزل ہمیں صرف دوسرے جہان میں مل سکتی ہے۔

نکولاس میل برانچ کو یقین تھا کہ خدا نے اس دنیا کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ کھیلنے کے لئے کوئی چیز ہو +

جوہن فشٹے کی تحقیقات یہ ہے کہ صحیح الدماغ عورتوں میں جنسی جذبات مفقود ہوتے ہیں، لیکن ایسی عورتیں موجود نہیں ہیں۔

فریڈرک ہیگل کی تعلیم ہے کہ مملکت خدا کی مشیت ہے لیکن صرف اُس وقت جب وہ کسی حاکم کے ہاتھ میں ہو۔ حاکم کے بغیر مملکت یعنی جمہوریت مملکت نہیں بلکہ ایک منتشر انبوہ ہے۔

جبریہ میانہ روی سے قطعاً ناواقف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یا تو انسان فلسفی اور حکیم ہو سکتا ہے یا پھر بالکل احمق!

زینو کا ایک شاگرد ارسطان علوم کو اس قدر غیر اہم سمجھتا تھا کہ ایک دفعہ اس نے کہا: منطق کا ہم سے کچھ تعلق نہیں اور طبیعیات ہمارے احاطۂ خیال سے باہر ہے۔

منصور احمد

معصوم فلسفی

ننھے نسیم کو کسی نے بالکل چھوٹی سی عمر میں یقین دلا دیا تھا کہ آسمان پر جتنے تارے ہیں اتنے ہی دنیا میں آدمی بھی ہیں۔ ہر ایک کی قسمت کا تعلق کسی نہ کسی تارے سے ضرور ہے۔

اساڑھ کی ایک رات میں جب کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے کے بعد آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہیں باقی رہا تھا اور آسمان چمکدار اور ننھے تاروں سے لدا پڑا تھا۔ ننھا نسیم اپنی ماں کے ہاتھ پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے بعد اپنے مخصوص بھولے انداز میں اپنی ماں سے بولا:-

"اماں! اس میں میری قسمت کا کون سا تارا ہے"

ماں پہلے اس بھولے سوال پر ہنسی۔ نرم اور نازک گالوں کو ہاتھ سے پکڑ کر چوما اور انگلی اٹھا کر کہنے لگی کہ دیکھو میرے لال وہ تارا جو سب میں زیادہ چمکدار ہے تمہاری قسمت کا ہے" بھولا نسیم ماں کی یہ بات سنکر بیحد خوش ہوا۔ ماں نے اسے اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔ نسیم تھوڑی دیر میں سو گیا۔

برسات ختم ہو گئی۔ جاڑے آئے۔ بھولا اور خوبصورت نسیم اپنی قسمت کے متعلق اور کچھ نہ سوچ سکا۔ دوسرے سال پھر اسی زمانے میں معصوم نجومی نے اپنی ماں سے وہی سوال کیا اور اسکی ماں نے اُسے اپنے کلیجے سے لگا کر جواب دیا کہ

"میرے چاند۔ دیکھو وہ تارا جو سب میں زیادہ چمکدار ہے، تمہاری قسمت کا ہے"

معصوم نسیم مطمئن ہو گیا۔ اس کے خیال میں اُس کی ماں دنیا میں سب سے زیادہ سچی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی ماں دنیا کی ہر چیز کے متعلق سچی خبر دے سکتی ہے۔

حسین نسیم بارہ برس کا ہو گیا۔ اُس کی ماں اُس سے ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ "میرے لال وہ تارا جو سب میں زیادہ چمکدار ہے تمہاری قسمت کا ہے"

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ نسیم کی ماں کو بیمار ہوئے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ بھولا نسیم اُس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اُس کی یہ تمنا تھی کہ اُس کی ماں آج اس سے کچھ بولے۔ اُس نے آہستہ سے کہا "اماں" — ماں بے ہوشی سے ایک دم چونک پڑی اور بے ساختگی کے ساتھ اُس کے منہ سے نکل گیا کہ۔

"ہاں میرے لال وہ تارا جو سب میں زیادہ چمکدار ہے تمہاری قسمت کا ہے"

نسیم کی ماں کی حالت خراب ہوتی گئی۔ جینے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے جس وقت وہ دم توڑ رہی تھی حسین نسیم نے اپنی ماں کے منہ پر منہ رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "پیاری اماں مجھے بتا دو کہ میری قسمت کا تارا کون سا ہے"

اس مرتبہ ماں کی خاموشی اور اس کے آنسوؤں کے تار نے جواب دیا کہ:-

"چھوٹے فلسفی تیری قسمت کا ستارا دنیا میں سب سے زیادہ ماند ہے"

سیّد وقار عظیم

آزردگیٔ شوق

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی (غالب)

تجھے یقینِ محبت نہیں قیامت ہے
یہ رنگ لائیں مری سرگرانیاں توبہ

تجھے عبورِ حقیقت نہیں مصیبت ہے
یہ بیدلی یہ تری بدگمانیاں توبہ

یہ سمجھی تو مرے اندازِ سرگرانی سے
کہ اِس کا دل نہیں لذت شناسِ اُلفت کا

یہ جانا تُو نے مری بیہُودہ بیانی سے
کہ اِس کے دل میں نہیں کوئی پاسِ اُلفت کا

وفا سے جان لیا تُو نے نابلد مجھ کو
تجھے خبر ہی نہیں شیوۂ جنوں کیا ہے

نہیں ہے رمزِ محبت سے آگہی تجھ کو
جو اِذن ہو تو میں اجمال سے کہوں کیا ہے

وفا کا شکوۂ باطل سے آشنا رہنا
وفورِ سوزِ تمنّا کی یہ علامت ہے

گلے نہیں، یہ ہے سرگرمِ التجا رہنا
ہجومِ شوقِ جنوں زا کی یہ علامت ہے

ہیں اقتضائے محبت یہ خفگیاں میری
کمالِ شوق ہے آزردگی تمنّا کی

نہیں ہیں واقفِ تسلیم شوخیاں میری
کہ ہے یہ اصل میں افسردگی تمنّا کی

ترے سوا مجھے اے جاں کسی سے کیا مطلب
ترے جمال کا وارفتۂ محبت ہوں

مرے جنون کو بے رہروی سے کیا مطلب
[illegible] عشق میں قبلہ نما کی صُورت ہوں

مری وفا پہ تجھے اشتباہ ہے پیاری
گناہ ہے یہ سراسر گناہ ہے پیاری

جلال الدین اکبر

میر تقی میرؔ اور سوداؔ

میں موزانہ کو ادب کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتا مگر کیا کروں خود مرزا صاحب نے میر صاحب کے ایک سلام اور مرثیے پر ہجویانہ انداز سے تنقید فرمائی ہے۔ اس کے متعلق مجھ کو دو تین باتیں عرض کرنی ہیں۔

(۱) اکثر لوگ خواہ مخواہ کہہ دیتے ہیں کہ میر صاحب کے مرثیے ان کے شایانِ شان نہ تھے لہٰذا شاملِ کلیات نہیں ہوئے، میر صاحب اور میرزا صاحب کے کلیات کی تدوین بعد کے لوگوں نے کی۔ لہٰذا یہ سوال ہو ہی نہیں سکتا کہ خود میر صاحب نے کیوں شامل نہیں کیا۔ مرثیوں کے کلیات میں نہ چھپنے پر عبدالحق صاحب مدیر اردو اورنگ آباد کو حیرت ہے، اور مجھ کو بھی۔ سنا ہے کہ بعض قلمی نسخوں میں جن میں سے ایک مسعود صاحب ادیب (لکھنؤ) کے ذاتی کتب خانہ میں ہے میر کے مرثیے بھی ہیں۔ بہر طور جو مرثیے عشرت رحمانی صاحب نے اردو کو بھیجے اور ۱۹۳۱ء میں چھپے ہیں اُن کے اندازِ بیان، اُن کی زبان اُن کے اقسام اور اُن کی تاثیر دیکھ کر واقعی سمجھ میں نہیں آتا کہ زمانے نے بے انصافی کی یا انصاف سے کام لیا۔

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ میرزا نے جس سلام اور جس مرثیے کو میر صاحب کا مہر شدہ تسلیم کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے اُن پر بھی کم سے کم مجھے دو امر کا شبہ ہے۔

(۱) ممکن ہے کہ میر صاحب کا کلام نہ ہو اس لئے کہ جو مرثیے میر تقی کے ہمارے سامنے ہیں اُن کے مقابلے میں یہ سلام اور مرثیہ دس اور بیس کی [illegible]ت بھی نہیں رکھتا اور جو غلطیاں یا لغزشیں ان میں نظر آتی ہیں ان کی چھاؤں بھی نہیں ہے۔

(۲) ممکن ہے کسی اور کا کلام ہو، اور کسی بچے نے یا کسی غیر ذمہ دار نے مہریں لگا دی ہوں۔

اگر یہ مان بھی لیجئے کہ خود میر صاحب کا کلام ہے تو بھی میرزا صاحب نے پرکھنے میں دشمن اور حاسد کی نظر سے کام لیا ہے جوہری اور ناقد نہیں بنے۔ تھوڑے سے اعتراضات د[illegible] تھوڑے سے ایسے ہیں جن کی مثالیں خود اُن کے کلام میں موجود ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو بے بنیاد ہیں۔

اگر میں تفصیلی بحث کروں تو میرا اور آپ کا دونوں کا وقت فضول برباد ہوگا، میرزا صاحب نے میر صاحب کے کلام کو متن قرار دے کر اپنی شرح لکھی ہے میں نے بھی یہی ترتیب قائم رکھی ہے اور جس جگہ مجھ کو میرزا صاحب سے اتفاق نہیں ہے اس کو درشرح کے عنوان سے ظاہر کر دیا ہے۔ ممکن ہے بعض جگہ درشرح کا اندازِ بیان درشت اور زبان گستاخ ہو گئی ہو مگر اس کی

ذمہ داری بڑی حد تک متعلقہ شرح پر ہے۔

متن

اے نبی کے باطناً رتبے کے والی السلام ظاہراں سے بھی ہو تم اک نوع عالی السلام

شرح

پہلے یہ کہئے اے کرم فرما باطنی رتبۂ نبی ہے کیا
دوسری بات یہ جو کہہ ڈالی ہو تم اک نوع ان سے بھی عالی
اور اس نوع کو بیاں کیجے مجھ کو آگاہ اس سے کر دیجے
گرچہ وہ شخص ہے امام حسین ایک دن جس کو سید الثقلین
لگے فرمانے مجھ کو بتلا تو مرتبے میں بڑا ہوں میں یا تو (جواب)
ماں مری فاطمہ علی ہے باپ والدین اپنے اب بتاویں آپ
اور جس شخص کا نواسا ہوں امر ہو تو اسے بھی بتلا دوں
متبسم ہو تب یہ فرمایا سخن راست حق کو بھی بھایا
اُن کے رتبے کی ہی بہم یہ نمط لیک جو آپ سمجھے ہیں سو غلط
رتبۂ باطنی پیغمبر اپنے نزدیک ایک ٹھہرا کر
نسبتی مرتبے کو تم فائق اس پہ سمجھے ہو یہ نہ تھا لائق
مصرعِ ثانی سے بھی ہو آگہ نوع کے عین کو نہیں جا گہ

در شرح

باطنی رتبہ تم سے کس نے کہا کس طرح سے تمہیں خیال ہوا
دونوں مصرعوں سے مل کے ہی مفہوم یہ بھی ہے یا نہیں تمہیں معلوم
اس طرح ہو گئے ہو کیوں بیباک بھول بیٹھے ہو آیۂ لولاک
رحمتِ عالمیں ہے کون نبی شافعِ مذنبیں ہے کون نبی
کس کا رتبہ سوا ہے پیشِ الہٰ کہہ دوں اب آفتاب را چہ گناہ
نورِ واحد کہاں ہے جلوہ فروش خم میں آ کر تو نہ ہوں مدہوش
ہے علی و نبی کی جانِ حسین ایک کی روح اک کی شانِ حسین
یہ وصی ہے وصی صادق کا یہ ولی ہے ولی خالق کا
باطناً اس طرح سے ہے والی ہو گیا ہو گا تم پہ بھی حالی
ظاہراں سے ہے کس طرح عالی نہیں دعوے دلیل سے خالی
چند لفظوں میں کہہ گیا ہے میر بیسیوں شعر تم کرو تحریر
نہ تو شاعر لغت ہے نہ فرہنگ ربط و ایجاز کا اسے ہے ڈھنگ
جو نہ سمجھے اسی کا ہے یہ قصور حاسدوں کی سمجھ سے میر ہے دور
کیسی تقطیع کرتے ہو مرزا مفت الزام دھرتے ہو مرزا
نوع کا عین اپنی جا ہے درست عقل نقاد ہو گئی ہے سست
عرض کر [illegible] میں کرو جو معاف قاعدہ ہے عروض کا یہ صاف
عین کے واسطے جہاں شک ہو نقطہ اک عین پر وہیں دے دو
قراتِ غین اگر نہ ہو دشوار صحتِ عین کا ہے وہ معیار

متن

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جد پاک ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السلام

شرح

گر تعلق کمال کا ہوتا — پسرِ نوح باپ سا ہوتا
منحصر کچھ نہیں نسب پہ کمال — جس پہ ہو فضلِ ایزدِ متعال
پیش مصرع میں لفظ یہ سے مراد — آپ کو ہے بزرگی اجداد
پر نکلتا ہے اس سے یوں بے کد — سب تصدق پدر سے لے تا جد

در شرح

پسرِ نوح تک نہ تم جاؤ — غم و غصہ نہ اس قدر کھاؤ
صاف ہے کیوں تم الٹ سمجھے — میر کے شعر کو غلط سمجھے
یہ بھی ہے پہلے شعر کی توضیح — نئے پہلو سے ہے نئی تشریح
نہیں حسنین کی نسب میں مثال — جس پہ ہو فضلِ ایزدِ متعال
عینک انصاف کی لگاؤ ذرا — روش اسلاف کی دکھاؤ ذرا
یہ کا مطلب ہے صاف صاف ایسا — تم نہ سمجھو غضب ہے، یہ کیسا
جستجو کر لو اپنے دیواں میں — سر تو ڈالو ذرا گریباں میں

متن

لامکاں بھی ایک بازی گاہِ طفلی ہے ترا — کوئی مکاں تم سے نہیں پاتا میں خالی السلام
(حسنین کی جناب کا جو کوئی غلام ہے) (سودا)

شرح

عوض کوئی مکاں جو لفظِ فصیح — بولتے کوئی جا تو تھا یہ صحیح

در شرح

خوب تر کوئی جا ہے اور فصیح — کوئی مکان اپنی جا مگر ہے صحیح
یہ تلفظ تو عام تھا مرزا — پھر تمہیں کیوں کلام تھا مرزا

متن

ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو — تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السلام

شرح

خوں سوا ایسی جا میں لفظِ لہو — نہیں آیا محاورے میں کبھو
اور لالی کا حرف کر دو حک — ہو نہ ثابت شفق سی یہ جب تک

در شرح

جب نہ گنجشک عقل کی پھدکی — مانگ اُڑا دی "محاورہ شد" کی
جب کہ لالی ہوئی گریباں گیر — ہوئی پیدا شفق کی بھی تنویر
حرفِ زائد ہے ماں لفظِ شفق — شعر ہے یا کہ مدرسے کا سبق
شفق اور خون دونوں لال ہوئے — فیضِ معنی سے یوں نہال ہوئے
چھا گئی آسماں پہ جب لالی — وہ ہے حسنِ شفق سے کب خالی

متن

اے ہو الاول ہو الآخر کے مالک بالیقیں　　　وے ہو الظاہر ہو الباطن کے والی السلام

شرح

کیا ہو الاول و ہو الآخر　　　کیا ہو الباطن و ہو الظاہر
حق کی جانب پھرے ہے انکی ضمیر　　　اس سوا جس پہ کہئے ہے تکفیر

در شرح

ہے جو فانی کی جانب انکی ضمیر　　　نہیں پیدا کہیں سے بھی تکفیر
آفرینش سے ہے مراد یہاں　　　دھوکے کھاتے ہیں بے سواد یہاں

اب ہو لولاک پر کرو تم غور　　　نظر آئے یہ شعر ہی کچھ اور
کشورِ علم کے ہو گرچہ امیر　　　میرزا تم لکیر کے ہو فقیر

اعتقادات میں اگر ہو کذا　　　ایسی تنقید کو مرا ہے سلام

متن

یہ شہادت تیری تائید انا بشرؐ کی تھی　　　کیا حدیثِ مثلکم تم نے نبھالی السلام
یہ شہادت تیری کلمہ کی شہادت سے ہے تمام　　　عبد ہو کے مات ساری تم نے پالی السلام
ورنہ تم بے شبہ و بے شک احمدِ بے میم ہو　　　لی مع اللہ کے ہو تم ہر وقت حالی السلام

شرح

ہے تصوف کی راہ سب پہ درست　　　بندشِ الفاظ کی پر اتنی سست
انا بشرؐ ہے آیۂ قرآں　　　وہی بہرِ پیمبرِ دو جہاں

مشکلم جزو ہے اس آیت کا　　　منفصل باندھنا نہیں سمجھا
لطف ہے اس سلام میں آلفِ　　　کہ نہیں اس میں السلام کو ٹھور

در شرح

نہیں کوئی ردیف ہی جب اور　　　کیوں نہیں السلام کو بھی ٹھور
منفصل کی نقاب اٹھاؤ ذرا　　　متصل باندھ کر دکھاؤ ذرا

نہیں اس میں ضرورتِ اصلاح　　　چپ رہو مان لو ہماری صلاح
تم کو عادت تھی ہجوگوئی کی　　　تم کو خصلت تھی عیب جوئی کی

تھے بہت اپنے آپ پر مغرور　　　نہیں تنقید یہ غرور سے دور
مرثیے ہیں تمہارے درد نہیں　　　سوزِ دل کا پتہ نہیں ہے کہیں

میر کے مرثیے میں ہے وہ اثر　　　ٹکڑے ہو جائیں جس سے قلب و جگر
تم بہت اپنا سر جو دھنتے تھے　　　لوگ خاموش بیٹھے سنتے تھے

جب ہوا تھا تمہیں خیال اسکا　　　دل بے بس کو تھا ملال اس کا
کرتے خالق سے تم دعائیں اگر　　　دیتا تم کو بھی میر کا سا اثر

کس لئے ہجو کی ہے یہ بے سود　　　دین و دنیا میں کیا ہوئی بہبود

سودا کے مرثیوں میں اثر

حسن اتفاق سے تنقید کے سلسلے میں اثر درد اور مرثیت کا ذکر آگیا ہے دو چار کلمے عرض کر دینا چاہتا ہوں میں نے سودا کے مراثی کئی کئی مرتبہ پڑھے اور حتی الامکان بے تعصب بن کر اور خلوص سے پڑھے مگر مجھ کو سودا کے مرثیوں میں درد اس حد تک نہیں ملتا، جتنا میر تقی کے مرثیوں میں ہے۔ میاں سکندر، حیدری اور افسردہ کے یہاں بھی کافی درد موجود ہے' میں نے بہت غور کیا کہ کمی درد کا سبب دریافت کر سکوں، ابھی تک کیوں نہیں ہے؟ کا مسکت جواب میرے پاس نہیں ہے۔ مگر کچھ پہلو ضرور نگاہ میں ہیں۔

(۱) مرزا کی طبیعت کا جزو غالب یاس اور درد نہیں بہجت اور مسرت ہے۔ اس لئے فطری طور پر اُن کے یہاں درد نہیں ہے۔ وہ درد پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے درد پیدا ہو جاتا ہے مگر فطری عناصر اس درد کو خالص، باثر اور گہرا نہیں ہونے دیتے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ مرزا کی شاعری زیادہ تر ذہنی اور دماغی ہے (Mental and Intellectual) دل سے اس کو تعلق ہے مگر کم اور حیات کے صرف اس حصہ سے متعلق ہے جس میں تفاول اور رجائیت ہے۔

(۲) مرزا تشبیہات اور استعارات یا دیگر فنی زیوروں سے ادائے مطلب میں اتنا کام لیتے ہیں کہ ذہن مخاطب آرائش اور سجاوٹ میں محصور ہو جاتا ہے۔ بعینہ وہی حال ہے جیسے آپ کسی پسر مردہ کی تعزیت میں جائیں اور نہایت عمدہ بوٹے دار اچکن زیب جسم ہو، عطر کی لپٹیں چلی آتی ہوں، مانگ خاص طور سے بنی ہو، ٹوپی عمدہ کام کی اور گفتگو ادبی اور فنی نکات سے مالا مال ہو۔

(۳) مگر جہاں کہیں مرزا نے پنجابی یا پوربی زبان استعمال کی ہے وہاں عربی اور فارسی الفاظ، ترکیبوں کا کیا ذکر حتی الامکان تشبیہات استعارات اور محاکات سے بھی پرہیز کیا ہے۔ پھر وہاں پورا درد کیوں نہیں ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرزا اپنے علم و تبحر کی وجہ سے مضامین کے لئے الفاظ کا خون کرنا پسند نہیں کرتے تھے ان کی سادگی آمد کی نہیں آورد کی ہے۔ مثالیں اس لئے پیش نہیں کرتا کہ جتنی مثالیں اور موقعوں کے لئے درج کی گئی ہیں وہی اس امر کے فیصلے میں بھی مدد دیں گی کہ درد کتنا ہے؟

میر تقی میر کے ایک مفروضہ مربع مرثیے کی بھی مرزا صاحب نے بڑی بے تکلفی سے شرح لکھی ہے، مجھے کئی جگہ مرزا صاحب سے اختلاف ہے جو در شرح میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

متن

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے ، مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے ، غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے ، حسین علی کی شہادت کی شب ہے

شرح

یہ مطلع جو ہے آپ کا تو عجب ہے ، کہ یہ ریختہ کہنے والوں کا ڈھب ہے ، ورلے فیض کا ناطقہ کے سبب ہے ، نہ جانو کہ یہ مرثیہ یونہی سب ہے ،

در شرح

جو توصیف میں طرز ہے یہ غضب ہے ، یہی متن کی شرح کرنے کا ڈھب ہے ، یہ مطلع خود اپنی جگہ منتخب ہے ، جو سمجھو تو یہ مرثیہ یونہی سب ہے ،

متن

محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے ، ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے ، عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے ، کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے ،

شرح

تجی کا رچی قافیہ شائگان ہے ، سو وہ ہر سہ مصرع میں صورت کہاں ہے ، رچی اور مچی قافیہ جب کہ یاں ہے ، تو یہ قافیہ ہر طرح سے کڈھب ہے ،

در شرح

تجی اور رچی کس طرح شائگاں ہے ، رچی اور مچی میں بھی حسنِ بیاں ہے ، الگ سب کے معنی الگ سب کی شاں ہے ، کدھر سے غلط ہے کہاں سے کڈھب ہے ،

متن

کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوئیگا ، وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوئیگا ، یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوئیگا ، قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے ،

شرح

جو تقطیع سے شعر کی تم ہو ماہر ، تو افزودئی ہمزہ و یا ہے ظاہر ، مرا صاحب اس بحر کے رکنِ آخر ، نہ ہوگا ہے موزوں نہ ہوئیگا کب ہے ،

در شرح

نزاکت سے تقطیع کی تم ہو ماہر ، مگر کھینچ کر پڑھتے ہو کیوں بظاہر ، اگر قصر ہو بحر کے رکنِ آخر ، نہ ہوئیگا بھی موزوں ہے گو کچھ کڈھب ہے ،

متن

ہے چاروں طرف ہو رہا شورِ محشر ، زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر ، حسینِ علی پر چلایا ہے خنجر ، ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

شرح

کہو پہلے مصرعے کو یوں مجھ سے سن کر ، زمانے میں ہر سمت سے شورِ محشر ، یہ تقطیع ناموزوں اے بندہ پرور ، زباں پر ضعیفوں کو لانا غضب ہے ،

درشرح

زمانے کے پہلو میں ہر مت کا گھر   یہ تحصیلِ حاصل ہے اے بندہ پرور   درست اسکی تقطیع بھی ہے سراسر   عروضی کا بے وزن کہنا غضب ہے

متن

بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے   یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے   شہِ تشنہ لب کا کسے غم سنائے   یہ کس منہ سے کہئے کہ وہ تشنہ لب ہے

شرح

کسے کہتے ہو کون ہے وہ کہاں ہے   کہیں ہر سہ مصرع میں اسکا نشاں ہے   جو اپنے پہ اس گفتگو کا گماں ہے   تو یوں کہئے کہنے کے اس کا یہ ڈھب ہے
بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہاؤں   یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈباؤں   شہِ تشنہ لب کا کسے غم سناؤں   یہ کس منہ سے بولوں کہ وہ خشک لب ہے

درشرح

مخاطب ہی جب ذاتِ شاعر یہاں ہے   تو پھر ہر سہ مصرع میں اسکا نشاں ہے   نہ جانے تمہاری بلاغت کہاں ہے   کہ اصلاح دینے کا یہ ڈھب عجب ہے
کہو تو کھری آج مرزا سناؤں   رموز و اشارات تم کو بتاؤں   ڈبائے سنائے کی وسعت جتاؤں   ڈباؤں سناؤں میں وہ لطف کب ہے

متن

لعینوں نے اسکو وطن سے بلایا   بمع اقربا لا کے بن میں بسایا   پھر اس جور سے اسکو مارا ہے پیاسا   کہ بس غم سے خود زینب کے تن میں تب ہے

شرح

بمع اقربا نے یہ افزونی پا   کیا غیر موزوں یہ مصرع سراپا   نہیں اس میں ہرگز مرا حرف بیجا   کہ اوزانِ اشعار میرے بلب ہے

درشرح

بمع میں فزونی ہی لیکن ہے زیبا   نہیں غیر موزوں یہ مصرع ذرا سا   وتد کی جگہ ہے وتد بے محابا   حسد سے فصاحت کی جاں اب بلب ہے

متن

غرض وہ جفا اسکو دکھلائی ظالم   کہ جس کا وہی آپ رب ہوگا عالم   نہ لینے دیئے اس کو اک دم بھی سالم   دیئے اس کو کیا کیا تعب پر تعب ہے

شرح

دیئے میں دیا ہے یہ کہنا روا ہے   زباں جمع واحد سے یوں آشنا ہے   یہ لہجہ میں حیراں ہوں کس ملک کا ہے   دیئے اسکو کیا کیا تعب پر تعب ہے

درشرح

جو اوزانِ اشعار میں ناروا ہے   تو پھر اس جگہ بھی وہ نا آشنا ہے   یہ لہجہ تمہارے ہی تو ملک کا ہے   مگر سند کا دنیا میں چارہ ہی کب ہے

متن

دونوں رات و دن تو کٹے ہر طرح میں　بظاہر مصیبت بباطن فرح میں　سحر پر ہوا خوں قضا کے قدح میں　کہا پی لے شبیر تو خشک لب ہے

شرح

جو پوچھوں قدح میں بھرا خون کن نے　تو بتلاؤ گے تم شہادت کے دن نے　پہ حیراں ہوں ہیں کون ہے وہ کہ جن نے　کہا پی لے شبیر تو خشک لب ہے

در شرح

نہ پوچھو قدح میں بھرا خون کن نے　یہ ظاہر ہے سب پر شہادت کے دن نے　وہ تھا ہاتفِ غیب لاریب جن نے　کہا پی لے شبیر تو خشک لب ہے

متن

سحر تھی کہ خوابِ عدم اسکو کہئے　سحر تھی کہ آخر کا دم اس کو کہئے　سحر تھی کہ ظلماتِ غم اس کو کہئے　کہ اک پرتو اس کا سویدا کی شب ہے
سحر تھی کہ تلوار کی کوئی چمک تھی　سحر تھی کہ برقِ ستم کی چمک تھی　سحر تھی کہ کوئی واپسیں کی پلک تھی　سحر تھی کہ موت اس سے رو در حجب ہے

شرح

دمِ واپسیں گوش زد ہے ہمارے　پلک واپسیں کی زباں پر تمہارے　پھرے تھی اجل جس جگہ منہ پسارے　اسے کہئے پردے میں واں کیا عجب ہے
کرو وا میانہ نہ ذکرِ شہادت　رکھو ماضی و حال میں کچھ تفاوت　کہو تو یہ کس طرح کی ہے عبارت　سحر تھی کہ موت اس سے رو در حجب ہے

در شرح

اگر نوعِ پیشِ نظر ہو تمہارے　سمجھ جاؤ تم اس پلک کے اشارے　پھرے کس طرح سے اجل منہ پسارے　وہ پردے میں پنہاں ہے تو کیا عجب ہے
یہی مخلصانہ ہے ذکرِ شہادت　کہ ہے امتزاجِ زمانہ سلاست　سمجھ میں نہیں آئی سادہ عبارت　سحر ہی سے تو موت رو در حجب ہے

متن

غرض اس سحر نے جو چہرہ دکھایا　شہِ دیں نے اسباب رن کا منگایا　حرم نے جواب اس کا اور کچھ نہ پایا　سبھوں کے منہ اوپر قمیص و قصب ہے

شرح

سخن سب کا سب گو خوش و ناخوش آیا　پر اس گفتگو نے نہایت رجھایا　خدا جانے تم اس میں کیا مغز پایا　بدلنت اپنے تو ہذیان تب ہے
قمیص و قصب یاں نہایت ہے بیجا　بتاؤ مجھے تم نے کہا ان کو سمجھا　کہیں پیرہن کو قمیص اسے ملا دا　نباتات میں ہے سو کچھ قصب ہے
قصب اس سوا قسم ہے پارچے کی　نہ اس معنی سے بھی ہو اپنی تسلی　جگہ آپ نے جس ارادے کو یاں دی　سو لفظوں سے اسکا نکلنا عجب ہے
کہو مرثیہ یہ رلاوے گا کس کو　رووے گا سر اپنا کوئی سن کے اس کو　رلانے کی خاطر سناؤ یہ جس کو　کہو کیا جو پوچھے وہ کیا شے قصب ہے

درشرح

قمیص او قصب کی نئی ترکیب نے پایا غضب ہے کہ حاسد نے یہ بھی نہ سمجھا قصب پر نہ تم کھاؤ قصب کا دھوکا جو نازک کتاں ہو وہی تو قصب ہے
نہ تڑپائے گا مرثیہ ہائے کس کو سر اپنا دھنے گا ہر اک سن کے ہی کو زباں سے ذرا سا بھی ہو ربط جس کو بھلا کیوں وہ پوچھے کہ کیا شے قصب ہے

متن

کہا شاہِ دیں نے اے میرے غریبو زمانے سے ساری عمر بے نصیبو خزانِ دلِ باغ کی عندلیبو عجب طرح کا تم پہ فصلِ اب ہے

شرح

خزانِ دلِ باغ کب گوش زد ہے خزانِ باغِ دل کی کہو تو سند ہے غلط گوئی کتنی غرض یاں بکد ہے اگر فرض واجب نہیں مستحب ہے

درشرح

خزانِ دلِ باغ بیشک غلط ہے مگر یہ بھی سہوِ نظر اک نمط ہے نہیں جہل ہلکی سی غفلت فقط ہے وہ لے جو تھا مصرعہ تمہارا غضب ہے

متن

شہِ دیں یہ فرما کے اُن کو چلے ہیں سب اہلِ حرم سینہ کوباں کھڑے ہیں بلائیں وہ چاروں طرف لے رہے ہیں کہ دیدار اب تیرا پھر ہم کو کب ہے

شرح

جو غصہ کرو گے مجھے بھی وہ کہنا سخن و اجبی پر کہے بن نہ رہنا بلائیں لئے سے نہ نکلا یہ کہنا کہ دیدار اب تیرا پھر ہم کو کب ہے

درشرح

بلائیں تو ہیں بے زباں کیا کہیں گی وہ کشتی بدستِ دعا میں بہیں گی تمنائیں گر جوش میں چپ رہیں گی تو ارماں پکاریں گے دیدار کب ہے

متن

ادھر زینب اس کے تھی قربان جاتی اور اس طرف کلثوم تھی بلبلاتی اے بھائی یہ آفت سہی نہیں ہے جاتی فراق اب ترا ہم کو نار اور حطب ہے

شرح

جو اتنی ہو تقطیعِ لفظی سخن میں تو جائز نہیں شاعری کے وہ فن میں مگر کان بے ربطی کے ہی دہن میں کہ جو منہ سے نکلے ہی بے ربط سب ہے
مزاج آپکی سمجھ سے جاتی ہی اکڑی کہوں کیا میں یہ مرثیہ ہے کہ پھکڑی فراق آگ بیشک ہی لیکن نہ لکڑی فقط قافیہ کیلئے یاں حطب ہے

درشرح

نہیں لغزشیں عام باغِ سخن میں جواب اپنا رکھتا نہیں حسن فن میں عجب ربطِ فطری ہے ذہن اور دہن میں کہ جو منہ سے نکلے ہی مربوط سب ہے
حسد سے طبیعت سب ہے حاسد کی اکڑی یہ نقد و نظر ہے کہ بے جوڑ پھکڑی جو ہے ہجر آتش تو مہجور لکڑی اسی واسطے نار ہے اور حطب ہے

اے بھائی نبی آج گویا سدھارا علی کا ہوا داغ تازہ دوبارا
اے بھائی پھریں گے کہاں ہم آوارا نہ کرنے کا جو ہر ہمد یہ کیا سبب ہے،

شرح

سر بیت اس بحر میں یہ نہ جانا کہ لے کا نہیں اس میں ہرگز ٹھکانا
انہیں اس جگہ ان نے موزوں نہ جانا جسے شعر تقطیع کرنے کا ڈھب ہے،
اوارا فقط تم سے سننے میں آیا کسی میرو مرزا کو کہتے نہ پایا
بلا مد اسے کن نے تم کو پڑھایا کہو اہلِ خطہ ہے وہ یا عرب ہے

در شرح

سر بیت لے کا نہیں ہے ٹھکانا مگر ہم نے تقطیع میں یہ نہ جانا
اے بھائی کو ناموزوں کس طرح مانا اگر قصر کر دو تو موزوں یہ سب ہے
بلا مد جو نکلے زباں سے اوارا کرو جوشِ غم میں اسے تم گوارا
اسی نے عروسِ سخن کو سنوارا گداز اثر بھی اسی کے سبب ہے،

متن

ہمیں اپنے ہاتھوں سے تم مار جاؤ زمیں کھود کر ہم کو یاں گاڑ جاؤ
لگا ہم کو ایک ایک تلوار جاؤ ہماری شہادت بھی آخر نصب ہے

شرح

میں اس چار مصرعے میں جو بات جانی کہوں طبع پر گر نہ آوے گرانی
نہیں ہے یہ ہرگز تمہاری زبانی انہیں اس میں لکھ لینے کا کیا سبب ہے،

در شرح

جو اے میرزا تم نے یہ بات مانی یہ مصرع نہیں ہے نقی کی زبانی
تو پھر بے مزہ ہے یہ سب چھیڑ خانی اسے ذکر کرنے ہی کا کیا سبب ہے

متن

نہ لٹنے کی اب مجھ کو اپنے خبر ہے نہ معلوم ہے سر کی چادر کدھر ہے
یہ تم نے جو مرنے کو باندھی کمر ہے مری موت بھی اس گھڑی مضطرب ہے،

شرح

سنی آپ سے میں عجب یہ حکایت کہ لٹنے کی تھی شہ کے آگے شکایت
عبودِ تواریخ بھی ہے نہایت خبر آپ کو ایسی باتوں کی کب ہے،
خلل اور اک اس میں ہے بندہ پرور نہیں موت وہ شے جو غم سے ہو مضطر
اسے یوں کہو اپنے مخلص سے سن کر مرے جسم میں جی مرا مضطرب ہے،

در شرح

کہاں سے گڑھی آپ نے یہ حکایت نہیں بال بھر جھوٹ کی یاں شکایت
پریشان ہے غم سے دکھیا نہایت اسی وجہ سے موت بھی مضطرب ہے،
یہی ایک نقطہ ہے اے بندہ پرور کہ ہے موت ہی شے بھی اس غم سے مضطر
جو جی کو کہیں مضطرب تم سے سن کر وفورِ الم کا مزہ اس میں کب ہے،

متن

یہ فرما کے شبیر اُن کو سدھارے کھڑے ہو مخالف کے منہ پر پکارے
کہ دیکھے اب آ کر جسے ہے مرد بارے کہ یہ دست و تیغِ امیرِ عرب ہے،

شرح

کئی بند یہ جو کئے غور میں نے — درست آپ کو پایا اک طور میں نے
قوافی والفاظ بن اور میں نے — قباحت نہیں پائی یہ کیا سبب ہے،

در شرح

کیا بعد مدت کے جب غور تم نے — درست انکو پایا کچھ اک طور تم نے
اگر فکر کی ہوتی کچھ اور تم نے — تو بول اُٹھتے بے ساختہ خوب ہے،

متن

یہ سن کر شمر آ کے بیٹھا سرہانے — لگا ڈھونڈنے مارنے کے بہانے
کہا شہ نے اس کو کہ سن او دوانے — مجھے اپنے نانا کا اس دم ادب ہے،

شرح

زبانی تمہارے فقط ہے یہ انشا — کچھ آیا نہ تھا شمر نانا کا بھیجا
جو کہتا یہ اس سے نبی کا نواسا — مجھے اپنے نانا کا اس دم ادب ہے،

در شرح

نہیں آیا تھا شمر نانا کا بھیجا — مگر ذبح کے وقت آئے تھے نانا
اسی سے زباں پر نواسے کی آیا — مجھے اپنے نانا کا پاس ادب ہے،

متن

یہ کہکر وہ آپ ہی علی کو پکاری — نجف کی طرف ہاتھ دونوں پساری
کہ شاہا کہاں ہے تمہاری سواری — شتاب آؤ اس دم تمہاری طلب ہے،

شرح

تم اس جا پہ تذکیر مشفق ہمارے — اگر کہتے یوں ہاتھ دونوں پسارے
زباندان تمہیں آفریں کہتے سارے — تیاناپٹ لفظ اس جا کڈھب ہے

در شرح

ہنسی آتی ہے فہم پر اب تمہارے — پساری کو کس طرح کہہ دیں پسارے
تو خفیہ کے پھر قافیے ہونگے سارے — یہ کاوش تمہاری غضب منتخب ہے،

متن

میں اس کو جو اک طول دیکر ہے لکھا — غزل نہیں ہے ہے مرثیہ نام اس کا
ذرا منصفوں سے ہے اب اس کا دعوےٰ — بیانِ شہادت کا میرے یہ ڈھب ہے،

شرح

تمہیں خواہش انصاف کی میر جی ہے — سنا منصفوں نے تو یہ داد دی ہے
طلب بانی مصنف کو انصاف کی ہے — پر اس کا ہر اک بند معنی طلب ہے

در شرح

عجب داد دی ہے غرض تم نے مرزا — نمایاں ہے ہر لفظ سے جوشِ سودا
بہت سے ہیں جب اعتراض اس میں بیجا — تو پھر کیوں ہے مقبول یہ کیا سبب ہے،
بجا ہے تمہیں کوئی منصف جو ڈانٹے — چنے ہیں فقط تم نے گلشن میں کانٹے
وہ ناقد نہیں ہے جو حصے نہ بانٹے — یہ تنقید کا رنگ مرزا کڈھب ہے،

دو مصرعی دوہرہ بند مرثیے کی مثال حسب ذیل ہے - اب اس قسم کی کوئی چیز رائج نہیں ہے معلوم نہیں سودا کے بعد اور کسی نے اس طرف توجہ کی یا نہیں - انداز بالکل سوز کا ہے اور جب تک مقاماتِ موسیقی سے واقف اور راگ راگنیوں کا پرکھیا ادا نہ کرے پورا لطف نہیں آسکتا -

کہتی ہے بنتِ پیمبر ہائے سرور ہائے ہائے   اے نبی کے ناز پرور ہائے سرور ہائے ہائے

دیکھ خفا جس کو ذرا کہتے تھے مجھے رسول

لال کو میرے فاطمہ کیوں تیں کیا ملول

دوہرہ کی زبان بھی مرثیہ کی عام زبان سے مختلف نہیں ہے -

دکھنی آمیز زبان میں ایک مفردہ مرثیہ سنئے، بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلی سے پہلے کے دکھنی مرثیہ گو ہاشم یا بحری یا قلی قطب شاہ کا مرثیہ ہے، وہی انداز بیان، وہی تخصیص تلفظ - سندھیوں اور دکھنیوں کی مجلسیں بھی ہم سے مختلف ہوتی ہیں - ان میں منبر کے پہلے زینے پر ایک شخص سرو قد کھڑا ہو کر بڑی خوش الحانی سے ذکر کرتا ہے اور بیچ بیچ میں داستان گو کی طرح نظم کے شعر پڑھتا ہے - صاحب منبر کے ارد گرد کئی آدمی کھڑے ہوتے ہیں جو ہر پہلے مصرعہ کے آخری ٹکڑے سے ساتھ دیتے ہیں اور دوسرا مصرعہ خود پڑھتے ہیں - غالباً اس قسم کے مرثیے سودا نے ایسی ہی مجلسوں کے لئے لکھے تھے -

کافراں آلِ محمد پہ ستم کیا کیتا

ہائے تمنا نے انھاں اپر ظلم کیا کیتا

بعض عزاداروں نے ساتویں محرم شہادتِ قاسم کے لئے مخصوص کر لی ہے - اور بعض جگہ مہندی کا جلوس نکالتے ہیں، یا پلنگ نکالتے ہیں - ایسے ہی جلوس کے ساتھ پڑھنے کے لئے اس قسم کے مرثیے موزوں تھے آپ خود ملاحظہ فرمائیے کیا انداز ہے -

کس دن اس شادی نے پایا تھا قرار   ہوئے جس شادی کا یہ انجام کار

رات جنوے کی دلھن سے سوگوار   روئے ہے گھونگٹ میں چھپکے زار زار

جلوس عاشورہ کے ساتھ پڑھنے کے لئے -

کیا ہوا آج یہ کام آج کے دن   روتی ہے خلق تمام آج کے دن

گر پڑا دیں کا خیام آج کے دن   ہو گیا قتل امام آج کے دن

جوابی ماتم کے حلقہ کے واسطے -

تشنہ لب سبطِ پیمبر وا دریغا وا دریغ — کربلا کے بن میں سرور وا دریغا وا دریغ
کشتۂ شمشیر و خنجر وا دریغا وا دریغ — ہائے وہ فرزندِ حیدر وا دریغا وا دریغ

بعض جگہ اربعین میں بشیر کی شبیہ بنائی جاتی ہے جو شالِ عزا گلے میں ڈالے ہوئے عترت اطہار کی واپسی مدینہ کی خبر سب کو دیتا ہے۔ ایسے موقع پر یہ مرثیہ کس قدر لطف دیگا بالخصوص جب نقیب اپنے عمدہ اور دل سوز لحن میں پڑھے۔

کہتے ہیں رو رو کے زین العابدین — ہو کدھر دادا امیر المومنین
مرتدوں نے کر سند دیں کے تئیں — کھو دیا مہرِ نبوت کا نگیں

گیارہ محرم کا دن گزر کر جو شام آتی ہے وہ "شامِ غریباں" کے نام سے منائی جاتی ہے۔ جلے ہوئے خیمے، بے چادر مخدرات، بے بس بچے، لٹی ہوئی حالت، عجیب سماں ہوتا ہے۔ دیکھئے اس وقت کے لئے سودا کا یہ مرثیہ کس قدر کامیاب ہے۔ روایت وہ پیشِ نگاہ رکھئے کہ سیدۂ عالم پایۂ عرش تھام کر اپنے بچوں پر مظالم کی شکایت کر کے امت کے لئے طالبِ شفاعت ہیں۔

غمِ حسین بن آتش مرا جگر پھونا — حسین کے موئے گھر ہو گیا سبھی سونا — اسیر اہلِ حرم دیکھ غم ہوا دونا — خراب پھرتی ہے اب دسید نبی کی آل

غرض اسی طرح آپ کو چاند رات سے لے کر عشرہ تک اور پھر دسویں سے چہلم تک تمام مخصوص تاریخوں اور مخصوص طرزِ عزاداری کے مناسب مرثیے سودا کے یہاں مل جائیں گے۔

بس ایک مثال اور سن لیجئے ایسی مجلس ہے جس میں ایرانی یا فارسی جاننے والے، اردو سمجھنے والے اور برج بھاشا کے پرستار برابر موجود ہیں۔ اور ذاکر چاہتا ہے کہ سب ایک ہی طرح متاثر ہوں اور ایک ہی طرح سمجھ سکیں، ہر بند میں تین مختلف زبانیں ہیں اور پھر بندوں کا تسلسل جاتے نہیں پاتا، یہ بڑی مشاقی کی بات ہے، ملا محتشم کے اشعار ہیں جن پر مصرعے لگائے جاتے ہیں اور دوہرہ بھی متعلق مضمون کے ساتھ نظم کیا ہے۔

کیا چرخِ واژگوں کا ستم اب کروں بیاں — تاریک کر دیا ہے محمد کا خانماں
سونا ہے بے مکین محمد کا ہر مکاں — پیٹے ہیں سر کو آج یہی کہہ کے انس و جاں

خورشیدِ آسمان و زمیں نورِ مشرقین
پروردۂ کنارِ رسولِ خدا حسین

جنگل میں جا سوئے رہے کوئی آس نہ پاس　　کاری رین ڈراونی گھر سے ہوئیں نراس

خیر یہاں تو فارسی کے مختلف شعر ہیں جہاں ایک مصرعہ اردو یا فارسی کا مستقل ہوتا ہے وہاں بھی مرزا صاحب کی تلاش اور ربط قائم رکھنے کا کمال آپ خود اُن مرثیوں میں دیکھ لیجئے۔ ایک میں۔ گذری جو فاطمہ پہ اسے ہم سے پوچھئے۔ مستقل مصرعہ ہے۔ دوسرا مرثیہ وہ ہے جس میں پادشاہے عجبے بود وسپاہے عجبے یا اور اسی قسم کے مرثیے ہیں جن میں تمام واقعات اس خوبی سے بیان ہوئے ہیں کہ مستقل ٹکڑوں کے باوجود سب دست و گریباں ہیں۔

اسی طرح مرزا نے غم انگیز بہار اور روح فرسا نغمے جہاں کہیں نظم کئے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہیں مثلاً عروسی قاسم کے ذکر میں مبارکباد گائی گئی ہے۔ قاسما مرگِ جوانانہ مبارک باشد۔ اور مرثیت ہاتھ سے نہیں گئی۔

طرزِ بیان میں بھی مرزا نے بڑی بڑی راہیں نکالی ہیں۔ مثلاً نصرانی والا مرثیہ، مثلاً حضرتِ سجاد کہ میرے اور کوئی بھائی نہ ہوا، مثلاً جناب سیدہ کا عرشِ اعظم تھام کر فریاد کرنا، مثلاً اوروں کی زبانی احوالِ کربلا مفصل بیان کر دینا۔ بہرکیف رد و تاثیر سے قطع نظر سودا کے مرثیے مرصع نگاری، کردار نگاری، جدت، مواقع، زبان، ادائے مطالب، مو شگافی، ہمہ گیری، منظر نویسی اور تکمیل کے لحاظ سے ارتقائی، ادبی، تاریخی اور مدنی حیثیت سے قابلِ غور و مطالعہ ہیں۔

طالب الہ آبادی

شفق

اے شفق رنگت تیری دل کو لبھاتی ہے بہت
روح تیری دید سے تسکین پاتی ہے بہت

ارغواں کو وجد ہے ہر آن تیرے حسن پر
ہوتی ہے سورج مکھی قربان تیرے حسن پہ

پتی پتی سے عیاں تاثیر تیرے رنگ کی
ہے ہر اک گلبرگ پر تحریر تیرے رنگ کی

ہے ردا آکاس کی گلنار تیرے عکس سے
بادلوں کے حاشیے زرتار تیرے عکس سے

شعلے اُٹھتے ہیں کبھی تیرے شہابی رنگ سے
پھول کھلتے ہیں کبھی تیرے گلابی رنگ سے

ذوقِ نظارہ ہے جس کو وہ مزے لوٹے ترے
ابر کی چادر پہ کیا پیارے ہیں گل بوٹے ترے

اودے، اُجلے، نیلے بادل ہیں تیری یہ سرخیاں
لحظے لحظے میں نرالا پیش کرتی ہیں سماں

جلوہ گر ہوتی ہے تو رہ رہ کے کس کس روپ میں
پر غضب ڈھاتی ہے آتی ہے نظر جس روپ میں

گل بدامن تھی ابھی تک ارغوانی رنگ میں
ہو گئی تبدیل ابھی تو زعفرانی رنگ میں

یہ فضائے آسمانی پر ہے جلوہ رنگ کا
یا تلاطم میں ہے صبح و شام دریا رنگ کا

روز کیسی آگ لگتی ہے یہ زیرِ آسماں
اس قدر رنگین و فرحت بار ہے جس کا دھواں

تیرے قرباں مجھ میں حسن و کیف بھر دے ایک دن
اے شفق اپنا مجھے ہم رنگ کر دے ایک دن

میر سعادت حسین نجیب

غزل

محنتِ عشاق اسے خود کام بے حاصل نہیں
تجھ کو بے پروا جو رہنے دے وہ جذبِ دل نہیں

کون مفت ایسوں سے سر مارے کوئی حاصل نہیں
میں ہوں دیوانہ تو ناصح بھی مرا عاقل نہیں

گفتنی ہے ماجرائے غم، مگر کس سے کہیں
آشنا وردِ محبت سے تمہارا دل نہیں

دخل پروانوں کو کیسا اُس کی بزمِ ناز میں
شمع بھی بے اِذن شاید درخورِ محفل نہیں

میرے دشمن وصل سے مایوس ہوں اے غمگسار
اُس کی غفلت ہی تو کہتی ہے کہ وہ غافل نہیں

طور و ایمن میں کہاں پھرتے ہو چشم و دل میں آؤ
کوہ و صحرا جلوہ گاہِ ناز کے قابل نہیں

جنتی حوروں سے دُنیا ہی کی پریاں خوب ہیں
حُسنِ بے آزار ذوقِ عشق کے قابل نہیں

حالِ رسوائے محبت کا شرارت سے نہ پوچھ
قصۂ مشہور دُہرانے سے کچھ حاصل نہیں

خاک تھا میں کر دیا اکسیر دل کی آگ نے
دین ہے اُس کی وگرنہ خود کسی قابل نہیں

مُدعائے دل کا کہنا ہی تو ہے امرِ محال
سر کو اُن قدموں پہ رکھ دینا کوئی مشکل نہیں

اُس کے لُطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول
اور میں کمبخت لُطفِ خاص کے قابل نہیں

خوبرو کیا دیں جوابِ بوسۂ لب صدق کو
شاعرِ ممتاز ہے دُشنام کے قابل نہیں

صدق جائسی

آتش پرست

ڈراما کے افراد

پرومیتھیوس :- انسانوں کا ہمدرد یونانی دیوتا۔
دارا اعظم - قدیم ایران کا بادشاہ۔
ہرقلیطوس - یونانی فلسفی۔
نپولین - فرانسیسی فاتح۔
نیٹشے - ہنگامہ پسند جرمن فلسفی۔
ایڈیسن - امریکن مُوجد۔

سرسوتی :- ایک ہندی خاتون

منظر :- پرومیتھیوس شہرت کے مندر میں ایران، یونان، فرانس، جرمنی اور امریکہ کے گذشتہ اکابر کے ساتھ بیٹھا ہے۔ مجمع میں کوئی بادشاہ ہے، کوئی فلسفی، کوئی فاتح اور کوئی مُوجد +

پرومیتھیوس - یہ وہ مبارک جگہ ہے۔ جہاں ہر زمانہ اور ہر ملک کے اکابر جمع ہیں۔ جہاں دنیا بھر کے اولوالعزم اور کوہ وقار اشخاص متبرک آگ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ تمام انسان سردی کی شدت کے مارے ٹھٹھر رہے تھے۔ میں دیوتاؤں کے محل سے آگ اُٹھا لایا اور کانپتے ہوئے انسانوں کو اس مصیبت سے آرام ملا۔ میری محنت برباد نہ گئی۔ اگرچہ اس نیک کام کے لئے مجھے قید وبند کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ بڑے دیوتا زیوس کے قہرمانی حکم سے مجھے ایک چٹان کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اور برسوں تک ایک باز آٹھ پہر میرے دل وجگر کو چیرتا پھاڑتا رہا۔ لیکن میرا صبر پھل لایا، اور آج زیوس کا سر میرے قدموں پر دھرا ہے! انسان اب دیوتاؤں کے مقابل بیٹھ سکتے ہیں۔ عالی نسب شہزادو! دلیر سپاہیو! روشن ضمیر فلسفیو! تم میں سے کس نے مقدس شعلہ کو زندہ رکھنے کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے؟ تم میں سے کسے اس مقدس جگہ کا پجاری نامزد کیا جائے؟ کون اس بات کا سب سے زیادہ حقدار ہے کہ میں اُسے خاک سے اُٹھا کر دیوتاؤں کے پہلو میں جا بٹھاؤں؟

دارا :- اے انسانوں کے محسن! پرومیتھیوس، تجھے رُوئے زمین پر کوئی شخص ایسا نہیں ملیگا۔ جو مجھ سے زیادہ اس عزت کا اہل ہو۔ ہاں دیوتاؤں کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے متبرک آگ روشن کی۔ اسے خوشبوؤں سے معطر کیا،

اور تلوار سے اس کی حفاظت کی۔ شب و روز اس کے شعلے بلند ہوتے رہے تا آنکہ زمین سُورج کی طرح منوّر ہو گئی۔ مجھ پر اپنا کرم کر کیونکہ جب تک سوُرج بیستون اور پرسی پولس پر چمکتا رہیگا دُنیا میرے کارناموں کو نہیں بھُول سکتی +

ہرقلیطوس :۔ پرومیتھیوس! دیکھنا کہیں اس کے شاہانہ لباس اور بلند بانگ دعووں سے دھوکا نہ کھانا۔ اس کی باتیں خالی ڈھول کی طرح ہیں اور اس کی عقل گمراہ ہے۔ مَیں مانتا ہوں کہ اس نے آگ جلائی۔ لیکن اس کے لئے وہ ایک بھٹیاری یا نانبائی سے زیادہ تعریف کا مستحق نہیں۔ اس نے فلسفے کے پاک شعلے کو بجھا کر اپنی آخرت بگاڑ دی۔ اس نے مائیلیٹس کو جو علم و حکمت کا گہوارہ تھا آنِ واحد میں جلا کر راکھ کر دیا۔ اور اس قدیم شہر کے علما کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ میں نے فلسفہ کی مشعل ہاتھ میں لی حالانکہ اُس نے کئی وطن پرست نوجوانوں کو بے رحمی سے قتل کیا اور عورتیں بیوہ ہو کر اس کی جان کو رو رہی ہیں۔ مَیں نے لوگوں کو مقدس آگ کی تعظیم سکھائی اور اُنہیں جہالت کے دھندلکے سے بچایا۔ کیا مَیں اس سونے اور زربفت کے طوُمار سے جسے لوگ بادشاہ کہتے ہیں، کئی درجے اچھا نہیں ؟

نپولین :۔ (قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر) اس شیخی خورے کی باتوں پر کان نہ دھرو، یہ فریبی ہے، مکار منطقی ہے، مداری ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ "فلسفہ کا سرد ہاتھ باغِ جنت کے پھولوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ فلسفہ فرشتوں کے پَر کاٹ دیتا ہے۔"
فلسفہ سے انسان کو کیا حاصل ہوتا ہے؟ اس کا احساس مردہ اور اس کا ذہن کند ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھ دنیا کے جلوؤں کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس کی زبان ضرور تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی تلوار کو زنگ لگ جاتا ہے۔ میں تلوار اور توپ سے وعظ کرتا ہوں۔ میں انسان کو سکھاتا ہوں کہ زندگی لڑنے اور حکومت کرنے کا نام ہے۔ ٹولون سے ماسکو اور مصر سے آسٹرلٹز تک میں نے دنیا کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ مَیں ایک حقیر کیڑے یا ذلیل فلسفی کی طرح دبک کر زمین پر نہیں رہنا چاہتا۔ میں لوگوں کو یہ تعلیم دیتا ہوں کہ اس گیند کو پاؤں سے ٹھکرا دیں۔ عزت صرف دلیروں کے لئے ہے اور اس آتشکدہ میں حکمرانی صرف میرا حق ہے +

نیٹشے :۔ پرومیتھیوس، اس بالشتئے کو اپنا دستور مقرر کرنے سے پہلے ایک بات میری بھی سُن لو۔ اس سے قابل بھی یہاں کوئی بیٹھا ہے۔ یہ کیا ہے؟ ایک بیوقوف بچہ جو آگ سے کھیلتے کھیلتے جل گیا ہے؟ یا ایک پاگل رقاص جو آتش فشاں پہاڑ پر ناچا ہے؟ اس نے دنیا بھر میں آگ تو لگا دی۔ مگر فائدہ کیا ہے؟ ...... یہ میرا ہی کام تھا جو میں نے پارس کے پُرانے پیر و مرشد کے جسم میں از سرِ نو رُوح پھونک دی اور دنیا کو جتا دیا کہ یہ تھا

زرتشت اور یہ تھا اس کا پیغام! میں نے انسانوں کو بتایا کہ کیڑوں کی طرح رینگنا شرم کی بات ہے۔ انسان بندر پر ہنستا ہے۔ اسی طرح دیوتا انسان پر ہنستے ہیں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ انسان سے بہتر ہو جاؤ، یہ تھا زرتشت کا پیغام اور یہی پیغام تھا جو میں نے دنیا بھر میں پھیلایا، تم قابل اور منصف ہو ہی، کہہ دو کہ کیا میں سب سے بڑا آتش پرست نہیں ہوں، کیا میری آگ مقدس ترین اور ابدی نہیں ہے؟

ایڈلسین:۔ میں بہرا ہوں لیکن سمجھ سکتا ہوں کہ تم کس مطلب کے لئے یہ تقریر کر رہے ہو۔ تم بھول گئے ہو کہ مجھ کو بھی ابھی کچھ کہنا ہے۔ جب میں دنیا میں آیا تو انسان تاریکی میں بھٹک رہے تھے۔ میں نے آسمان سے پوچھا کہ قدرت نے انسانوں کو کونسی مشعل دی ہے اور جواب آیا "گمراہ عقل!" تب میں نے کہا: "اے خدائے بزرگ و برتر دنیا میں اُجالا کر دے"۔ اور دنیا میں اُجالا ہو گیا۔ میں نے سائینس کی روشنی سے انسانوں کی رہبری کی اور انہیں علم کی دہلیز تک لے گیا۔ میں نے فطرت کو انسان کا مطیع کیا۔ اور پانی سے آگ پیدا کی +

پرومیتھیوس:۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ انسانوں میں ایسے جوہر قابل بھی ہیں جو دیوتاؤں کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ میں یہ فیصلہ تمہیں لوگوں پر چھوڑتا ہوں کہ میرا دستور کسے بنایا جائے؟

سب:۔ مجھے!

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک عورت نظر آتی ہے)

سب:۔ اری! یہاں مت آنا! ایوانِ شہرت میں تیرا کیا کام؟

پرومیتھیوس:۔ خاتون! اندر آ جاؤ! کیا تمہیں بھی کچھ کہنا ہے؟

خاتون:۔ میں ایک کشتری کی بیوی ہوں۔ وہ بہادر، شریف اور مذہب کا پکا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا۔ اگنی دیوتا نے اسے دھرم کی رکھشا کے لئے آگ سے پیدا کیا۔ وہ دھرم کے لئے آگ میں بھی کود پڑنے کو تیار تھا۔ وہ دیوتاؤں کے لئے لڑتا ہوا مارا گیا اور میں چتا میں جل کر اپنے پتی سے جا ملی۔ یہ ہے اُس کی داسی سرسوتی کی رام کہانی +

پرومیتھیوس: اے دخترِ ہند! تیری جتنی بھی تعریف کی جائے بجا ہے۔ تو عورتوں میں سب سے باوفا اور پاکدامن ہے۔ تیری پوجا سب سے اچھی اور بے غرض ہے +

(اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہے اور اُسے اپنا دستور مقرر کرتا ہے)

سب ہ۔ اے خاتون! واقعی یہ عزت تیرا ہی حق ہے۔

(سب اُس کے آگے جھک جاتے ہیں)

سرسوتی۔ وہ نوریں جام دے، ساقی کہ غم کافور ہو جائے
زمانہ بھر محبت کے نشے میں چُور ہو جائے

نہ کیوں آتش پرستوں میں ملے مجھ کو سرافرازی
مرے دل میں وہ شعلہ ہے، جہاں پُرنور ہو جائے

وہ شعلہ آتشِ اُلفت کا زرّیں، عنبریں شعلہ
کہ جس سے موت کے زنداں کی ظلمت دُور ہو جائے

عطاءُ اللہ کلیمؔ

تجلّیات

وفا و مہر کی جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
دیارِ حُسن کی ہم جانتے ہیں سب رسمیں

جہاں میں مجھ سا بھی بے اختیار ہو نہ کوئی
نہ وہ ہیں اور نہ دلِ بیقرار ہے بس میں

جو چاہوں پل میں مہ و مہر کی خبر لاؤں
عجیب ولولے ہیں شوقِ آسماں رس میں

انہیں غرور مجھے نازِ بے نیازی تھا
ملے مگر کبھی دل سے ملے نہ آپس میں

بڑا گھمنڈ ہے اکبرؔ کو پارسائی کا
خدا کرے کہ وہ آجائیں آپ کے بس میں

جلال الدین اکبرؔ

یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ خیال آتا ہے اکثر مرے دل میں کہ اگر	حسنِ خود کام مری طرح پریشاں ہوتا
دربدر جنسِ محبت کی گدائی کرتا	کو بکو عشق کے الطاف کا خواہاں ہوتا
دیکھتا عشق کی گرمی میں اگر کوئی کمی	سر ٹپکتا در و دیوار سے، نالاں ہوتا
سر پکڑ کر کبھی روتا، کبھی آہیں بھرتا	سینہ پر ہاتھ دھرے طالبِ درماں ہوتا
آتشِ شوق میں ہر دم جو جلاتا ہے مجھے	آپ دل سوختۂ آتشِ حرماں ہوتا
گامزن ہوتا رہِ حق پہ بتِ عربدہ جو	منکرِ مہر و وفا مائلِ ایماں ہوتا
وہ جو انکارِ مجسّم ہے وہ کرتا اقرار	کفر جس کا ہے مسلّم وہ مسلماں ہوتا
سامنے میرے کوئی مغبچۂ بادہ فروش	جامِ مے رکھ کے اس انداز سے رقصاں ہوتا
کہ زمیں رشکِ گلزارِ جناں ہو جاتی	اس کے جلوے سے چمن شعلہ بداماں ہوتا
پھر مرے سامنے رکھ دیتا وہ اک نامۂ شوق	عذرِ تقصیرِ جفا نامہ کا عنواں ہوتا
جسکی بیداد و جفا کا ہے جہاں میں چرچا	وہ جھکائے ہوئے سر عفو کا خواہاں ہوتا
اپنی ایک ایک جفا گن کے تأسف کرتا	میں جو چپ رہتا تو وہ اور پشیماں ہوتا

دیکھ سکتا نہ میں آنکھوں سے یہ رسوائیِ حسن

بھول جاتا گلۂ ہائے ستم آرائیِ حسن

عطاء اللہ کلیم

دو غزلہ

(۱)

محبت کے بہانے سے بس اتنا کام ہونا تھا
تمہارا نام ہونا تھا ہمیں بدنام ہونا تھا

مرا آغاز دیکھا تھا؟ مرا انجام بھی دیکھو!
پھر اس آغاز کا سوچو یہی انجام ہونا تھا

کسی صورت تو وہ الزام دیتے ہم غریبوں کو
کسی صورت تو ہم کو موردِ الزام ہونا تھا

جہاں بھر کے مصائب کس کی خاطر؟ دل کی خاطر تھے
اسی نسبت سے دل کو خوگرِ آلام ہونا تھا

دلوں کا حال کہہ ڈالا تھا ملتے ہی نگاہوں نے
بہانہ کچھ ترا اے نامہ و پیغام ہونا تھا

ہماری قدر و قیمت پہلے دن سے ہی مقرر تھی
ہمیں اے حسن تیرا بندۂ بے دام ہونا تھا

بڑھی آتی ہے تاریکی وقارؔ آلام و حسرت کی
محبت کی سحر کو اس طرح سے شام ہونا تھا

(۲)

زمانے بھر میں حسن و عشق کو بدنام ہونا تھا
محبت! آہ کیا تیرا یہی انجام ہونا تھا

جھکا دینا سرِ تسلیم یوں جوشِ محبت میں
یہی تھی بت پرستی تو اسے اسلام ہونا تھا

گدازِ روح و سوزِ دل اگر ہے امتحاں اس کا
تو اے دوزخ تجھے پھر عشق کا انعام ہونا تھا

مرا احسان حسن و عشق مانیں گے قیامت تک
مرے صدقے میں یوں رسمِ وفا کو عام ہونا تھا

مری ناکامیاں ہیں آپ کی ناکامیاں صاحب
مرا کام اس قدر تھا آپ کو ناکام ہونا تھا

مری تقدیر کے چکر میں دیکھا کس طرح الجھی
مخالف کچھ سمجھ کر گردشِ ایام ہونا تھا

وقارؔ آغاز ہی کہتا تھا۔ دیکھا ہم نہ کہتے تھے
ترے آغاز کا آخر یہی انجام ہونا تھا

وقارؔ (انبالوی)

راحت کدہ

خُدا کو ڈھونڈھ رہا تھا مگر خُدا نہ ملا
مجھے تو سجدے کو تیرا ہی آستانہ ملا

شباب تھا کہ خمستانِ کیف و سر مستی
جدھر نگاہ اُٹھائی شراب خانہ ملا

سُنا رہے ہیں وہ سب کو مرا فسانۂ عشق
ہماری جان گئی اُن کو اِک فسانہ ملا

تجھے خدا کی حقیقت کی کاوشیں زاہد
مجھے خود اپنی حقیقت کا کچھ پتا نہ ملا

ازل سے یاس کو کد ہے مری تمنا سے
ہزار چیز ملی دل کا مدعا نہ ملا

اب اشکبار ہوں انجامِ جستجو پہ اثرؔ
مجھے خدا تو ملا در د آشنا نہ ملا

(اثرؔ صہبائی)

جتنے منہ اُتنی باتیں

اس نے کہا" مرد بھی عجیب من موجی ہوتے ہیں"۔

اور میں نے بغیر سمجھے بوجھے کہ اس سے مراد تعریف ہے یا مذمت ہاں میں ہاں ملادی" بالکل ٹھیک ہے"۔

"حقیقت میں وہ پورا اُٹھیلو" ہے۔ رشک و بدگمانی اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بعض دفعہ تو مجھے کوفت ہوتی ہے کہ کیوں میں نے ایسے شخص سے اپنا دامن ہمیشہ کے لئے وابستہ کرلیا —— مجھے یقین ہے کہ اس کا زخم ابھی اچھا نہ ہوا ہوگا"۔

"تمہارے شوہر کا زخم ۔اوہ — مگر وہ ......"

اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ میری ناسمجھی پر اظہارِ ہمدردی کر رہی ہے ۔

"کب زخمی ہوا ۔ کیسے ؟"

وہ بولی" نہیں نہیں ۔ میرا شوہر زخمی نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک نوجوان کا سر زخمی کیا"۔

میں نے اس کی طرف کچھ اس طرح دیکھا گویا ۔ یہ معمّا میری عقل کے احاطہ سے باہر ہے ۔

وہ سمجھ گئی" اوہو! میں بھول گئی کہ تمہیں اس واقعہ کی خبر ہی نہیں"۔

مجھے یہ معلوم کرکے بڑا اطمینان ہوا کہ غلطی میری نہیں بلکہ اُسی کی ہے ۔

اُس نے کہا" تقریباً تین ہفتے پہلے میں اپنے شوہر کے ساتھ گھر آرہی تھی ۔ ہم پارک میں سے گزر رہے تھے اور وہ ایک بنچ پر بیٹھا تھا ۔ میرے جسم پر بیر بہوٹی کے رنگ کی ساڑھی تھی جو پارک کی سبزی کی وجہ سے عجب بہار دے رہی تھی ۔ پیدل چلنے کی وجہ سے گال سُرخی مائل ہوگئے اور تھکن کے سبب چال میں لغزشِ مستانہ پیدا ہوگئی تھی ۔ وہ مجھے دُور سے گھور رہا تھا جوں ہی ہم اُس کے قریب سے گزرے اس کی طبیعت بے قابو ہوگئی ۔ وہ دفعتاً اٹھا اور میرے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر بھلانے سے کہنے لگا" کیا آپ مجھے دیا سلائی عنایت فرمائینگے ؟" میرے شوہر نے ہاتھ چھڑا لیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ جھک کر ایک اینٹ اُٹھائی اور اس کے سر پر دے ماری ۔ وہ دھم سے زمین پر آرہا"۔

(۲)

اس سے رخصت ہو کر میں چلا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کے شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں۔

"ہیلو!" میرے منہ سے نکلا "تم ہو۔ خوب ملے۔ سنا ہے کہ آج کل تم لوگوں کے سر توڑنے کی مشق کر رہے ہو۔"

وہ ہنس پڑا "اچھا تو تم میری بیوی سے باتیں کر رہے تھے ——— بھئی میں تو محض اس کو حسن اتفاق سمجھتا ہوں کہ فوراً ہی اینٹ میرے ہاتھ لگ گئی ورنہ سوچو تو میری جیب میں پندرہ سو روپے تھے اور میری بیوی کے کانوں میں ہیرے کے بندے۔ پارک میں سناٹا تھا اور اطراف واکناف پر بھی ویرانی برس رہی تھی ———"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں لوٹنا چاہتا تھا؟"

"ایک سنسان مقام پر ایک غنڈا ہمیں ملے اور دیا سلائی کے بہانے سے تمہارا ہاتھ پکڑ لے ...... یہ اب تمہاری سمجھ پر موقوف ہے کہ تم اسے جو جی چاہے سمجھ لو۔"

"اچھا تو اسی لئے تم نے اس کا سر توڑ دیا؟"

"ایسے موقعوں پر میں ہمت واستقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔"

میں اجازت لے کر آگے بڑھا۔

(۳)

"اماں کہاں!" میرے کانوں میں آواز آئی۔

میں رکا اور پلٹ کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرا ایک دوست جس کو تین ہفتوں سے میری آنکھیں ڈھونڈھ رہی تھیں میرے سامنے کھڑا ہے۔

"ارے یہ کیا! سر پر کیا لپیٹ رکھا ہے؟"

"میں ابھی دواخانے سے واپس آرہا ہوں۔"

"کیوں؟ کوئی زخم ......"

وہ مسکرایا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "تم جانتے ہو کہ کوئی پاگل حال ہی میں پاگل خانہ سے فرار ہوا ہے؟"

میں نے ذومعنی گردن ہلانا ہی ایسے موقع پر مناسب خیال کیا۔

"بات یہ ہے کہ مجھ پر ایک پاگل نے تین ہفتے ہوئے حملہ کر دیا تھا۔"

میں نے بیساختہ چلا کر کہا "تین ہفتے ہوئے۔ کیا پارک میں؟"

"ہاں پارک میں۔ شاید تم نے اخبار میں دیکھا ہو گا ــــــــ میں پارک میں ایک بنچ پر بیٹھا تھا اور سگریٹ پینے کے لئے بے چین تھا۔ مگر کم بخت دیا سلائی نہ تھی۔ سوچ میں تھا کہ کوئی شریف آدمی اس طرف سے گزرے تو مانگ لوں۔ یکایک ایک شخص ایک چھڑی کے ساتھ قریب سے گزرا۔ وہ سگرٹ پی رہا تھا۔ میں فوراً اس کے قریب گیا اور نہایت انسانیت کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیا آپ دیا سلائی عنایت فرمائیں گے؟" ـــ اس کے بعد کیا ہوا تم سمجھ سکتے ہو؟ ـ وہ پاگل تھا اور اس نے کوئی چیز اٹھا کر میرے سر پہ دے ماری اور میں وہیں بے ہوش ہو گیا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "کیا وہ واقعی پاگل تھا؟"

"یقیناً! اور تمہیں ابھی تک شبہ ہے۔"

(۴)

ایک گھنٹہ بعد میں مقامی اخبار کے پرانے پرچے تلاش کر رہا تھا۔ آخر کار جس کی مجھے تلاش تھی وہ مل ہی گیا۔ ایک مختصر سی خبر حادثوں کے کالم میں درج تھی:ـــ

"کل صبح پارک کے نوکر نے ایک شخص کو بنچ پر زخمی پایا۔ اس کے کاغذات سے جو جیب سے برآمد ہوئے ظاہر تھا کہ وہ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ نشے میں چور تھا اور اس نے بدمستی کے عالم میں قریب کی ایک اینٹ سے اپنا سر پھوڑ لیا تھا۔"

سید بادشاہ حسن

غزلیات

(۱)

زلف رُخ سے ہٹائی جاتی ہے اور الجھن بڑھائی جاتی ہے
ہم سُناتے ہیں اپنا افسانہ اور اُنہیں نیند آئی جاتی ہے
آ رہا ہے وہ آج جام بکف شیخ جی پارسائی جاتی ہے
مجھ کو حیرت ہی میری آنکھوں نیں ساری دُنیا سمائی جاتی ہے
غور سے دیکھئے تو شانِ خدا اِن بُتوں میں بھی پائی جاتی ہے

ہو نہ بدنام نامِ عشق اعظم
لوحِ تربت مٹائی جاتی ہے

اعظم لکھنوی

(۲)

مجھے احساسِ الفت ہو رہا ہے کوئی ناآشنا اب آشنا ہے
یہاں کیا نالۂ پیہم کی توقیر یہاں گونجی ہوئی تیری صدا ہے
کہاں جائیں ترے در کے سوا ہم یہاں سے کے تیرا آسرا ہے
فریبِ آرزو تک زندگی تھی دل اب جینے سی اُکتایا ہوا ہے

نہ جانے کس کا وارفتہ ہے انور
بہر صورت کسی کا ہو چکا ہے

ابوالمقصود انور
(گورداسپوری)

(۳)

آپ سے مجھ کو محبت ہو گی اور کیا وجہِ شکایت ہو گی
مضطرب ہے نگہِ شوق ہنوز ابھی دل میں کوئی حسرت ہو گی
اُن کی محفل میں تھا کل ذکر کوئی مری رُودادِ محبت ہو گی
کیوں کیا اُن سے تقاضائے وفا ہم نہ کہتے تھے ندامت ہو گی
جو ترے وصل سے وابستہ ہے کوئی حسرت سی وہ حسرت ہو گی
ہجر کی رات وہ دل کا کہنا! اور ابھی کوئی قیامت ہو گی
گر یہ دنیا ہے تو اے میرے خُدا کتنی دلکش تیری جنت ہو گی
ہے یقیں دل کی تمنا پُوری ہو گی اور اُن کی بدولت ہو گی

یادِ ایّام کہ کہتے تھے حفیظ
ہائے کیا چیز محبت ہو گی

حفیظ ہوشیارپوری

(۴)

...ت جب اُنکے ہاں آ یا گیا ہوں یہ ہوتا تھا کہ ٹھکرایا گیا ہوں
حریمِ کعبہ میری آبرو رکھ صنم خانے سے اُٹھوایا گیا ہوں
شریکِ بزم ہوں دل کی بدولت میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

مجھے احباب نے ڈھونڈھا ہی جب شاد
اُن ہی کی بزم میں پایا گیا ہوں

شاد عارفی رامپوری

دنیائے ادب

حسنِ نسوانی کی دو تصویریں

کلوپیٹرا

باغ کی روش کی آخری حد پر ایک کشادہ شاہی حمّام ہے ــــــ تیرنے کا ایک تالاب جس کے چاروں طرف سنگِ سماق کی براق سیڑھیاں بلوریں پانی میں ڈوبتی ہوئی، پسے ہوئے سونے کے ریتے تک جا پہنچی ہیں۔ کناروں کے گرد حسین عورتوں کے مجسّمے کھڑے ہوئے عطر کی پھوار سے تالاب کی آئینہ پوش سطح پر ایک نقرئی بارش کے ستارے ٹانک رہے ہیں۔ بالائی زینے پر کلوپیٹرا احساسِ حسن کے ناز و غرور میں استادہ ذرا سی آگے کو جھکی ہوئی ہے، لوئی فلک کے اُس رنجوردہ مجسمے کی طرح معلوم ہو رہی ہے جو اپنی چوکی سے اترا ہی چاہتا ہو۔ اس کے مصفا رخساروں پر جو اَن بوجھے تاثرات سے زرد نظر آتے ہیں اس وقت ہلکے گلابی رنگ کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور اُس کی عنبر کی سی سفید کنپٹی پر نیلگوں رگوں کا موہوم سا سراغ مل رہا ہے۔ قدیم مجسّموں کی طرح اس کی نیچی کشادہ اور روشن پیشانی ایک ادائے حسن کے ساتھ اُس کی چھوٹی سی خوبصورت ستواں ناک سے ملی ہوئی ہے۔ اور اس کے نازک اور گلگوں نتھنے شیرنی کے نتھنوں کی طرح پھڑک رہے ہیں۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے تنگ ہیں اور ابروؤں کا بظاہر خطِ راست ایک خفیف سا خم دکھا رہا ہے۔ اس کے تنگ اور گول دہن کے بالائی لب کی خمیدگی سے ایک نفیس قوس پیدا ہو رہی ہے اور نیچے کا لال، رسیلا ہونٹ زندگی اور اُس کی مسرتوں کی ایک ایسی آتشیں لذت شناسی کی چغلی کھا رہا ہے جو الفاظ کی شرمندۂ احسان نہیں ہو سکتی۔ اُس کے بال سمندر کی دیبیوں کی طرح نرسل کی شاخوں اور کنول کے پھولوں سے گندھے ہوئے ہیں اور سفید پیراہن اُس کی نازک کمر کے طلائی پٹکے سے گذرتا ہوا برف کے سفید گالوں کی طرح نیچے گر کر اس کے قدم لے رہا ہے۔

وہ اپنے پاؤں کی ایک گلابی ایڑی سے پانی کو جانچنے کے لئے چھو رہی ہے۔

میوزیڈورا

میوزیڈورا اٹھارہ سال کی نوخیز حسینہ ہے۔ اُس کی اخضری آنکھیں سمندر کے پانیوں کی یاد دلاتی ہیں کسی شاعر کا تخیل کبھی اُس سمائی حسن کا اتنا صحیح تصور پیش نہیں کر سکا۔ اُس کا ملکوتی بدن جس پر پکے ہوئے پھل کی طرح اپنی ہی گدراہٹ

کا روپ چھا رہا ہے۔ نورِ باطن سے بھی منور نظر آتا ہے۔ اُس کے خوبصورت ریشمیں بال جو اس قدر باریک ہیں کہ ہوا کے خفیف سے جھونکے میں بھی لہرانے لگتے ہیں۔ سنہرے مرغولوں کا ایک جھرنا بن کر موتیوں کے تاج سے نیچے گرتے ہوئے اُس کے شانوں کی بلائیں لے رہے ہیں۔ ہلکا سبز لباس اُس کی گردن اور بانہوں کی سفیدی کو اجاگر کر رہا ہے۔ اور اُس کی مرمر فام کلائی میں زبرجد کا ایک ننھا سا سانپ جس کی دونوں آنکھوں میں لعل دمک رہے ہیں چوڑی کی طرح لپٹا ہے اس کے تنگ دہن پر معصومیت اور دلگیری کی باہم آمیزی نے نیکی کے ایک ایسے مرمریں مجسمے کی طرح ملال کی جھلک پیدا کر دی ہے جو سیاہ کار دنیا سے دوچار ہو رہا ہو۔

لیکن زیادہ باریک نظر اُس کے چہرے میں اس قدسیت سے فروتر ایک چیز بھی دیکھ سکتی ہے۔ ان مضمحل آنکھوں میں جن کی پتلیوں میں زرد ڈورے جھلک رہے ہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اُنہیں کسی ڈیلیلہ کی شیریں اور جفاکیش آنکھوں سے مشابہ بنا رہی ہے۔ اس کے گلاب کی پتی کے سے نازک اور نفیس کنج لب پر رہ رہ کر بیغارہ جوئی یا تند خوئی کی تلملاہٹ سے ایک اینٹھن سی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک اُڑتی ہوئی ناگن کے دنبالے کی تڑپ پیچ و تاب کھا رہی ہے اس کی نگاہ بے مقصد ادھر اُدھر بھٹک رہی ہے اور اُس کے سُرخ لب کھلے ہیں۔

وہ سامنے پڑے ہوئے ساغر سے بے پروا، جنت سے نکلے ہوئے کسی فرشتے کی طرح دنیا سے بیزار بیٹھی ہے۔

یہ اُس ہزار پہلو نگار خانے کی صرف دو تصاویر کے نمونے ہیں جسے حیرت کار فرانسیسی فنان گوتیے کے خوابِ حسن کی دلآویز آفرینش نے فردوسِ خیال بنا رکھا ہے۔

"ہمایوں"　　　　حامد علی خاں

ہندی

چاند سے

تو چپکے سے آسمان پر آکر کسے دیکھا کرتا ہے؟ اور اپنی خاموش زبان میں کس سے کیا کہا کرتا ہے؟

کیا اس نئی دنیا کو دیکھ تو حیران رہ جاتا ہے، جو تو اس طرح ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا ہے کہ تیری آنکھیں بند ہی نہیں ہوتیں؟

تو تاروں کی کوڑیوں سے کون سا کھیل کھیلا کرتا ہے، جس کو ہر رات ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا ہے؟

جب تپش سے تمام دنیا بیچین ہو جاتی ہے تو کیا تو ٹھنڈی شعاعوں کی بارش کرنے آتا ہے؟
یہ تیرے سینے پر سیاہ داغ کیسا ہے جس نے تیرے حسن کو بدنما کر دیا ہے؟
کیا تو نے اپنے قلب کی روشنی تاروں کو تقسیم کر دی ہے جس سے تیرا دل تاریک نظر آ رہا ہے؟
تُو نے کتنی نازک کلیوں کو قبل از وقت ہی اپنے ہاتھوں سے مسل دیا، کیا وہی گناہ تو تیرے سینے پر نہیں لدا ہوا ہے؟
یا یہ حسینۂ شب تو تیرے سینے پر سر رکھ کر نہیں سوئی ہوئی ہے، جس کے کالے کالے بال نظر آ رہے ہیں؟
یہ کائنات جو آہیں بھرتی ہوئی چکر لگا رہی ہے اس کی آتشیں آہوں سے تو تیرا سینہ نہیں جل گیا ہے؟
یہ ہر شب تُو نحیف و نزار کیوں ہوتا جاتا ہے؟ تجھے کون سی تکلیف ہے جس سے تیری حالت یُوں دگرگوں ہوتی جاتی ہے؟
تجھے ایسا کونسا صدمہ ہے، جو تو کچھ منہ سے نہیں بولتا؟ کیا یہ شبنم کی صورت میں تیرے ہی آنسو بہا کرتے ہیں؟
کیا دنیا کی آتشیں آہوں سے تیرا جسم پگھلا جاتا ہے؟ پھر قدرت سے دوا پاکر آہستہ آہستہ تندرست ہو جاتا ہے؟
یا جب تو نیلوفر کو پژمردہ دیکھتا ہے تو آنسو بہا کر اس سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے؟
اور اس طرح غم میں گھُل گھُل کر تو اپنے کو تباہ کر ڈالتا ہے۔
تیرے سینے پر اپنا سا سیاہ داغ دیکھ کر کالے کالے بادل تجھے گھیر لیتے ہیں، یا تو خود اپنے دل کی سوزش سے بیقرار ہو کر بادلوں کو بُلا لیتا ہے اور کچھ دیر اُن کے اندر رہ کر اپنے دل کی آگ بجھاتا ہے؟

ابو محمد امام الدین

انگریزی
شیریں اُمید

جس وقت میں تنِ تنہا روشن آگ کے سامنے بیٹھوں، رنج و الم اور مایوسی میرے دل کے سمندر میں ایک تلاطم پیدا کر دیں، جب خوشگوار خیالات میرے دل کو نہ بھائیں اور مجھے شجرِ زندگی بارآور ہوتا نظر نہ آئے تو پیاری اُمید! شیریں اُمید!! اپنے مرصع پروں کو میرے سر پر جنبش دے اور میرے شکستہ دل کو اک بار پھر جوڑ دے۔
شب کے اُس حصہ میں جب ماہتابِ عالمتاب اپنی آدھی منزل گذار چکا ہو، جب میں اس جگہ محوِ خرام ہوں جہاں قدآور درختوں کی وجہ سے چاند کی سیمیں شعاعیں زمین کو منور نہ کر سکیں، مایوسی اور رنج و الم اپنی بھیانک صورت سے خوف دلائیں

تو شیریں اُمید! تو ان درختوں کے پتّوں میں سے جھانک اور مایوسی و مردہ دلی کو مجھ سے کوسوں دور کر دے۔

جب نا اُمیدی کی مہیب صورت میرے دل و دماغ پر تسلط کرلے اور میرے تمام سنہری اور زرّیں خوابوں کو آن واحد میں نیست و نابود کر دے، تو شیریں اُمید! تو اپنے درخشاں چہرے سے جو آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتا ہے نا امیدی کا تعاقب کر اور اُسے اس طرح غائب کر دے جس طرح طلوعِ آفتاب ملکۂ شب کو غائب کر دیتا ہے۔

جب میرے عزیز و اقارب زمانہ کے انقلاب سے اقبال مندی کے سنہری زینے سے یک دم نیچے گر پڑیں اُن کے شکستہ دلوں اور افسردہ چہروں کو دیکھ کر میرے سینہ میں درد اُٹھے تو اے روشن اور حسین چہرے والی امید! میرے ناگوار خیالات کو خوشگوار بنا، مجھے مسرتِ حقیقی سے لطف اندوز کر، اور اپنے دیدہ زیب سنہری پروں کو میرے سر پہ جنبش دے۔

جب میں والدین کی اُلفت یا کسی حسینہ کی محبت سے شادکام نہ ہو سکوں، اُن کی بے مروّتی سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو شیریں اُمید! میرے دل میں یہ خیال جما دے کہ میرا نالہ و فغاں بیکار و فضول ثابت نہ ہوگا۔ بلکہ اُس کا انجام خوشگوار ہوگا۔

جس طرح شاہانہ آب و تاب سے کوکبِ درخشاں، سیاہ بادلوں پر سنہرا ملمع کرتا ہے، اور فلک کے نقاب پوش چہرے کو جگمگا دیتا ہے، اسی طرح جب تاریک و ناگوار خیالات میری زخمی روح پر چھا جائیں تو اے شیریں اُمید!! اپنے سنہری پروں کو میرے سر پہ جنبش دے، کیونکہ یہی پر فردوسِ بریں میں اپنی نقرئی درخشانی پھیلا رہے ہیں ......

سرور جہاں رعنا

شاعر کا دل

تم اپنی خام عقل کے ساتھ شاعر کے دل کو معلوم کرنے کی بے فائدہ کوشش مت کرو ــــ ہاں اپنے آپ کو مت ہلکان کرو ــــ کیونکہ تم اس کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکتے!

وہ موتیوں کے شفاف دریا کی طرح ہر وقت رواں ہے، روشنی کی طرح چمکدار، اور ہوا کی طرح صاف ہے!

اَے سیاہ بھنوؤں والے منطقی! قریب مت آ، کیونکہ یہ تمام کی تمام جگہ مقدس ہے۔

اَے ریا آلود خندہ، اور اے حقارت آمیز نظر! قریب مت آ، کیونکہ میں ہر خوشبودار جھاڑی کے مشکبار پھول کو جو اس

مقدس جگہ کو گھیرے ہوئے ہیں آب حیات سے بھر رہا ہوں، اور یہ پھول تیری تصنع آمیز مسرت سے مرجھا جائیں گے ——— ہاں تیری موت آفریں آنکھیں، اور انجماد انگیز سانس سے یہ نازک پودے مرجائیں گے۔

اے خام عقل انسان جس ماحول میں تو کھڑا ہے، وہاں تو جنگلی پرندوں کا شور و غوغا نہیں سن سکتا!

باغ کے مرکز میں مسرور پرندے چہچہاتے ہیں ...... وہ خاموش ہو جائیں گے اگر تو وہاں نمودار ہوگا۔

باغ کے وسط میں چشمے کا پانی پست شیریں آواز سے بجلی کی طرح لرزاں و رقصاں ہے! دن رات یہ مسلسل اُس اودے رنگ کی پہاڑی پر سے یہاں آرہا ہے، جو بڑی مسافت پر واقع ہے۔

پہاڑی اسے آسمان سے کھینچتی ہے اور اس طرح یہ زمین پر اُتر کر غیر فانی نغمہ پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی آواز اس درجہ صاف اور ترنم ریز ہے ——— مگر اے خام عقل انسان! تو اسے نہیں سن سکتا ...... تیرے کان اس قدر کم ظرف ہیں!

اس لئے تو وہاں ہی رہ، جہاں تو کھڑا ہے۔ یہ زمین میں غائب ہو جائیگا، اگر تو قریب آیا۔

گوشِ ہوش سے سن لے "شاعر کا دل اُن تمام قدرتی آوازوں اور مناظر کا مسکن ہے، جہاں تک تیری رسائی نہیں"!

طاہر قریشی

فارسی

شکاری کی توبہ

شکاری اب بوڑھا ہو گیا تھا جنگل میں جانے کی ہوس اور شکار کرنے کی قوت مفقود ہو چکی تھی۔ بیماری نے اُسے بالکل نحیف و زار بنا دیا تھا۔ وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بزرگ باپ کی نصیحتیں سُننے کے لئے اُس کے بیٹے اور پوتے اُس کے اردگرد جمع تھے۔ اُس نے ایک آہ بھری۔ اپنا سر اُٹھایا اور اپنی کمزور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"بچو! یہ میرا آخری وقت ہے، مَیں مر رہا ہوں۔ آہ! مَیں گنہگار ہوں۔ مَیں نے بہت ظلم توڑے ہیں۔ اپنی زندگی میں بہت سی جانوں کا شکار کیا ہے۔ مَیں نے بے دریغ اُن پر گولیاں چلائی ہیں۔ اُن کو تڑپتے ہوئے چھُریوں سے ذبح کیا ہے۔ اُف! اس طرح اُن کی موت کا تماشا دیکھا ہے۔ آج وہ سب میری جان کنی کی حالت کو دیکھ کر لطف اُٹھا رہے ہیں۔ اُدھر دیکھو! وہ مقتول ہرن کھڑے ہنس رہے ہیں۔ وہ خون سے لت پت مرغابیاں خوشی سے کس طرح چلا رہی ہیں

یہ بہت سے پرند یہاں کیوں جمع ہیں؟ شاید اپنے مقتول بھائیوں کو طلب کر رہے ہیں"۔

بچوں نے حیرت و استعجاب سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی جانور نہ پایا۔ سب نے مخاطب ہو کر کہا "جناب! یہاں تو ایک بھی ہرن اور مُرغابی نہیں ہے۔ آپ اس وقت شاید کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کیجئے۔ ہم سب ڈرے جاتے ہیں"۔

بوڑھے شکاری کی باچھیں ایک ڈراؤنی ہنسی کے ساتھ کھل گئیں۔ کسی خاص خوف کے باعث اُس کے بدن میں ایک کپکپی پیدا ہوئی۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"نہیں۔ میرے عزیز بیٹو! میں اُن سب کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اُن کے گوشت کے بہت سے لذیذ کھانے تیار کئے ہیں۔ عرصۂ دراز تک اُن کی ہڈیاں چبا کر اپنے ہونٹ چُوسے ہیں۔ ریشمی جال اور کانٹے، بندوقیں اور چھریاں سب اس کی گواہ ہیں۔ بیٹو! ان لذیذ کھانوں کی کبھی خواہش نہ کرنا۔ ان نفسانی ذائقوں سے ہمیشہ احتراز کرنا۔ ورنہ جس طرح میں تکلیف سے مر رہا ہوں تم بھی اسی میں مبتلا ہو گے"۔

نوجوان بچے اپنے باپ کی نصیحت بغور سُن رہے تھے وہ سب ایک زبان ہو کر بولے "نصیحت تو درست ہے۔ بشرطیکہ ہم آپ کے مشورے پر عمل کر سکیں۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کے ساتھ شکار میں جاتے جاتے شکار کا گوشت کھانا ہماری عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم خود شکار نہ کریں بلکہ شکار منگا کر اُسے خود بنا لیا کریں۔ اس طرح ہم گناہ سے بچ جائیں گے اور ہمارے کھانے کو بدستور شکار ملتا رہیگا۔ آپ دیکھیئے! تین روز شکار میں نہ جانے سے ہم کس قدر کمزور ہو گئے ہیں"۔

بوڑھے شکاری نے ایک آہ سرد کھینچی اور سوکھی ہوئی زبان کو اپنے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر بیٹا! اپنی خوراک میں اعتدال رکھنا۔ اور ہاں ایک مرغابی کی یخنی اور ہرن کے کباب تو شاید میرے لئے بھی مفید ہونگے"۔

سیّد یوسف بخاری دہلوی

بنگالی

میرا گیت

جب میں دنیا کو اپنے گیتوں کے ذریعہ سے دیکھتا ہوں اس وقت میں اُسے پہچان لیتا ہوں۔

ہاں، اُس وقت اس کی روشنی کی زبان فضا کو محبت سے بھر دیتی ہے اور اس کے ریت کے ذرّے سچائی کے پیغام بھیجتے ہیں وہ لہر باہر نہیں رہتی بلکہ میرے سینہ میں آکر سما جاتی ہے۔ میرا دل رقصاں پتّوں کی طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ خیالات ایک مسرتِ عظیم کے چشمہ میں مل جاتے ہیں۔ اور میں اپنی ہستی کو دنیا سے سرگوشی میں نامہ و پیام کرتے ہوئے پاتا ہوں۔

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

انعامی مقابلہ

پچاس روپے کے انعامات کا سلسلہ

انعامی مقابلہ نمبر (۱)، بابت ماہِ نومبر کا نتیجہ

ہم نہایت مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ نومبر کے مقابلہ (بزمِ شعرا) میں مندرجہ ذیل اصحاب نے انعامات حاصل کئے۔ چونکہ ایک حل بھی ایسا موصول نہیں ہوا، جو مکمل طور پر صحیح ہو، اس لئے انعام کی رقم چار صاحبوں میں درجہ وار تقسیم کی گئی ہے۔

پہلا انعام پچیس روپے۔

سید علی حسین صاحب زیبا رضوی۔ مقام اٹیا تھوگ۔ ضلع گونڈہ نے حاصل کیا ہے۔

دوسرے دو انعام دس دس روپے کے

(۱) محمد حسن صاحب۔ ایچ۔ بی۔ او۔ ٹی۔ پرشین ٹیچر ایم بی ہائی سکول مکتسر ضلع فیروز پور

(۲) مسعود احمد خاں صاحب معرفت کتب خانہ عثمانیہ بیرون شیرانوالہ گیٹ لاہور نے حاصل کئے ہیں۔ ان کی دو دو غلطیاں ہیں۔

تیسرا انعام پانچ روپے کا

بشیشر ناتھ صاحب ناتھ سوک کلاں ضلع گجرات نے حاصل کیا ہے۔ ان کی تین غلطیاں ہیں۔

انعامات کی رقوم ان صاحبوں کو بذریعہ منی آرڈر ارسال کی جا رہی ہیں۔

ان تین انعامات کے علاوہ ایک انعام "مشقِ ادب" کا سید اخلاق حسین صاحب دہلوی، اُردو ٹیچر جے وی ہائی سکول بڑوت ضلع میرٹھ کے نام لکھا ہے جنہیں پندرہ روپے کی کتابیں بھیجی گئی ہیں۔

ماہِ دسمبر کے مقابلہ کا حل حسبِ ذیل ہے

(۱) دِلّی		(۲) سکندر آباد		(۳) نیشا پور		(۴) گلبرگہ		(۵) قاہرہ

(۶) پیشاور (۷) ہرات (۸) پٹھان کوٹ (۹) آگرہ (۱۰) چمن (۱۱) پانی پت (۱۲) شاہدرہ

اگر آپ کا حل اس حل کے مطابق ہے یا اس میں زیادہ سے زیادہ تین غلطیاں ہیں۔ تو آپ ایک اطلاعی کارڈ ۲۱ فروری ۱۹۳۴ء تک ایڈیٹر مقابلہ ادبی دنیا پوسٹ بکس ۱۹۷ کے نام ارسال کر دیں۔ موصولہ مطالبات کی جانچ کرنے کے بعد انعام کی رقم کامیاب اہلِ مقابلہ کو ارسال کر دی جائیگی اور اُن کے نام اور پتہ کا اعلان فروری کی اشاعت میں کر دیا جائے گا۔

انعامی مقابلہ نمبر ۳

پچاس روپے کے انعامات

قواعد۔ ۱۔ اگلے صفحے پر ۱۲ اشارات کا ایک سیٹ ہے۔ ان میں سے ہر اشارہ ایک لفظ کی تشریح کرتا ہے، آپ کو صرف اس قدر سوچنا ہے کہ کونسا لفظ کس اشارے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اشارہ نمبر ۱ کی تشریح نیلم ہے۔ باقی گیارہ الفاظ آپ کو دریافت کرنے ہیں یہ سب الفاظ اس فہرست میں موجود ہیں جو اشارات کے نیچے دی گئی ہے۔

۲۔ تمام نام چھپے ہوئے کوپن پر جو اگلے صفحہ پر دیا گیا ہے نمبروار درج کر دیں اور کوپن کے باقی اندراجات پُر کر کے کوپن پر دو آنے کا ٹکٹ چسپاں کر دیں اور اُسے ایک لفافہ میں بند کر کے مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ انعامی مقابلہ نمبر ۳۔ دفتر ادبی دنیا پوسٹ بکس ۱۹۷ لاہور۔ کوپن کے اندراجات میں اگر کوئی کاٹ چھانٹ ہوئی تو اُسے شاملِ مقابلہ نہیں کیا جائیگا۔

۳۔ آپ اپنے ارسال کردہ حل کی ایک نقل اپنے پاس رکھ لیں۔ تاکہ جب ایڈیٹر مقابلہ کا حل اگلے پرچے میں شائع کیا جائے تو آپ اپنے حل کی صحت یا غلطی جانچ سکیں۔ جو حل ایڈیٹر مقابلہ کے حل کے مطابق ہوگا اسے صحیح تصور کیا جائیگا اور ارسال کرنے والے کو مبلغ پچاس روپے کا انعام دیا جائیگا۔ اگر کوئی حل بھی صحیح نہ ہوا تو وہ حل انعام کا مستحق ہوگا جس میں سب سے کم غلطیاں ہونگی اگر ایک سے زیادہ حلوں میں کم از کم غلطیاں ہوئیں تو انعام کی رقم حقدار اہلِ مقابلہ میں ایڈیٹر مقابلہ کی صوابدید کے مطابق تقسیم کر دی جائیگی۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر مقابلہ کا فیصلہ قطعی اور قانوناً قابلِ تسلیم ہوگا۔

۴۔ اگر وصول شدہ ٹکٹوں کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے بڑھ گئی تو انعام کی رقم بھی اسی نسبت سے بڑھا دی جائیگی۔ اور اگر کم رہی تو ہم اپنا یا اپنے پاس سے ادا کر کے پچاس روپے پورے کر دیں گے۔

۵۔ حل دفتر ادبی دنیا میں ۱۲ فروری ۱۹۳۴ء کی شام تک وصول ہو جانے چاہئیں۔ بعد میں آنے والے حل شاملِ مقابلہ

فہرست مضامین

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۴ء

تصاویر:- (۱) اقلیم خداوندی کا سفر (۲) آئین سٹائن

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	آئینۂ عالم	منصور احمد	۲
۲	اسرار حیات (نظم)	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے	۸
۳	دام اسپیلا (افسانہ)	حضرت حمدی	۹
۴	احسن الکلام (نظم)	حضرت احسن مارہروی	۱۷
۵	آئین سٹائن اور نظریۂ اضافیت	حضرت نسیم رضوانی ایم اے	۱۸
۶	عناصر داستان (نظم)	جناب سید عبدالحمید صاحب عدم	۲۴
۷	حضرت اثر صہبائی کا رنگ تغزل	حضرت فگار	۲۵
۸	منوہر روگ (گیت)	جناب پنڈت امرچند صاحب قیس جالندھری	۳۹
۹	جواب خیال (افسانہ)	منصور احمد	۴۰
۱۰	غزل	ندیم	۴۵
۱۱	چھم کے آغا نے بلی پالی	جناب محترمہ ملقبیس عابد علی صاحبہ	۴۶
۱۲	نوائے راز	حضرت راز چاندپوری	۴۹
۱۳	جواب بے نیازی (نظم)	حضرت صدق جائسی	۵۰
۱۴	بیبے کی ترقیاں (افسانہ)	منصور احمد	۵۱
۱۵	غزل	حضرت حفیظ ہوشیارپوری	۵۳
۱۶	اہل عراق کی موجودہ زبان	جناب مولوی منظور حسین صاحب ماہر القادری	۵۴
۱۷	رباعیات فراق	جناب پنڈت رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری	۵۹
۱۸	محبت کی … (افسانہ)	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے	۶۰
۱۹	نتیجے (نظم)	ح ب	۶۲
۲۰	ایک سیاح کا روزنامچہ	جناب سید معین الحق صاحب حقی بی اے آنرز	۶۳
۲۱	کائنات تغزل	حضرت وقار انبالوی	۶۷
۲۲	سفر کشش (افسانہ)	حضرت محشر عابدی ایم اے	۶۸
۲۳	غزل	حضرت نظر اوجلوی	۷۲
۲۴	دنیائے ادب		۷۳
۲۵	انعامی مقابلہ		۷۴
۲۶	نقد و نظر		۸۰

آئینۂ عالم

تعلیم اور ماحول

شریمتی سورج ویاس جو ممالکِ یورپ میں ایک لمبے تعلیمی دورے سے حال ہی میں واپس آئی ہیں وہاں کے مدارس اور اُن کے ماحول کی نسبت کہتی ہیں:-

جو کچھ میں نے یورپ میں دیکھا ہے اس میں سب سے زیادہ گہرا نقش میرے دل پر وہاں کی باآئین آزادی کا ہے۔ جب آپ ان مدارس میں جاتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ بچے اپنے قول و عمل میں آزاد اور خوش ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی کوئی حرکت بے مصرف اور بے کار نہیں، اُن کے ہر کام میں ایک انداز اور سلیقہ ہے، ہر کام کا ایک مقصد ہے۔ مدرسے کی تمام سرگرمیاں، مثلاً پڑھائی، کھیل، جسمانی اور دماغی تربیت ہر ایک بات کسی خاص مطمحِ نظر کو سامنے رکھ کر تجویز کی جاتی ہے +

مدارس کو ایسا بنایا گیا ہے اور کام کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ بچے طبعی طور پر مصروف رہنا اور اپنی استعداد کا کوئی نتیجہ خیز اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً جب کھانے کا وقت آتا ہے، یعنی جب وہ بھوکے ہوتے ہیں تو وہ اپنے کمرے میں سے کام کی تمام اشیاء کو اٹھا کر ایک طرف اپنی جگہ پر رکھ دیتے ہیں اور کمرے کو نہایت صفائی اور سلیقے کے ساتھ آراستہ کر کے کھانے کے لئے جاتے ہیں۔ پھر وہ خود کھانے کی میزیں لگاتے ہیں اور ان پر کھانا چننے میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ قدرتی طور پر اپنے اندر ضبط و نظام، ذمہ داری اور غور و خوض کے مادے کو ترقی دیتے ہیں۔ اسی ماحول میں وہ پلتے ہیں۔ گویا وہ ابتدا ہی سے حقیقی زندگی میں قدم رکھ دیتے ہیں +

جب بچے مدرسے جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جا رہے ہیں۔ وہ مدرسے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں جاتے ہیں جہاں وہ اپنی انفرادیت کی تخلیق کرتے ہیں اور اپنے لئے ایک نیا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اس ماحول میں ان کی سرگرمیوں کو کامیاب بنانے کے تمام امکانات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً جب بچے مدرسے میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں کلوک روم میں سے گزر کر جماعتوں میں جانا ہوتا ہے جہاں انہیں اپنے کوٹ اتار کر ایک مخصوص

جگہ پر رکھنے کی گویا دعوت ملتی ہے۔ وہ جوتے بدلتے ہیں اور اگر وہ میلے ہوں تو اُن کو صاف کر لیتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھ دھوتے ہیں، میزوں، گلدانوں اور فرش کو صاف کرتے ہیں، گلدستے بناتے ہیں، چٹائیاں بچھاتے ہیں اور میزوں کرسیوں کو ترتیب کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک ایسے ماحول میں جو بڑی حد تک خود اُن کی تخلیق ہوتا ہے وہ ایک حقیقی زندگی کی ابتدا کر دیتے ہیں ◆

یہ بچے اپنی جماعتوں یا مدرسوں سے نہایت بے ترتیبی سے دھکم دھکا کرتے ہوئے نہیں بھاگتے جس طرح کہ اکثر ہمارے ہندوستانی مدرسوں میں نظر آتا ہے۔ یہ بھاگنا اس امر کا ثبوت ہے کہ جو کام وہ کر کے آ رہے ہیں اُس سے ان کو دلچسپی نہ تھی، جو کام ہونے کے باوجود اُن کے لیئے کھیل نہ تھا اور جس سے ان کو کوئی طبعی مناسبت نہ تھی ◆

ایک اور بات جو آپ کی توجہ کو منعطف کئے بغیر نہیں رہ سکتی وہ یورپ کے ترقی یافتہ مدارس کی جائے وقوع اور اُن کے آس پاس کھیل تفریح کے کھلے میدانوں کی موجودگی اور کمروں کی ساخت اور ساز و سامان ہے۔ ہمارے مدارس اُن کے مقابلے میں ننگے ڈھانچے ہیں جن کی دیواریں نہایت غلیظ ہوتی ہیں اور جن کے ساتھ کوئی صحن نہیں ہوتا۔ ان میں بچوں کے لئے حُسن کے نقطۂ نظر سے، یا علمی حیثیت سے کوئی تعلیمی ماحول تعمیر نہیں کیا جاتا، جو تعلیم کا ایک نہایت موثر جزو ہے۔ جب ہم مدرسے کے ساز و سامان اور تعلیمی اشیا کا خیال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ہمیشہ بنی بنائی چیزیں آتی ہیں اور اس لئے اُس وقت ہمارے مدِنظر صرف مصارف ہوتے ہیں۔ یورپ کے مدارس کے استاد ایسی اشیا کے بہت قائل ہیں، اور وہ انہیں اگر ممکن ہو تو بچوں ہی کی مدد سے حاصل کر لیتے ہیں۔ مدرسے کا آرٹسٹ آرٹ کے طلبہ کی مدد سے مدرسے کو آراستہ کرتا ہے، اور تصویریں ترتیب دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے اکثر تصویریں بچوں کی یا خود آرٹسٹ کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں، یا بچوں کے والدین اور پرانے طلبہ انہیں تحفے کے طور پر مدرسے میں بھیجتے ہیں ◆

انگلستان میں بیڈیل کی طرح کے مدرسے ایسے ہیں جہاں برتن بنتے ہیں، بڑھئی کا کام ہوتا ہے، چھپائی، بافت، مصوری اور سلائی کے شعبے قائم ہیں، اور مدرسہ اپنے بنے ہوئے ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا ہے ◆

والدین کو اپنے بچوں کی فلاح و بہبود سے حقیقی دلچسپی ہے اور وہ انہیں اچھے مدرسوں میں بھیجنے اور اُن کے لئے ضروری سامانِ تعلیم بہم پہنچانے پر جس قدر ممکن ہوتا ہے صرف کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے بچوں کو مدرسے میں بھیجتے ہیں تو وہ بہت سے مدرسوں میں سے ایک انتخاب کرتے ہیں اور اس لئے جانتے ہیں کہ وہ مدرسہ کس مقصد کے لئے جاری ہے اور اس مدرسے میں اپنے بچوں کو بھیج کر وہ مدرسے کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور اس مدرسے سے اپنے بچوں کے لئے انہیں کیا توقع رکھنی چاہئے۔ والدین اپنے بچوں کو اُسی طریقِ زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں جس سے اُن کو مدرسے میں سابقہ پڑنے کا امکان ہوتا ہے ◆

والدین کو تعلیم کی جدید ترین ترقیات کا علم ہوتا ہے اور اس لئے وہ اپنے بچوں کو انہیں مدارس میں بھیجتے ہیں جو تعلیم کے سلسلہ میں کچھ نئے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ وہ مدرسے والوں پر اور اُن کے کام پر اعتماد رکھتے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ وہ اُس میں مداخلت نہیں کرتے بلکہ وہ مدرسے کے کام کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاکہ اُس میں کچھ مدد دے سکیں۔

ہم والدین کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ اُن کا مقصد بچوں کو جہدِ حیات کے لئے تیار کرنا ہے، اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ صرف کتابی یا صنعتی تعلیم بچوں کو جہدِ حیات کے لئے تیار کرنے کو کافی نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ خواہ اُن کے ذہن کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں بچے بڑے ہو کر اُس وقت تک کامیاب زندگی نہیں گزار سکیں گے جب تک کہ اُن کو اِس زندگی کے لئے تیار نہ کیا جائے۔ گویا والدین یہ نہیں سمجھتے کہ اُن کے بچوں کی تعلیمی کامیابی سال بہ سال اُنہیں اونچی جماعتوں میں دیکھنے کے اندر ہے۔ وہ یہ سمجھنے کے لئے تیار ہوتے ہیں کہ ایک بچہ جو دستکاری میں اچھا ہے بہرحال اسی شعبے میں کامیاب ہو سکے گا، اور بچے کو اسی کام سے مناسبت ہے۔ اس لئے وہ بچے کو اُس کام میں لگاتے ہیں جس سے اُس کی طبیعت مناسبت رکھتی ہے۔

والدین اور اُستاد مل کر بچے کی طبیعت کو اپنی مشترکہ مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ والدین بچے کی ابتدائی زندگی، علالت، عادات اور خاندان کے متعلق مدرسے والوں کو ضروری معلومات بلا تامل مہیا کر دیتے ہیں۔

بعض اوقات ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح یورپ کے یہ مدارس ترقی کرتے اور کامیاب ہوتے ہیں؟ اس کا جواب نہ صرف اس میں ہے کہ بچوں کے والدین اُن سے تعاون کرتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ حکومت ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہاں ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ اُس صدیوں کی پرانی رٹ سے نکل کر نئے تجربات کرنے کے لئے حکومت کے افسرانِ تعلیم مدارس کی ہمت افزائی نہیں کرتے بلکہ جو مدد اُن کو ملتی ہے اُس سے بھی محروم کرنے کی صاف صاف دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔

یورپ میں حکومت ایسے تمام پرائیویٹ تعلیمی تجربات اور مقاصد کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، ان کو خاص طور پر مالی امداد دیتی ہے، اور بعض ایسے تجربات کی ترقی اور نتائج پر نگاہ رکھتی ہے جنہیں اُسے کسی وقت اپنے مدارس میں رائج کرنے کا خیال ہوتا ہے۔ محکمۂ تعلیم کے انسپکٹر ایسے مدارس کا بے سروپا اعتراض کرنے کے خیال سے نہیں بلکہ اُن کے مطالعے کے خیال سے اور اُن کو سمجھنے اور اپنی تجاویز سے مدد پہنچانے کی خاطر معائنہ کرتے ہیں۔

جب آپ ایسے مدارس میں جاتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں کوئی بچہ دستکاری کو اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتا۔ وہ کام کو اپنی روزانہ زندگی اور سرگرمی کا ایک جزو سمجھتا ہے۔ وہ صفائی وغیرہ کا سب کام اپنے آپ کرتا ہے۔

بچے اپنے لئے کھیلوں کے میدان تیار کرنے سے نہایت خوش ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی قسم کی محنت کو عار نہیں سمجھتے۔ مدرسے کا معمولی کام اور اس کے کرنے کا ڈھنگ اور استاد کی اصلی تعلیم بچوں کے دلوں میں محنت کی عزت کا احساس پیدا کر دیتے ہیں +

یہی آزادی جو وہاں بچوں کے رُجحان اور استعداد کو حاصل ہوتی ہے اور محنت کے حقیقی درجے کا احترام اُن کے حقیقی جوہر کا انکشاف کرتے ہیں اور اُن کی طبیعت کی مناسبت سے اُن کے لئے اُن کی آیندہ سرگرمیوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بہت تھوڑے بچے وہاں ایسے ہوتے ہیں جو محض یونیورسٹی کے امتحانات پاس کر لینا کافی سمجھتے ہوں +

ڈینزگ کے گیت

ڈینزگ کے آزاد شہر میں نازی اقتدار کا اظہار وہاں کے مدارس سے زیادہ اور کہیں نہیں ہوتا۔ یہاں نازی جرمنوں کے خیالات کی اشاعت کے لئے شعبۂ تعلیم کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ گیتوں کی ایک کتاب شائع کی گئی ہے جس کا نام ہے "آزادی کے گیت"۔ اسے محکمۂ تعلیم نے مدارس کے لئے منظور کیا ہے۔ اس کتاب میں ایسے گیت ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈینزگ کے بچے ہٹلر کے لئے لڑنے اور ڈینزگ کو پھر جرمن حکومت میں شامل کرنے کے لئے کتنے تیار ہیں۔ ایک گیت کا عنوان ہے "ہم ڈینزگ کو جائیں گے۔ ہم ہٹلر کے لئے لڑیں گے"۔ اس کے بعد ایک اَور گیت ہے جس میں لکھا ہے" اے جرمنی، اے ہمارے آبا و اجداد کے ملک ہم آ رہے ہیں۔ ہم تیرے لئے ڈینزگ واپس لا رہے ہیں۔ ڈینزگ میں جرمنی کی فوج ہم ہیں +

کتاب میں کُل چالیس گیت ہیں، جن میں سے زیادہ تر جنگ، سپاہیوں، بندوقوں، توپوں اور گولیوں کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ اٹھارھویں صفحے پر یہ تعلیمی گیت ہے :-

"ایک سو دس گولیاں میری جیب میں،
اور ایک ہتھیار میرے پہلو میں،
اور میرے ہاتھ میں بم ——
بالشویک ذرا میرے قریب تو آ!"

سب سے زیادہ بے باکانہ بلکہ لیگ کے لئے سب سے زیادہ توہین آمیز وہ گیت ہے جو صفحہ ۲۶ پر ہے۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"اے ڈینزگ! اے ڈینزگ!
اے بحیرۂ بالٹک کے موتی!
تجھے لُٹیروں کے ہاتھ لُوٹ لے گئے۔
اے ڈینزگ! اپنے دل کو پاکیزہ رکھ، جرمن بنا رہ۔
ہم تجھے دوبارہ حاصل کریں گے۔
ہمیشہ حالت یونہی نہیں رہے گی۔"

ڈینزگ کے بچوں کا ایک اور گیت یہ ہے:-

"انتقام کا دن قریب ہے۔
آزادی کا دن قریب ہے۔"

پھر ایک گیت یوں ہے:-

"جب شیر جنگل میں دھاڑتا ہے،
تو تمام جانور لرز جاتے ہیں۔
ہم، جرمن دُنیا کے مالک ہیں
اور سمندروں کے بادشاہ۔ ہوشیار ہو جاؤ!"

کتاب کا خاتمہ اِس گیت پر ہوتا ہے:-

"ڈینزگ، بڈھے جرمن ڈینزگ!
غم نہ کھا، بہار آرہی ہے۔"

انتقام اور جنگ کے متعلق اور بھی کئی گیت ہیں۔ بعض میں دشمن کے ملک پر حملے کی کیفیت بیان کی ہے۔ بعض میں لکھا ہے کہ "کُوچ کل ہوگا"۔

طشتر یاں صاف کرنے پر ایم۔اے کی سند

مسٹر ریمز بوتھم، ایم پی نے جو محکمۂ تعلیمات کے پارلیمانی معتمد ہیں امریکا کے بعض کالجوں کی نسبت تقریر کرتے

ہوئے کہا "جب میں دیکھتا ہوں کہ شکاگو کی یونیورسٹی میں ایم اے کی سند طشتریاں صاف کرنے کے چار طریقوں پر مضمون لکھنے سے مل جاتی ہے تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فہم و فراست کے ایک نہایت محدود پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ میں نے اگلے دن پڑھا کہ ایک امریکن کالج نے طلبہ کو ۵۴۷ مختلف مضامین پڑھانے کا انتظام کیا ہے۔ جب ریاستہائے متحدہ میں ایک تنہا ادارہ اتنے بوقلموں مضامین کے پڑھانے کا بار اُٹھا سکتا ہے کہ انجینیرنگ اور ریاضی سے لے کر میز پر کھانا چننے اور میدان میں گھاس کی نگہداشت تک اس کی ذیل میں آ جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی نقطۂ نظر سے بہرحال انسانی ذوق اور مصروفیات کی بوقلمونی کا اندازہ بڑی کاوش کے ساتھ لگایا گیا ہے"۔

کتابِ مقدس کا قدیم ترین نسخہ

کتابِ مقدس کا وہ بے بہا نسخہ جس کے متعلق ہم گزشتہ ماہ ایک شذرہ شائع کر چکے ہیں برطانیہ کو مل چکا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ایسی نایاب چیز جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی سوویٹ حکومت نے کسی تقریب کے بغیر ایک معمولی کاغذ میں لپیٹ کر برٹش میوزیم کے نمائندوں کے حوالے کر دی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے یہ دنیا میں کتابِ مقدس کا سب سے پرانا نسخہ ہے۔

لینن گراڈ کے شاہی کتب خانے سے جہاں یہ اب تک محفوظ تھا سوویٹ کا ایک خاص قاصد اسے لے کر آیا جب وہ ہارویچ پہنچا تو وہاں سے اسے پولس ملی جو اسے ایلڈوچ میں سوویٹ کے تجارتی سفارت خانے تک پہنچا گئی۔

یہاں برٹش میوزیم کے نمائندے نہایت بیتابی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ قاصد نے کمرے میں آ کر کتاب میز پر رکھ دی۔ اوپر سے کاغذ اتارا گیا تو اندر سے چرمی اوراق کی ایک بہت بڑی تعداد کپڑے میں لپٹی ہوئی برآمد ہوئی کتاب نہایت اچھی حالت میں تھی اور پرانے اور نئے عہدنامے کی تحریریں ویسی ہی نمایاں اور صاف نظر آتی تھیں جیسی کہ غالباً آج سے سولہ سو برس پہلے نظر آتی ہونگی جب کہ وہ لکھی گئی تھیں۔

ایک مختصر سے معائنہ کے بعد روسی قاصد کو کتاب کی رسید دے دی گئی اور مسودہ برٹش میوزیم میں بھیج دیا گیا۔ جہاں جہاں چند گھنٹے کے بعد اس کی عام نمائش کی گئی۔

سوویٹ حکومت نے پہلے اس کی قیمت پچپن لاکھ ڈالر طلب کی تھی، بعد میں بیس لاکھ ڈالر تک کمی کر دی لیکن آخر ایک لاکھ پونڈ قبول کر لئے۔

اسرارِ حیات

سطحِ دریا پر اُبھر آتے ہیں ہم
بُلبُلے ہیں تیرتے جاتے ہیں ہم
تیر کر لیکن ذرا کچھ دُور تک
اس نئی ہستی سے گھبراتے ہیں ہم
تنگ آ کر وحشتِ افکار سے
اپنا سر موجوں سے ٹکراتے ہیں ہم
ٹُوٹ کر دریا میں ہو جاتے ہیں غرق
پھر سکونِ بےخُودی پاتے ہیں ہم
خُوب ہے نیرنگیٔ موت و حیات
بس یونہی بن بن کے مٹ جاتے ہیں ہم
کیا وہیں ہیں ہم جہاں تھے اے اثرؔ
یا کہیں آتے ہیں یا جاتے ہیں ہم

اثرؔ صہبائی

احسن الکلام

نہ چھوٹا حشر تک پنہاں رہا دامانِ قاتل میں
عجب آمیزشِ رنگِ وفا تھی خونِ بسمل میں

نظر میں ایک تم ہو، اور لاکھوں حسرتیں دل میں
اُدھر محفل ہے خلوت میں اِدھر خلوت ہے محفل میں

کروں میں ایک نظارے پہ حصر آرزو کیوں کر
کہ ایسی آرزوئیں تو ہزاروں ہیں مرے دل میں

ادا سے مارتا ہے اور ٹھوکر سے جلاتا ہے
قیامت کا تماشا ہو رہا ہے کوئے قاتل میں

وہ عاشق کیا جو کر دے اپنا گھر بھی نذرِ بربادی
وہ عاشق ہے جو گھر کر لے کسی بیدرد کے دل میں

سرشکِ چشمِ تر ٹھہرے ہوئے ہیں نوکِ مژگاں پہ
بھنور سے چھوٹ کر اُلجھے ہیں خارستانِ ساحل میں

زکاتِ حسن لیتا ہے مگر دل دے کے لیتا ہے
کہ عادت مُفت خوری کی نہیں ہے تیرے سائل میں

تری تیغِ ستم کھا کر سُنے غیروں کے طعنے بھی
نہ اِتنا دل کا زہرا ہے نہ اتنی جان بسمل میں

کیا خونِ تمنا، آرزوؤں کا گلا گھونٹا
بڑی حسرت سے ہم نے جان دی آغوشِ قاتل میں

جو پابندِ علائق ہیں بڑی مشکل میں ہیں احسن
بہت اچھے ہیں وہ اُن سے، جو ہیں قیدِ سلاسل میں

احسن مارہروی

نظریۂ اضافیت

اُردو میں نظریۂ اضافیت کو واضح کرنے کی متعدد کوششیں ہو چکی ہیں۔ اِس لحاظ سے اِس شذرہ کی نوعیت مختلف نہیں لیکن یہ کوشش اس لحاظ سے ضرور مختلف ہے کہ نظریۂ اضافیت کو حتی الامکان واضح اور غیر اصطلاحی زبان میں سپرد قرطاس کیا گیا ہے۔ نظریۂ اضافیت کے اشکال کا یہ عالم ہے کہ ایک مشہور فرانسیسی ماہر طبیعیات ہنری پائنکرے نے نظریۂ اضافیت کو سمجھنے پر پورا ایک سال صرف کر دیا۔ اور ایک سال کے بعد اُس نے نہایت بے باکی سے یہ اقرار کر لیا، کہ نظریۂ اضافیت کو سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ اِس لئے میرا بیان بھی اگر کہیں "شرمندۂ معنی" نہ ہو تو اُسے میری بے بسی پر محمول کیجئے۔

مسئلۂ اضافیت کو سمجھنے کے لئے ہم چند ایک عام فہم مثالوں کا ذکر کریں گے۔ حرکت کے مسئلہ پر غور کیجئے آئین شٹائن کا یہ دعوےٰ ہے کہ کائنات میں حرکتِ مطلق کا وجود کہیں نہیں۔ یعنی ہر ایک چیز کی حرکت کسی دوسری چیز سے اضافی طور پر حرکت کہی جا سکتی ہے۔ اور یہ حرکت کبھی ایک خطِ مستقیم میں اور یکساں رفتار سے جاری نہیں رہتی۔ مثلاً جب ایک چیز زمین پر گرتی ہے تو اُسے زمین کی گردش ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خطِ استوا کی طرف لے جاتی ہے۔ اور زمین کی سورج کے گرد گردش اِس چیز کو فضا میں ۱۸½ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارا تمام نظامِ شمسی نسر واقع کی طرف ۱۲ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جا رہا ہے۔ ہمیں یہ چیز زمین پر خطِ مستقیم بناتی ہوئی گرتی نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت اِس کا راستہ ایک طویل، پیچیدہ اور منحنی راستہ ہے۔ مزید برآں اجسامِ فلکی کی حرکات بھی اضافی ہیں۔ اگر ہمارا کرۂ ارض کہر کے ایک گہرے پردہ میں ملفوف ہوتا اور ہم سورج، چاند اور ستاروں کو نہ دیکھ سکتے تو ہمیں حرکت کا علم ہی نہ ہوتا۔ اجسامِ فلکی ایک دوسرے کی نسبت سے اضافی طور پر ضرور متحرک ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کائنات فضا میں مطلق طور پر متحرک ہے یا نہیں۔ اگر بہت سی مکھیاں ایک بڑے کرہ میں اُڑ رہی ہوں تو ہر ایک مکھی دوسری مکھیوں سے اضافی طور پر ضرور متحرک ہوگی لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اُن کے کرہ کو فضا میں حرکت دی جا رہی ہے یا نہیں۔ اِس لئے حرکت اضافی ہے، مطلق نہیں۔ اگر ہمارے کان ہی نہ ہوتے تو کیا آواز کا وجود ہوتا؟ اِس استفسار کا جواب نفی اور اثبات دونوں طرح پر دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جواب کا انحصار آپ کے نقطۂ نگاہ پر ہوگا۔ ایک ماہر طبیعیات یہ کہے گا کہ ہوا میں آواز کی امواج ضرور پیدا ہوں گی خواہ انہیں کوئی

کان سُنے یا نہ سُنے۔ لیکن علم تشریح الابدان کے ماہر آواز کا وجود تسلیم نہیں کریں گے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک کمرہ اتنا لمبا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ہماری مُراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کو گز سے ناپا جائے تو یہ اتنے گز ہوگا۔ اور یہ گز نام ہے اُس فاصلے کا جو لندن میں پانی کے نقطۂ انجماد پر رکھی ہوئی چھڑی کے دو نقاط میں واقع ہے۔ ہر ایک طرح کے پیمانے اضافی ہیں۔ کائنات میں کوئی چیز مطلق طور پر مقرر نہیں۔ اور یہی آئین سٹائن کا نظریہ ہے ♦

آئین سٹائن یہ حیرت انگیز دعوے بھی کرتا ہے کہ وقت اور فضا بھی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے فضا کہا جاسکے۔ اگر فضا میں کوئی چیز رکھنے کے لئے نہ ہوتی تو فضا کا تصور ہی قائم نہ ہوسکتا! وہی حال وقت کا ہے۔ اگر کوئی واقعہ ہی رُونما نہ ہوتا تو وقت کا ادراک ہی نہ ہوسکتا۔ علاوہ ازیں آئین سٹائن وقت اور فضا کو ناقابلِ تحلیل اکائی سمجھتا ہے۔ اُس کے خیال کے مطابق اگر وقت کا وجود نہ ہوتا تو فضا میں کسی چیز کا وجود ہی نہ رہتا۔ اس پر ذرا غور کرو کہ اگر وقت کا عرصہ معین نہ ہوتا تو فضا میں کوئی مکان قائم رہ سکتا تھا؟ نیوٹن اور اس کے تمام پیرو آج تک وقت اور فضا کو کائنات کے دو واضح اور غیر متعلق عناصر گردانتے رہے ہیں۔ لیکن ایک کا وجود دوسرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ♦

تم کسی واقعے کو بیان نہیں کرسکتے جب تک کہ تم فضا کے ساتھ وقت کا حوالہ نہ دو۔ فضا اور وقت کی قدر بھی اضافی ہے۔ اگر کسی رات کو کائنات کی تمام چیزیں ہمارے پردۂ شبکی کے ساتھ حجم میں دس گُنا بڑھ جائیں تو ہمیں اس انقلاب کا احساس ہی نہ ہوگا۔ ہمارے گز اور ہمارے احساسات نئے نظام کے عین مطابق ہونگے۔ ہم وقت کا اندازہ کس طرح لگاتے ہیں؟ گھڑی کی سوئی اور اجسامِ فلکی کی گردش سے۔ یعنی یہ اندازہ کسی اور چیز سے متعلق ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ایک منٹ ابدی طوالت حاصل کرلے اور گھنٹے سیکنڈوں کی طرح گزرتے نظر آئیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے والے پر اضافی طور پر منحصر ہے ♦

آئین سٹائن نے مچلسن اور مارلے کے اُس تجربے پر غور کرکے نظریۂ اضافیت قائم کیا تھا جو انہوں نے ۱۸۸۶ء میں زمین کی گردشِ مطلق کا اندازہ لگانے کے متعلق کیا تھا۔ چونکہ یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ روشنی اور گرمی کی امواج سورج سے ہزاروں میل کے فاصلہ سے بغیر کسی واسطے کے زمین تک پہنچ سکتی ہیں اس لئے ماہرینِ سائنس نے فضا اور مادے کے تمام مسامات میں ایتھر کا وجود تسلیم کرلیا ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس ایتھر کا کوئی وزن نہیں، اور یہ اجسامِ فلکی کی گردش میں کوئی مزاحمت پیدا نہیں کرتا۔ اس صورت میں اگر زمین کی کوئی گردشِ مطلق ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی رفتار کو ناپنا ممکن ہے یا نہیں۔ زمین سورج کے گرد ½۱۸ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کررہی ہے۔ لیکن کیا فضا میں اس کی کوئی گردشِ مطلق بھی ہے؟ اس استفسار کا جواب حاصل کرنے کے لئے مچلسن اور مارلے نے اُس آدمی کی طرح ایک

تجربہ کیا جو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ندی میں ایک میل بہاؤ کے خلاف تیرنے اور واپس آنے پر زیادہ وقت صرف ہوتا ہے یا ندی کے آر پار جانے پر زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے تجربہ میں تیرنے والے کی جگہ روشنی کی شعاع استعمال کی تھی۔ جیسے زمین کی گردش کے رُخ پر ایک خاص فاصلہ تک پہنچایا گیا تھا اور واپس لایا گیا تھا۔ اور پھر اس رُخ سے زاویۂ قائمہ پر اُسی شعاع کو اُسی فاصلے تک پہنچا کر واپس لایا گیا تھا۔ اُنھوں نے ایک نہایت حسّاس آلہ سے اُس وقت کا اندازہ لگایا جس میں دونوں شعاعیں واپس اپنی جگہ پر پہنچ جاتی تھیں ۔

حساب لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ تیرنے والے کو ندی کے بہاؤ کے خلاف جانے اور واپس آنے پر ندی کے آر پار جانے کی بہ نسبت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ لیکن مارلے اور مچلسن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دونوں شعاعیں ایک ہی وقت پر واپس پہنچ گئی تھیں۔ اِس تجربہ کا سال کے مختلف موسموں میں اعادہ کیا گیا۔ لیکن ہمیشہ وُہی نتیجہ نکلا۔ زمین کی گردش کا روشنی کی رفتار پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایتھر زمین کی گردش کے ساتھ منتقل نہیں ہو رہا تھا۔ اور اسی وجہ سے روشنی کی شعاع پر کوئی اثر نہ ہوا۔ قدیم عقیدہ کی یہ ایک ایسی مخالفت تھی جس کا کوئی جواب نہ تھا ۔

اِس وقت آئین سٹائن نے دُنیا کے سامنے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اُس کے دو اساسی دعاوی یہ تھے کہ "ہر ایک حرکت اضافی ہے"۔ اور "روشنی کی رفتار اپنے منبع کی گردش سے بے نیاز ہے"۔ اور اِن نظریوں کی تائید مچلسن اور مارلے کے تجربہ سے بھی ہوتی ہے ۔

اِن نظریوں کی بنا پر آئین سٹائن نے محیر العقول نتائج مرتب کئے۔ اُن میں سے ہم چند ایک کا بیان کرینگے۔ روشنی کی رفتار ممکن الحصول تیز ترین رفتار ہے۔ اگر ایک آدمی روشنی کی رفتار سے پرواز کرے تو وہ بوڑھا نہیں ہوگا۔ اور اگر یہ ممکن ہو کہ وہ روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار سے اُڑ سکے تو وہ نسبتاً زیادہ جوان ہو جائے گا۔ ایک گز اگر اسی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ہم سے خطِ مستقیم میں حرکت کرے۔ تو ہمیں اُسکی لمبائی دکھائی نہیں دیگی حالانکہ جو آدمی اُسکے ساتھ ساتھ حرکت کرے اُسے اُس کی لمبائی ویسی ہی دکھائی دیگی۔ اور اگر یہ گز ۱۶۱۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرے تو اُسکی لمبائی بظاہر نصف رہ جائیگی۔ اگر تم زمین سے روشنی کی رفتار سے حرکت کر کے زمین سے دُور جا سکو تو زمین تمہیں ساکن نظر آئیگی۔ اور تمہارے لئے کوئی واقعہ رُونما نہ ہوگا۔ وقت کا وجود ہی معدوم ہو جائیگا۔ گھڑی کی سوئیاں ساکن ہو جائیں گی۔ اگر تم روشنی کی رفتار سے زیادہ سریع رفتار سے حرکت کر سکو تو تم گذشتہ نسلوں کی روشنی کی امواج تک پہنچ سکو گے اور ازمنۂ گذشتہ کی تاریخ تمہارے سامنے آجائے گی۔ ہم کسی چیز کے مادہ کو نہ بدلنے والی چیز سمجھتے تھے۔ لیکن یہی مادہ رفتار کی سُرعت کے ساتھ بڑھ جائے گا، اور روشنی کی رفتار پر ناقابلِ بیان حد تک زیادہ ہو جائے گا۔ اِنہی واقعات کی بنا پر وقت، رفتار اور فاصلے کے متعلق ہمارے اندازے ناظر کے لئے اضافی

حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی ہوائی جہاز میں روشنی کی رفتار سے نصف رفتار کے ساتھ پرواز کرے تو اُس پر زمین کے واقعات کا اثر اُس اثر سے بالکل مختلف ہوگا جو ہم پر ہوتا ہے۔

لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کرۂ ارض میں جو ممکن رفتارِ حرکت انسان حاصل کر سکتا ہے اُس کے مطابق وقت، جگہ اور مادہ کے پیمانوں کے اُس تصور میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں پڑتا جو نیوٹن اور اُس کے پیروؤں نے قائم کیا تھا۔ فرق ضرور موجود ہے لیکن اُس فرق کو معلوم کرنے کے لئے ایسے آلات کی ضرورت ہے جو موجودہ وقت کے آلات سے ایک ہزار گنا زیادہ صحت سے نتائج مرتب کر سکیں۔

آئیے اب آئین سٹائن کے قوتِ جاذبہ کے متعلق نئے نظریہ پر غور کریں۔ اِس لحاظ سے آئین سٹائن کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے چیزوں کے زمین کی طرف گرنے کی وجہ نیوٹن کے نظریہ کے خلاف قوتِ جاذبہ کے علاوہ اور قوت تجویز کی۔ وہ کہتا ہے کہ قوتِ جاذبہ جیسی پنہاں قوت کو فرض کیوں کیا جائے۔ کیا قوتِ جاذبہ کے علاوہ سیب اَور کسی وجہ سے زمین پر نہیں گر سکتا؟ اِس استفسار کا جواب وہ اثبات میں دیتا ہے۔ اُس کا ثبوت ملاحظہ ہو۔

وہ کہتا ہے۔ فرض کرو کہ تم ایک ایسے ساکن کمرے میں بیٹھے ہوئے ہو جو کشش رکھنے والے اجسام سے کروڑوں میل دُور ہے۔ اِس صورت میں تمہارا کوئی وزن نہ ہوگا۔ تمہاری ٹوپی تمہارے سر کو بالکل نہیں دبائے گی۔ تمہارا جسم کُرسی پر کوئی اثر نہ ڈالیگا۔ تمہارے ہاتھ سے اگر کوئی گیند چھُوٹ جائے تو وہ نیچے نہیں گرے گی۔ کانٹا کسی طرح کا وزن نہیں ماپے گا۔ اب فرض کرو کہ یہ کمرہ اُس اسراعی رفتار سے صعود کرنا شروع کرتا ہے جس رفتار سے چیزیں سطحِ زمین پر آکر گرتی ہیں۔ اب فوراً تمہارا وزن وجود میں آجائے گا اور تمہارا دباؤ فرش پر پڑنے لگے گا۔ گیند فرش پر گر پڑے گی، کانٹے پر ہر ایک چیز کا وزن ظاہر ہونے لگے گا۔ یہ تمام اثرات بالکل وہی ہونگے جو قوتِ جاذبہ سے مرتب کئے جاتے ہیں لیکن تم کسی ممکن ذریعے سے یہ معلوم نہیں کر سکو گے کہ یہ اثرات کسی پوشیدہ قوتِ جاذبہ سے پیدا ہو رہے ہیں یا اِن اثرات کی ذمہ دار اُس کمرہ کی اسراعی رفتار ہے جس میں تم بیٹھے ہوئے ہو، یہی حال ہماری زمین اور نظامِ شمسی کا ہے۔

قوتِ جاذبہ کے متعلق انقلابی نظریہ پیش کرتے ہوئے آئین سٹائن اِس قضیہ سے آغاز کرتا ہے کہ جہاں مادہ موجود ہے وہاں فضا منحنی ہے۔ بظاہر یہ ادعا بیہودہ نظر آتا ہے۔ فضا منحنی کیسے ہو سکتی ہے؟ کیا فضا میں خطوطِ مستقیم کھینچنا ممکن نہیں؟ کیا اقلیدس کے تمام قضیے غلط ہیں؟ لیکن کیا تم نے کبھی کسی مقعر آئینہ میں کمرے کی اشیاء کا عکس دیکھا ہے؟ اُس میں ہماری مستقیم فضا منحنی نظر آتی ہے۔ آئین سٹائن کا خیال ہے کہ درحقیقت ہماری کائنات کی فضا کسی عظیم کُرہ یا سورج کے

قریب اسی طرح مُنحنی ہے۔ یہ تصور کرنا دشوار ہے۔ کہ درحقیقت اِس طرح کُرۂ ارض کی حیثیت کیا ہو جاتی ہے لیکن آئین سٹائن نے اِس نظریہ سے کششِ ثقل کے متعلق نیا نظریہ ضرور قائم کر لیا ہے۔

وہ یہ ہے کہ اگر ایک کُرہ شکلِ ناقص کے راستے پر سورج کے گرد چکر لگائے تو سیب فرش پر اِس لئے نہیں گرتا کہ اُس پر کوئی پوشیدہ قوتِ جاذبہ اثر ڈال رہی ہوتی ہے، بلکہ اِس لئے کہ اُس کے راستے کے لئے فضا میں ایسے خطوط ہوتے ہیں، جن کی پیروی کرتے ہوئے سیب کو سب سے تھوڑی رکاوٹ پیش آتی ہے۔ اور یہ تمام فضا مُنحنی ہے۔ اگر ہم کسی پتھر کے گولے کو ایک ایسے کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیں جس کا فرش بظاہر ہموار نظر آتا ہو اور وہ گولا پھسلتا ہوا کمرے کے مرکز پر آجائے تو اس کے دو وجوہ ہو سکتے ہیں۔ یعنی یا تو کوئی چیز گولے کو کھینچ رہی ہے اور یا کمرے کا فرش مُنحنی ہے۔ یہی حال قوتِ جاذبہ کا ہے۔ یعنی یا تو ہر ایک طرح کے مادہ میں قوتِ جاذبہ موجود ہے اور یا فضا مُنحنی ہے۔ نیوٹن مقدم الذکر نظریہ کا قائل تھا، اور آئین سٹائن کا ایمان موخر الذکر نظریہ پر ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِس نظریے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا؟ آئین سٹائن کہتا ہے کہ اِس کا ثبوت موجود ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ اگر اُس کا نظریہ صحیح ہو، یعنی اگر فضا مُنحنی ہو تو کسی بعید ستارے کی شعاعِ نور سورج سے گذرتے ہوئے اپنے خطِ مستقیم سے منحرف ہو جانی چاہیئے۔ چنانچہ اِس نظریہ کی صداقت کا امتحان کرنے کے لئے ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کو دو برطانوی مہمات برازیل اور افریقہ کے ساحل پر بھیجی گئیں۔ جنہوں نے مکمل سورج گرہن کے وقت سورج اور ستاروں کی عکسی تصاویر حاصل کیں۔ اِن تصاویر کا مقابلہ اُن تصاویر سے کیا گیا جو چند ماہ بعد اُس وقت حاصل کی گئیں جبکہ سورج افلاک کے اُس حصے میں نہیں تھا۔ اِس مقابلہ سے واضح طور پر پتہ چل گیا کہ ستاروں کی شعاع خطِ مستقیم سے منحرف ہو گئی تھی اور اُسی اندازہ کے مطابق ہوئی تھی جو کہ آئین سٹائن نے لگایا تھا۔ اِس تجربہ سے آئین سٹائن کے نظریہ کا عملی ثبوت بہم پہنچ گیا۔ اور بہت سے پہلے تجربات نے بھی اُس کے نظریہ کی تائید کی۔

ممکن ہے کہ آئین سٹائن کے نظریہ کو توہمات کا ایک سلسلہ کہا جاتا، لیکن عملی تجربات نے اُس کے نظریہ کی تائید کی، اور دُنیا کو اُس کے محیر العقول نظریہ کا قائل ہونا پڑا ہے۔

نسیم رضوانی

اصطلاحاتِ علمیہ متعلقہ نظریۂ اضافیت

نمبر	اصطلاح	English
۱	نظریۂ اضافیت	Theory of Relativity
۲	حرکتِ مطلق	Absolute motion
۳	اضافی	Relative
۴	یکساں رفتار	Uniform velocity
۵	گردش	Rotation
۶	خطِ استواء	Equator
۷	نظامِ شمسی	Solar System
۸	نسرِ واقع[۱]	Vega
۹	مُنحنی	Curved
۱۰	نقطۂ انجماد	Freezing Point
۱۱	فضا۔ حیز	Space
۱۲	اکائی	Unit
۱۳	عناصر	Elements
۱۴	قدر	Value
۱۵	پردۂ شبکی[۲]	Retina
۱۶	ایتھر	Ether
۱۷	مزاحمت	Resistence
۱۸	قوتِ جاذبہ	Gravitation
۱۹	اسراع	Acceleration
۲۰	قضیہ	Proposition
۲۱	مقعر	Concave
۲۲	شکلِ ناقص	Ellipse

---

[۱] اِس ستارہ کو نسرِ واقع اِس لئے کہتے ہیں کہ اِس کی صورت دو اَور ستاروں کے مل جانے سے جو اِس کے دونوں جانب ہیں ایسی معلوم ہوتی ہے گویا گدھ کندھے جوڑے ہوئے اُوپر سے نیچے آرہا ہے ٭

[۲] آنکھ کا وہ گول پردہ جس سے روشنی آنکھ میں داخل ہوتی ہے ٭

خدایا کیسی مصیبت ہی ہجرِ جاناں میں — کہ ہر خوشی مجھے وجہِ ملال ہو جائے
کسی طرح تو دلِ مضطرب کو چین آئے — نہیں ہے وصل جو ممکن وصال ہو جائے

اکبر

عناصرِ داستاں

مرے فسانۂ وارستگی کی جاں ہو تم
میں داستان ہوں خلّاقِ داستاں ہو تم

یہ داستانِ محبت جو چھیڑ بیٹھے ہو!
خبر بھی ہے کہ خود اِس داستاں کی جاں ہو تم

مجھے مٹانے سے گو کام ہے تمہیں شب و روز
مری تباہی سے ہر چند شادماں ہو تم

معاملاتِ محبت کو کھیل مت سمجھو
کہ کچھ بھی ہو مگر اب میرے ہم عناں ہو تم

تمہارے حسن کی فطرت کا آئینہ ہوں میں
مرے جنوں کی حقیقت کے ترجماں ہو تم

حریمِ رُوح میں ہے چاندنی سی پھیلی ہوئی
مرے حواس میں مانندِ بُو نہاں ہو تم

مرے خیال کی رعنائیوں کا مرکز ہو
مری نگاہ کا اِک خوابِ نوجواں ہو تم

جدھر نگاہ اُٹھاتا ہوں دیکھتا ہوں تمہیں
مری نگاہ کے پردوں میں ضوفشاں ہو تم

مری بہار و خزاں ہے تمہارے ہاتھوں میں
کہ قدرتاً مری قسمت پہ حکمراں ہو تم

یمِ حیات کے کِس گھاٹ اُتارنا ہے مجھے؟
مرے سفینۂ دل کے سفینہ راں ہو تم

عدم

حضرتِ اثر صہبائی کا رنگِ تغزّل

اگرچہ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہیں لیکن اردو شاعری کی صنفِ غزل گوئی میں اساتذہ نے ایرانی اندازِ تغزل میں مذکر ہی کو مخاطب ٹھیرایا۔ تغزل دراصل اُن وارداتِ قلبی کی ترجمانی کا نام ہے جو خوشی یا رنج یا دیگر اثرات کے ماتحت شاعر کو بیقرار کر دیتے ہیں اور وہ اُن کیفیات کو دلکش پیرایہ میں ادا کر دیتا ہے +

غزل کے لئے سوز و گداز اور موسیقیت ضروری ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کے محاسن میں سے سب سے پہلا یہ ہے کہ اُس کے سنتے ہی دل پر چوٹ سی لگے یا کیفِ انبساط میں سامعین رقص کرنے لگیں اور ایسی کیفیت پیدا کرنے کے لئے سوز و گداز اور موسیقیت سے زیادہ کوئی اور چیز موثر نہیں ہو سکتی۔ غزل ایک لطیف چیز ہے اور سوز و گداز اور موسیقی بھی علی ہذا القیاس لطیف ہیں +

ہندی اور عربی شعرا کے لئے چونکہ غزل کوئی جداگانہ صنفِ شاعری نہیں تھی ہندی کے شعراؔ نے اپنی تمام شاعری میں غزل کے لغوی معنوں کو ملحوظ رکھا اور معشوق کو مؤنث ہی مخاطب کیا۔ عربی کے شعرا نے قصائد کے شروع میں تشبیب قائم کر کے محبت کے گلو سوز نغمے گائے اور معشوق کو بصیغۂ مؤنث ہی مخاطب کیا اور بسا اوقات نام بھی لے دیا۔ بلاشُبہ محبت کے سچے جذبات کو تحریک میں لانے کے لئے اِن دونوں زمانوں کے شعراؔ کا کلام بیحد اثر انگیز اور لطیف ہے +

ہندوستان پر چونکہ زیادہ تر اثر ایرانی شعرا کا ہوا ہے اس لئے یہاں کے شعرا اُن کا تتبع کرنے پر مجبور تھے۔ سب سے پہلے میر تقی میرؔ نے اُردو غزل کے انداز کو واقعیت، سادگی، سوز و گداز اور اثر سے لبریز کیا۔ حسن و عشق کی کیفیتوں کو ایسے دلکش پیرایہ میں پیش کیا کہ سننے والے کے دل پر سنتے ہی تصویر سی کھنچ جاتی۔ تصنع اور بناوٹ اُن کے اشعار میں نام کو بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اُن کی غزلیات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ میرؔ کے بعد خواجہ میر دردؔ نے غزل میں سوز و گداز اور حقیقت و معرفت کے رنگ کا اضافہ کیا لیکن اُن کی نگاہ "ہمہ اوست" کے مسئلہ اور "دنیا کی بے ثباتی" تک ہی محدود رہی۔ سوداؔ کی غزلیات پُرشکوہ الفاظ اور دلآویز ترکیبوں پر مشتمل ہیں۔ مضامین بھی بلند ہیں لیکن نہ تو خواجہ میر درد کا سا سوز و گداز ہے اور نہ میر تقی میرؔ جیسا اثر اور سادگی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام میں مقبول نہیں ہو سکیں۔ مصحفیؔ، انشاء اللہ خان وغیرہ کو چھوڑ کر حکیم مومن خان مومنؔ کا اندازِ تغزل ضرور قابلِ اعتنا ہے۔ مومن نے کسی حد تک سینہ کادی سے کام لیا۔ اِس کے بعد غالبؔ

اور ذوق نے اپنے زمانہ میں اُردو غزل گوئی کے میدان کو زیادہ وسیع، بلند اور پیچیدہ خیالات کی جولانگاہ بنایا۔ ذوق کی غزلیات مقابلتہً غالب سے زیادہ عالمانہ تھیں باعتبار خیالات اور موضوعات کے بھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذوق کی غزلیات اُس کی زندگی میں تو مقبول ضرور ہوئیں لیکن بعد میں غالب کے مقابلہ میں ماند پڑ گئیں +

غالب کو خدا نے ایسا دل ودیعت کیا تھا کہ مضامین اور خیالات کی آمد وشد کا سلسلہ اُسے ہمیشہ بیتاب اور بیقرار رکھتا۔ اس دنیا کی چار دیواری سے بالاتر اُس کا شہپر پرواز اُسے ہر وقت اُڑائے لئے پھرتا۔ حقائق و معارف، جذبات نگاری، مناظرِ فطرت میں سے پہلی دونوں صورتوں کا بار غالب کے فکر رسا نے اُردو غزل کے نحیف و کمزور کندھوں پر رکھنا چاہا۔ اُس کی ہمہ گیر طبیعت نے فارسی تغزل میں جس قدر نادر خیال آرائیاں کی ہیں اُن کا ذکر یہاں خارج از مبحث ہے۔ اُردو غزل کی زمین کو بھی اُس کے دریائے سرشک کی طوفاں خیزیوں نے ایک بڑی حد تک سیراب کیا ہے۔ بڑے بڑے اہم مسائل کے حل کا ذریعہ اُردو غزل کو ٹھیرایا ہے۔ غالب نے بحیثیت مجموعی اُردو غزل کو زمین پر سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ اگرچہ وہ اُردو کی تنگ دامانی کی وجہ سے اکثر اپنے خیالات سلیس اُردو غزل میں ادا کرنے سے قاصر رہے لیکن جو کچھ سلیس زبان میں ادا کر گئے ہیں اُس کا جواب نہیں +

امیر و داغ نے غزل گوئی کو بہت عام کیا اور آج یو۔پی کے اساتذہ کی غزلوں میں رنگِ غالب انہیں دونوں کا ہے۔ امیر و داغ کے متعدد دواوین ہیں اور موازنہ کرنے والوں نے اِن دونوں کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔ میرے خیال میں دونوں نے غزل کو ٹھیٹھ عاشقانہ رنگ میں پیش کیا اور اُس کے جملہ پہلوؤں میں سے باریک سے باریک پہلو پر بھی روشنی ڈالنے میں بڑی سادگی اور بیباکی سے کام لیا ہے۔ ہر دو نے اُردو زبان کے روزمرہ اور محاورات کو قلمبند کر کے اُردو زبان پر بڑا احسان کیا +

ڈاکٹر اقبال اُردو کے نئے دَور کے بانی ہیں۔ آپ نے بھی ابتدا میں داغ سے اصلاحِ سخن لی۔ لیکن اُردو غزل گوئی کی طرف اُن کی توجہ بہت کم رہی۔ فارسی غزل میں البتہ آپ نے ضرور ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ حضرتِ اثر ڈاکٹر اقبال کی فارسی غزل گوئی سے بیحد متاثر ہوئے اِس کے علاوہ خواجہ حافظ شیرازی اور حسرت موہانی سے بھی آپ نے استفادہ کیا ہے +

حضرتِ اثر صہبائی کی غزلیات پر زیادہ تر جمالیاتی رنگ غالب ہے۔ اُردو غزل کی خوش قسمتی ہے کہ حُسن کا ادراک حسّی کرنے والے شعرا بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ حضرتِ اثر نے اُن عامیانہ خیالات اور موضوعات کو چھوڑ کر غزل کے لئے ایک ابدی، بیکراں روحِ حسن کو لے لیا جو فلاطوں سے لیکر ہیگل، کانٹ اور شوپنہاور تک مسلّم سمجھی گئی ہے جو موسمِ بہار کی محتاج نہیں ہے۔ جو آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے ہر چیز میں سائر و دائر ہے۔ حُسن مذاق رکھنے والے کی نظر جہاں کہیں بھی پڑ جاتی ہے۔ حُسن ہی حُسن نظر آتا ہے۔ حضرتِ اثر نے بھی بالفاظِ ہیگل حُسن اور صداقت کو ایک ہی چیز سمجھا ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت اثر اپنے لئے ہر جگہ ایسا ماحول پیدا کر لیتے ہیں +

آنکھ، کان مظاہرِ حُسن جمالی ہیں۔ انسان کے جسم میں یہ دو آرگن ہیں جنکے ذریعہ سے انسانی جذبات میں اہتزازی کیفیت پیدا ہوتی ہے، ایک ہیجانِ عظیم برپا ہوتا ہے، اور کبھی کبھی وہ خود اپنے کو کھو دیتا ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے اُن مناظرِ قدرت کو جو حسن اور صداقت کا مجسمہ ہوتے ہیں، گلکدۂ بہار کی رنگینیوں سے مستی اور نور حاصل کرتی ہے۔ کان سنتے ہیں اُن سُریلی آوازوں کو جن کے کیفِ نغمہ سے دل رقص کرنے لگتا ہے۔

اثرؔ صاحب آنکھ کے جمالی پہلو کو ذیل کے اشعار میں ظاہر فرماتے ہیں۔

رہروِ محبت کی ہر قدم پہ منزل تھی حُسن کا تھا آئینہ ذرّہ ذرّہ صحرا کا

کس قدر نظر پرور ہے ریاضِ ہستی بھی اِک نگار خانہ ہے نقشہائے زیبا کا

خوب ہے اُس گلِ خوبی کے تصور کی بہار آنکھ جس چیز پہ پڑ جائے حسیں ہو جائے

کانوں کے جمالی پہلو کی بابت تحریر فرماتے ہیں۔

چھیڑا ہے کس کے حُسن نے تارِ ربابِ عشق رقصاں ہے ایک نغمۂ بیہم مرے لئے

پردۂ کائنات میں کون ہوا ہے نغمہ زن میرے نفس کا تار تار مثلِ رباب ہو گیا

یہ کس حسنِ ترنم آفریں کو اِک نظر دیکھا کہ میرے بربطِ دل کا ابھی تک تار لرزاں ہے

فی زمانا میرے نزدیک بہترین غزل کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:-

حقائق و معارف، سوز و گداز، کیف و مستی، جذبات آفرینی، مناظرِ فطرت۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اثرؔ صاحب میں کہاں تک یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

حقائق و معارف

حضرتِ اثرؔ کی طبیعت ابتدا ہی سے حکیمانہ مضامین کی طرف مائل تھی اور قدرت کے اسرار و غوامض معلوم کرنے میں آپ کو گہری دلچسپی تھی۔ مرزا غالب اور اقبال کا کلام شروع ہی سے زیرِ مطالعہ رہا اور پھر فلسفہ کے ساتھ ایسا شغف رہا کہ ایم اے کا امتحان بھی اسی مضمون میں پاس کیا۔ فارسی اور انگریزی شاعری کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِس نوجوان شاعر کا کلام

حقائق و معارف کے انمول جواہرات سے مالا مال ہوگیا اور لطف یہ ہے کہ فلسفیانہ اور حکیمانہ مضامین کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ غزل گوئی کی مخصوص لطافت، شگفتگی اور شوخی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اندازِ بیان بیحد دلپسند اور سامعہ نواز ہے۔ موسیقی اور وجدان سے شعر بذاتِ خود رقص کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں دقیق اسرار کو بے نقاب کر جاتے ہیں۔ انسانی عظمت کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

جھک جھک کے دیکھتا ہوں مَیں طوبیٰ کو عرش کو　　کچھ اِس قدر بلند ملی ہے نظر مجھے

ٹھکرا رہے ہیں انجم و خورشید و ماہ کو　　تیرے نیاز مند ہوئے بے نیاز کیا

منزل مری بلند ہے خورشید و ماہ سے　　خورشید و ماہ پر ہی ٹھہرنا نہیں مجھے

مسجودِ مہر و ماہ ہوں معبودِ کائنات　　سجدہ کسی کے در پہ بھی کرنا نہیں مجھے

مندرجۂ بالا اشعار میں انسانی عظمت کے مسئلہ کو کس قدر دلچسپ اندازِ بیان میں ادا کر دیا ہے۔ کبھی تو آپ کی بلند نظری طوبیٰ اور عرش کو جھک جھک کے دیکھتی ہے اور کبھی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ انجم و خورشید و ماہ کو ٹھکراتے ہیں۔

اِس مسئلہ کو کہ انسان اشرف المخلوقات ہے تمام کائنات اِسی کی وجہ سے تخلیق کی گئی ہے کتنے آسان الفاظ میں بیان کیا ہے اور خودی کے احساس نے بالآخر یہانتک صورت اختیار کی ہے کہ آپ کسی کے در پر سر جھکانا پسند نہیں کرتے۔

پست ہمت نوجوانوں کے لئے اِس سے زیادہ محرک اور کیا چیز ہوسکتی ہے کہ اثرؔ صاحب انہیں مہر و ماہ ایسی بلند اور عالی منزل پر ٹھہرنے کی بھی ممانعت فرمارہے ہیں۔ وہ اپنی منزل اِس سے بھی وراءُ الوراء سمجھتے ہیں۔

حیات بعد الممات کے اہم مسئلہ کو بھی اثر صاحب نے چند الفاظ میں حل کر دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسان کی شانِ ازلی کو بھی ثابت کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک انسان کی ہستی غیر فانی ہے وہ صرف ہماری آنکھوں سے چھپ جاتی ہے یا ہماری ہی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں کہ ہم اُس کی اِس غیر مرئی حالت کو دیکھ نہیں سکتے۔ جو بسا اوقات پنہاں ہونے کے بعد بھی عیاں رہتی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر سے معلوم ہو جائے گا کہ حضرتِ اثر کو نہ مرنے کا کس قدر یقین ہے، اور پرکاہ کے برابر بھی خوفِ فنا نہیں ؎

موجود بھی ازل سے ہوں دربارِ دواں بھی ہوں　　خوفِ فنا نہیں ہے کہ مرنا نہیں مجھے

ہم آجکل دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کا وہ گروہ جو یہ تلقین کرتا رہتا ہے کہ دُنیا ہیچ ہے ہر چیز فنا ہونے والی ہے انسان بھی فانی ہے۔ لذاتِ دنیا سے اِس لئے پرہیز لازمی ہے انسانی فطرت کو کس قدر پست کرتا ہے اور یاس انگیز خیالات سے انسانی زندگی کو بالکل بیکار کر دیتا ہے اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ زمانۂ قدیم ہی سے قنوطیوں کا ایک گروہ چلا آتا ہے جو انسان کو جامد اور دنیا سے بیزار رہنے کی ترغیب دیتا رہا ہے۔ حضرتِ اثر نے موت کے اُس عالم تصور کو مٹا کر جو بسا اوقات انقطاعِ حیات کا باعث ہوتا ہے خوفِ فنا کو بھی دل سے نکال دیا ہے اور زندگی کو ازلی اور جاودانی قرار دے کر انسان کے قول اور فعل ہر دو نقوش کو جریدۂ عالم پر غیر فانی روشنائی سے ثبت کر دیا ہے +

بخوفِ طوالت ذیل میں چند اشعار بغیر تشریح اور تنقید کے درج کرتا ہوں ناظرین خود ہی ان کی اہمیت کا اندازہ فرمالیں +

ساحل پہ جاؤں لگا بھی تو موجوں کو چیر کر　　کشتی کے بل پہ پار اُترنا نہیں مجھے

الٰہی بہ رہی ہے کشتیٔ دل کس سمندر میں　　نکل آتی ہیں موجیں ہم جسے ساحل سمجھتے ہیں

جب یہ خزاں بھی ایک فریبِ نگاہ ہے　　بہتر ہے مبتلا ہوں فریبِ بہار میں

بارہا ہوُا دھوکا مجھ کو اپنی ہستی کا　　نقشِ غیر فانی کا مظہرِ تجلیؔ کا

ہر چند نغمہ ریز رہا سازِ ہست و بود　　لیکن کھلا نہ رازِ نوا ہائے ساز کا

پندار نے وجود و عدم کو سمجھ لیا　　دیکھا تو یہ بھی راز تھا اور وہ بھی راز تھا

سرِ حدِ عقل سے پرے رفعتِ عرش سے بلند　　جانے کہاں نکل گیا میں تجھے ڈھونڈھتا ہوُا

سوز و گداز

انگریزی شاعر شیلے لکھتا ہے "ہمارے بلند ترین نغمے وہ ہیں جن میں ہمارے سوز و گداز کی داستان ہے"۔ سوز و گداز

جیسے کہ اِس مضمون کے شروع میں لکھا گیا ہے غزل ہی کی رُوح نہیں بلکہ حقیقت میں تمام شاعری کی رُوح ہے۔ غمِ محبت کا ہو یا زندگی کی ناکامیوں کا چشمِ بصیرت کو بہت تیز کر دیتا ہے۔ حقائق و معارف کا صحیح احساس، انسانی جذبات کی عمیق ترین گہرائیوں سے شناسائی اور تخئیل کی بلند ترین چوٹیوں تک رسائی اِسی غم کی بدولت ہے۔ میر، درد، غالب اور اقبال کے اشعار پڑھنے سے ہمارے دل پر چوٹ سی لگتی ہے اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں +

میر کا اثر و تاثیر میں ڈُوبا ہُوا کلام نشتر کدہ اور جراحت کدہ ہے۔ محبت کی جانکاہیاں، فراق کی جگر پاشیاں، آنکھوں کی گریہ سامانیاں اور دل کی جانگداز بے قراریاں امتیازی خصائص ہیں۔ جن سے میر کا کلام اور تغزل لبریز ہے۔ لیکن غالبِ مغفور کا سوز و گداز انسانی تمناؤں کی ناکامیوں، فکر و تخئیل کی نارسائیوں اور آغاز و انجام کی پریشانیوں کا آئینہ دار ہے۔ میر کے اشعار پڑھنے سے ہمارے لطیف ترین جذبات میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور روح ایک پُر سرور غم میں ڈُوب جاتی ہے۔ غالب کو پڑھنے سے ہمیں خود غالب اور عام انسان کی زندگی پر رحم آتا ہے اور ہم پر ایک المناک حیرت طاری ہو جاتی ہے۔

میر آپ بیتی لکھتا ہے اور غالب "جگ بیتی"۔ ایک میں جذباتِ محبت کا سوز و گداز ہے اور دوسرے میں بقول کارلائل اندوہِ خیال۔ حضرتِ اثر کے سوز و گداز کے دو دور ہیں۔ ایک غالب کے رنگ میں اور دوسرا میر کے رنگ میں، دوسرے دور کا آغاز "راحت کدہ" سے ہوتا ہے جو آپ نے اپنی رفیقۂ حیات کے ماتم میں لکھا ہے +

مجھے حُسنِ اتفاق سے اثر صاحب کے اِن دونوں دوروں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جب غالب کے رنگ میں آپ کا جذبۂ سوز و گداز تحریک میں آتا تھا تو میں اُس وقت بھی بعض اوقات آپ کے ہمراہ تھا اور اب جب کہ آپ اپنی رفیقۂ حیات کے غم میں اپنی علیحدہ دنیائے خیال آباد کئے ہوئے ہیں آپ کے ساتھ اکثر میری نشست و برخاست رہتی ہے اور تبادلہ خیالات ہوتا رہتا ہے +

اِس وقت میرے رُو برو "تجلّیات" بھی ہیں اور "راحتکدہ" بھی۔ لیکن جس قدر "راحتکدہ" کی غزلیں سوز و گداز سے بھری ہوئی ہیں "تجلّیات" اُن سے عاری ہیں میں دونوں میں سے علیحدہ علیحدہ اشعار پیش کرتا ہوں قارئینِ کرام خود اندازہ کر لیں گے +

تجلّیات

چشمِ مُشتاقِ دیدیار رہی　　شام تک محوِ انتظار رہی
رات کا قصّہ مختصر یہ ہے　　صبح ہونے تک اشکبار رہی　　ق

تو رہا محوِ خوابِ نازگہ — آرزو تیری بے قرار رہی
گر تغافل ترا شعار رہا — مجھ کو اُمید بار بار رہی
راز سمجھا نہ کچھ گُلِ خنداں — کس لئے چشم اشکبار رہی

اے اثرؔ لطفِ زندگی کیا ہے
خشمگیں جو نگاہِ یار رہی

راحتکدہ

دل میں اب ذوقِ آرزو ہی نہیں — لب کو اب شوقِ گفتگو ہی نہیں
غرقِ افسردگی ہے غنچۂ دل — اب وہ پہلا سا رنگ و بُو ہی نہیں
تیرہ و تار ہے فضائے حیات — جلوہ آرا وہ ماہرو ہی نہیں!
گلشنِ آرزو ہوا ویراں — آہ وہ جانِ آرزو ہی نہیں
آہ! اے ساقیٔ نشاط افروز — کیف زا ساغرو سبُو ہی نہیں
مستیوں سے شراب خالی ہے — رُوح میں شورِ ہا و ہُو ہی نہیں

اے مری جان! اے مری "راحت"
زندگی کیا ہو جب کہ تُو ہی نہیں

سوز و گداز کے ثبوت میں اُوپر جو غزلیں پیش کی گئیں ہیں اُن کے نظریوں میں کس قدر فرق ہے۔ پہلی غزل میں اشتیاق کی فراوانی، انتظار میں اشکباری، آرزو کی بیقراری، کسی کی تغافل شعاری پر بھی اُمید کا برقرار رہنا ہے اور دوسری میں شروع سے اخیر تک ایک مایوسی ہی مایوسی ہے کسی کے کھوئے جانے کی وجہ سے تمام دنیا تیرہ و تار ہے۔ گلشنِ ہستی کی وہ سب رنگینیاں بے کیف ہیں جو کبھی نظرافروزی کرتی تھیں۔ یوں دونوں غزلوں میں سوز و گداز کی کیفیت ہے لیکن دونوں کے محرکات جداگانہ ہیں اور کیفیتیں بھی جداگانہ ہیں ۔

کیف و مستی

کیف و مستی ابتدا ہی سے اعلیٰ شاعری کا ایک جزوِ اعظم سمجھی گئی ہے لیکن اِس کا مفہوم ہر ایک شاعر نے بزعمِ خود

مختلف ہی سمجھا ہے۔ افلاطون لکھتا ہے کہ حسن و جمال سے متاثر ہو کر جو کیف و مستی پیدا ہوتی ہے وہ بلند ترین نیکی ہے۔ حسن و جمال سے مراد ہی ازلی اور ابدی حسن ہے جو کائنات کی رگ و پے میں ساری ہے۔ ایرانی شعرا میں اِس کیف و مستی کا وجود کافی حد تک پایا جاتا ہے لیکن اُردو شعرا میں اِس لطیف ترین جزوِ شاعری کا مفہوم بھی کچھ نرالا ہی سمجھا گیا۔ بھنگڑ خانوں کے آوازے، شوقیانہ پھبتیاں، یاوہ گوئی، شریعت کی تحقیر، علماء و مشائخ کی توہین، ہر نیک اور اعلےٰ جذبے کی تذلیل اور فحش نگاری، رندی اور مستی سے تعبیر کی گئی اور یہ شیطانی رنگ اُردو شاعری پر یہاں تک غالب آیا کہ شریف لوگوں نے اِس شاعری کو دُور سے سلام کیا اور اپنی بہو بیٹیوں کو نہایت سختی کے ساتھ اِس کے مطالعہ سے باز رہنے کی ہدایت کر دی۔ جس کیف و مستی کی طرف افلاطون نے اشارہ کیا ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ بسیار تلاش کے بعد بہت کم ہمیں ملتا ہے۔ لیکن آثر صہبائی کے تمام کلام میں خواہ وہ رباعیاں ہوں یا قطعات نظمیں ہوں یا غزلیں سب پر وُہی افلاطونی کیف و مستی طاری ہے۔ اِسی حسن و جمال کا پرتو اُن کے خیالات پر ہے اور اسی کیفیت سے متاثر ہو کر اُنھوں نے رندانہ اشعار لکھے ہیں۔ ذیل میں ایک دو مسلسل غزلیں نمونتہً پیش کی جاتی ہیں۔

بنظرِ اختصار چند اشعار "تجلیات" سے اور چند اشعار "راحتکدہ" سے درج کرتا ہوں :-

تجلّیات

خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے ۔۔۔ ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

مری ہر سانس سب نغمۂ محفل سمجھتے ہیں ۔۔۔ مگر اہلِ دل آوازِ شکستِ دل سمجھتے ہیں

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم ۔۔۔ رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم
کچھ پھول چُننے آئے تھے اے باغباں مگر ۔۔۔ کچھ داغ لے چلے ہیں ترے گُلستاں سے ہم

اب خاک ہو کے بھی ہیں وُہی بے قراریاں ۔۔۔ اے حسنِ دوست تری تمنا کو کیا کروں
اندوہِ زندگی کا مداوا اگر نہیں ۔۔۔ آبِ حیات دوستِ مسیحا کو کیا کروں

بزمِ احباب میں اِک خندۂ شیریں ہے آثر ۔۔۔ خوب جی کھول کے رو لیتا ہے تنہا ہو کر

شبِ سیاہ ہے طوفانِ بادوباراں ہے ۔ نہ راہبر ہے نہ ہمدم نہ راستہ معلوم
وہ مسکرا دیئے سن کر فسانۂ غمِ ہجر ۔ جو میری جان پہ گذری کسی کو کیا معلوم
یہ داستانِ وفا چھیڑنے سے کیا حاصل ۔ نہ ڈال مجھ پہ یہ افسوں تری وفا معلوم

راحتکدہ

دل بادہ کشِ طرب نہیں ہے ۔ ہوتا تھا کبھی پر اب نہیں ہے
زخموں سے ہوں چور چور لیکن ۔ آلودۂ شکوہ لب نہیں ہے
خوشیاں تو بہت سی ہیں جہاں میں ۔ دل ہی کو مگر طلب نہیں ہے
جب دیکھو اثرؔ کو رو رہا ہے
مر جائے تو کچھ عجب نہیں ہے

یہ سلسلۂ حیات کیا ہے ۔ یہ غم کی طویل رات کیا ہے
دل بیٹھ نہ جائے بارِ غم سے ۔ بیچارے کی کائنات کیا ہے
ہے چپ سی لگی ہوئی اثرؔ کو
معلوم نہیں کہ بات کیا ہے

سخت بے پروا تھا آخر ناگہاں مارا گیا ۔ عشق کی پرسش میں قلبِ ناتواں مارا گیا
آہ منزل تک نہ پہنچا کاروانِ آرزو ۔ راہ میں ہی کارواں کا کارواں مارا گیا
تھا دلِ بے چارہ تنہا اور ہجومِ رنج و غم ۔ جانے اِس گھمسان میں اب وہ کہاں مارا گیا
آپ کی تو دل لگی ہی دل لگی ہوتی رہی ۔ اور ناحق اِک غریب اے مہرباں مارا گیا
یاد ہے تجھ کو بھی وہ صہبائیِ رنگیں مزاج ۔ کارزارِ عشق میں وہ نوجواں مارا گیا

موت کے سوا یا رب اب وہ اور کیا مانگے ۔ جس غریب کو جینا اِک عذاب ہو جائے

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حضرتِ اثرؔ کی شاعری کے دو واضح طور پر مختلف دور ہیں۔ "تجلیات" میں

سوز و گداز موجود ہے لیکن دیگر خصوصیات کی نسبت کم۔ "راحتکدہ" حقیقت میں آتشکدہ ہے۔ شاعر کی تمام زندگی کا سوز و گداز اس میں سما گیا ہے۔ "راحتکدہ" کی غزلیں جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں حضرتِ اثر کی غزل گوئی کا معراجِ کمال ہیں اگرچہ حقیقت میں "خمستان" کا یہ باب مرثیہ خوانی پر مشتمل ہے لیکن تغزل میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھنے والا ایک عجیب کیف انگیز غم سے سرشار ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ میں کسی دوسری صحبت میں "راحتکدہ" کے متعلق عرض کروں گا +

پلائے جا ساقیا پیاپے پلائے جا انتظار کیا ہے | جو لڑکھڑا جائے ایک دو ساغروں میں وہ بادہ خوار کیا ہے
چمن میں رقصِ طرب بپا ہے رباب ہاتھوں میں تھام مطرب | عبث ہیں یہ کاوشیں ترے دل میں، پھول کیا ہے؟ بہار کیا ہے؟
ازل سے خورشید و ماہ کے جام بزمِ ساقی میں چل رہے ہیں | مریدِ پیرِ مغاں کی نظروں میں دورِ لیل و نہار کیا ہے

کسی کو میخوار کر دیا ہے کسی کو واعظ بنا دیا ہے
اثر اُسی کے ہیں یہ کرشمے کسی کا کچھ اختیار کیا ہے

حضرتِ اثر اِس غزل میں کس مستیٔ بیکراں کے تمنائی ہیں وہ شراب ہی پر اکتفا نہیں کرتے ہر چیز سے اُس سرور اور کیف کو حاصل کرتے ہیں چنانچہ دوسرے شعر میں مناظرِ فطرت کی رنگینیوں اور مطرب کے نغموں میں دُنیا کی جملہ کاوشیں بھول جانا چاہتے ہیں۔ وہ پھول کو دیکھ کر اس لئے اس کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہتے کہ اُس کی زندگی عارضی ہے بلکہ وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ پھول کی اور ہماری زندگی یکساں ہے جیسے اُس کی ہستی بے اعتبار ہے ہماری بھی ہے اِس لئے نوحہ خوانی کیسی؟ چوتھے شعر میں اپنے آپ کو کس انداز میں رِندِ ازلی ثابت کیا ہے اور کیف و مستی خورشید و ماہ کے جام سے حاصل کی ہے۔ اللہ اللہ وہ کیف و مستی کیسی ہوگی جو خورشید و ماہ کے جام کی ہوگی اِس پُر نور شراب میں کیسا غیر فانی سرور ہوگا +

اب میں چند متفرق اشعار پیش کرتا ہوں۔ ناظرین از خود اندازہ فرمالیں کہ حضرتِ اثر کی رندی و مستی کس نوع کی ہے۔

ساغرِ گُل میں بادۂ شبنم | اہلِ باطن کی میگساری ہے

مستِ میخانۂ ازل ہے اثر | لوگ رندِ خراب کہتے ہیں

یا ڈوب جائیں لب کر موجِ شراب میں | یا موسمِ بہار نہ آئے شباب میں

اثر جب ہاو ہوئے رندِ مے آشام سنتا ہوں | یہی جی چاہتا ہے بیعتِ پیرِ مغاں کر لوں

کعبے میں یا بتخانے میں یہ بات کہاں میخانے کی　　جو کام ہے آزادانہ ہے جو بات ہے بیباکانہ ہے
کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں　　کاشانہ ہی میخانہ ہے میخانہ ہی کاشانہ ہے
گو ایک گدائے مست ہوں میں لیکن اِک مست الست ہوں میں　　ہیں چاند اور سورج پیمانے دُنیا میرا میخانہ ہے

برسات کی چاندنی راتوں میں دیکھے تو کوئی صہبائی کو
لب پر بھی مناجاتیں لاکھوں ہاتھوں میں بھی میخانہ ہے

مناظرِ فطرت

یوں تو قدیم اردو شاعری کے تمام اصناف مناظرِ قدرت کی زرنگاریوں سے تقریباً محروم ہیں۔ لیکن غزل کو خاص طور پر اِن مضامین سے علیحدہ رکھا گیا۔ مناظرِ قدرت کے حُسن سے کیف اندوزی ہر صاحبِ ذوق و وجدان کی خصوصیت ہے۔ بالخصوص شاعر کی جس کا موضوع ہی حُسن و جمال ہے۔ اردو غزل میں اِس قسم کے مضامین حال ہی میں شامل کئے گئے ہیں۔ حضرتِ اثر ازل سے مناظر پرست واقع ہوئے ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ آج سے سات آٹھ سال قبل میں اور وہ شام کو غروبِ آفتاب کے وقت شفق کی رنگینیوں کا نظارہ شہر سیالکوٹ کے ایک بلند ترین مقام سے کیا کرتے تھے۔ پیشتر راقم الحروف "ہمایوں" میں حضرتِ اثر کی اِس خصوصیت کو اُن کی نظموں کی تنقید کے سلسلہ میں نمایاں کر چکا ہے۔ اِس صحبت میں آپ کی غزلیات میں سے مناظرِ قدرت کے متعلق کچھ پیش کرتا ہے:-

ہر برگِ زرفشاں چمنِ زرنگار کا　　گویا ورق ہے ایک کتابِ بہار کا
نغموں سے گونج اُٹھی ہے فضا کوہسار کی　　رنگیں نوا ہوا ہے ربابِ آبشار کا
عالم تمام میکدۂ حُسن بن گیا!　　رُخ بے نقاب دیکھ کے صبحِ بہار کا
رنگینیاں ہیں خوابِ محبت کی سامنے　　یا لالہ زار ہے شفقِ پُربہار کا
آئینۂ جمال ہے فردوسِ کائنات　　یا بحرِ بیکراں ہے مئے خوشگوار کا

بُوئے نسیم دیتی ہے مجھ کو پیامِ دوست
ہر سانس مشکبار ہوا انتظار کا

حضرتِ اثر کی اکثر غزلیات مسلسل ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کسی نہ

کسی اثر کے ماتحت شعر لکھتے ہیں - یہاں کچھ اشعار اور پیش کرتا ہوں تاکہ حضرتِ اثر کے اِس پہلو کا صحیح صحیح اندازہ ہو جائے ۔

جنگل کی چاندنی میں یہ پھول جھومتے ہیں　　یا رقص ہو رہا ہے پریوں کی انجمن میں

ہر شاخ جب اِک مستانہ ہی ہر پھول جب اِک پیمانہ ہے　　توبہ ! ایسے میں توبہ !! جب فطرت ہی میخانہ ہے
گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں رحمت بن بن کر چھائی ہیں　　آباد ہوئے ہیں میخانے سجدے ہیں ہر اِک مستانہ ہے

چاندنی رات میں اور صبحِ بہاراں میں اثر　　حُسنِ معصوم فراواں نظر آتا ہے مجھے

ڈوبی ہوئی ہے کیفِ محبت میں کائنات　　لائی ہے یہ پیام نسیمِ بہار کیا
سازِ طرب، کنارۂ جُو، چودھویں کا چاند　　اے ساقیٔ بہار ہے اب انتظار کیا
مستی میں جھومتا ہے دِلِ بیخودی پرست　　میخانۂ نشاط ہے ابرِ بہار کیا
ہر چیز مشکبار ہے سرشارِ حُسن ہے　　چھایا ہُوا ہے جلوۂ صبحِ بہار کیا

جذبات آفرینی

فلسفہ کی رُوح عقل، مذہب کی رُوح عمل اور شاعری کی رُوح جذبات ہیں۔ جس طرح فلسفہ میں عقلِ منطقی اور وجدانِ باطنی میں، اور مذہب میں شریعتِ ظاہری اور عرفانِ حقیقی میں ہمیشہ سے جنگ چھڑی چلی آتی ہے اسی طرح شاعری میں جذبات پرست اور عروض پرست حضرات میں ہمیشہ سے چشمک رہی ہے۔ ضرورت دونوں کی ہے لیکن غلو جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے بعض اوقات عجیب وغریب اور مضحکہ انگیز حد تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات پرست شعرا نے عروضی پابندیوں کو قید و بند کی زنجیریں سمجھ کر توڑنا چاہا اور عروضیوں نے اِس قدر متعصبانہ خردہ گیری سے کام لیا کہ ہر صاحبِ ذوق کے لئے شعر کہنا مشکل ہو گیا۔ ایک طرف طوفانِ بدتمیزی اور بے راہروی کا نام شاعری رکھا گیا اور دوسری طرف محض الفاظ کے گورکھ دھندے، عروض کی پابندی اور مہمل اور دُور از کار صنائع بدائع کو شاعری کی رُوح قرار دیا گیا۔ الحمدللہ کہ یہ جنگ اب قریب الاختتام ہے اور ہر دو گروہ اپنی اپنی مبالغہ پسندی پر پشیمان نظر آتے ہیں۔ لیکن اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس مصالحت میں پلّہ جذبات پرست کا بھاری ہے ۔

حضرتِ اثرؔ جذبات پرست ہیں لیکن آپ کی طبیعت میں ایسا خوشگوار توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے کہ دونوں گروہوں کے لئے آپ کے کلام میں سامانِ مسرّت موجود ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، اندازِ بیان کی شگفتگی، مضامین کی تازگی اور الفاظ کا حُسنِ انتخاب آپ کی غزل کی خصوصیات ہیں۔ مَیں یہاں پر جذبات پرستی کے ساتھ ہی آپ کے اس اندازِ تغزل کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں اور مثالیں بھی پیش کر دوں گا جو ٹھیٹھ اُردو زبان میں آپ نے لکھی ہیں۔ لیکن وہ بھی حقیقی جذبات کے زیرِ اثر ہیں *

پھر خندہ زیرِ لب کوئی آتا ہے اے اثرؔ　　　پھر جُھک رہا ہے سر مرا عجز نیاز سے
پھر جگمگا رہی ہے مری بزمِ آرزُو　　　دیکھا کسی نے پھر نگہِ دل نواز سے

آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تری رہگذار میں　　　آغوشِ شوق وا ہے ترے انتظار میں

تری نگاہِ محبت نواز کا ہے فسوں　　　کہ دل کا قطرہ یم بے کنار ہو جائے

اے اثرؔ لطفِ انتظار میں پھر　　　آ چلا ہے کچھ اضطراب کا رنگ

وہ اُن کا میری جانب دیکھ کر کچھ مسکرا دینا　　　وہ صہبائے محبت سے مرا سرشار ہو جانا

تری یاد اس طرح دل کی کلی کو گدگداتی ہے　　　کہ جیسے صُبحدم موجِ نسیمِ مشکبار آئے
نہ جانے کیا کشش ہم کو یہاں تک کھینچ لائی ہے　　　تری محفل میں ہم آئے مگر بے اختیار آئے

ہم جان و دل کو نذرِ تغافل بھی کر چکے　　　وہ مسکرا کے دیکھتے اِتنا نہ ہو سکا

غزل

شوخیٔ حُسن نازنینوں میں　　　مے چھلکتی ہے آبگینوں میں
اب اُلٹ دے نقابِ عارض کو　　　سجدے بیتاب ہیں جبینوں میں
سنگِ اسود میں ڈھونڈتا ہے جسے　　　جلوہ پیرا ہے وہ حسینوں میں
انجمستانِ حُسن ہے گویا　　　عشق کے داغ ہیں جو سینوں میں

حُسن ہی حُسن جلوہ فرما ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں
کارفرمائی جنوں دیکھو اب گریباں ہیں آستینوں میں
اے اثرؔ لطفِ مے پرستی ہے
شبِ مہتاب مہ جبینوں میں

مندرجہ بالا سطور میں حضرتِ اثرؔ کے رنگِ تغزل کے مختلف نمونے پیش کئے گئے ہیں ناظرین کرام نے ان سے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اثرؔ صاحب نے غزل میں کیسی کیسی جدّتیں پیدا کی ہیں۔ غزل کے دامن کو کتنا وسیع اور اِس صنفِ شاعری کو کتنا وقیع بنا یا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اثرؔ صاحب نے ژرف نگاہی، بلند نظری، حقائق آفرینی، کیف و مستی، رندی و شوخی، مناظر پرستی، شگفتگی اور تازگی، جذبات نگاری اور سوز و گداز غزل میں یکجا کر کے اُردو غزل گوئی میں ایک نہایت جمیل و حسین اور کیف انگیز باب کا افتتاح فرمایا ہے۔ میرؔ کی غزل کا طغرائے امتیاز سوز و گداز ہے۔ غالبؔ کی غزل حکمت و فلسفہ کے باعث ممتاز ہے لیکن اثرؔ صاحب کی غزل بلکہ اُن کی شاعری کی رُوح رواں حُسن ہے +

اثرؔ صاحب کے کلام کا مجموعہ "خمستاں" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اربابِ ذوق اِس کے مطالعہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اثرؔ صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اُردو ادبیات میں کن بیش بہا جواہر ریزوں کا اضافہ کیا ہے +

فگارؔ

ذوقِ نظر

میری نگہِ شوق ہے اور وہ رُخِ انور
مَیں اُن کو بہ اُمیدِ وفا دیکھ رہا ہوں
قُربان ہیں اِس دیکھنے پر میری نگاہیں
وہ دیکھ رہے ہیں کہ مَیں کیا دیکھ رہا ہوں

حفیظؔ ہوشیارپوری

ایک سیاح کا روزنامچہ

سات بجے ہیں، سیٹی ہوتی ہے۔ پھر پہیوں کی گڑگڑاہٹ، اور ہم روانہ ہو جاتے ہیں۔ گاڑی ایک لائن پر سے دوسری پر گذرتی ہے۔ زنجیریں کھٹکتی ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے کھڑکھڑاتے ہیں۔ پھر پوری تندی کے ساتھ ہم رات کی تاریکی کو چیرتے ہوئے گذرنے لگتے ہیں۔ انجن سے بھک بھک کی آواز آ رہی ہے۔ کبھی دائیں، بائیں کوئی دیوار یا درخت آ جاتا ہے تو انجن کی تیز روشنی اُس پر گر کر چمکتی رہے۔

گاڑی میں ہم چھ افراد ہیں۔ دو دو ہر سیٹ پر۔ میری مخالف سیٹ پر ایک موٹی خاتون بیٹھی ہے اور اُس کا موٹا خاوند ——— غالباً کوئی پُرانا جوڑا ہے۔ برابر والی برتھ پر، ایک نوجوان جوڑا ہے۔ نہ معلوم اُن کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں لڑکی بہت خوبصورت ہے اور شرمیلی۔ مگر اُس کے کپڑوں میں سے خوشبو بہت آ رہی ہے۔ خدا جانے کس چیز کی خوشبو ہے، گلاب؟ نہیں شاید لیونڈر ہے ——— نہ معلوم۔ میری سیٹ پر ہی کونے میں ایک شخص بیٹھا ہے ——— کوزہ پشت۔

موٹی خاتون نوجوان عورت کی طرف نہایت نامہربان نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ موٹا خاوند، آنکھیں بند کر لیتا ہے ——— ابھی سے! کوزہ پُشت کپڑوں میں لپٹ لپٹا کر گیند سا بن گیا ہے۔ اب اُس کے پیر بھی نظر آنے بند ہو گئے۔ صرف کپڑوں کے ایک بُوغمہ میں سے اُس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے سفری کمبل کے اندر کو پھسلنے لگتا ہے۔ اب بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ایک مختصر سا پارسل اُٹھا کر سیٹ پر ڈال دیا گیا ہے۔

صرف موٹی خاتون ابھی جاگ رہی ہے، مشتبہ اور بے آرام۔ گویا وہ ایک اخلاقی چوکیدار ہے۔ جس کا فرض مسافروں کے کردار کی حفاظت کرنا ہے۔ نوجوان جوڑا بالکل خاموش ہے۔ اُن کی ٹانگیں ایک ہی کمبل میں لپٹی ہوئی ہیں اور دونوں کی آنکھیں نیم وا ہیں۔ مگر ہونٹ بالکل بند ہیں۔ نہ معلوم اُن کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔

مَیں بھی سونے کا ارادہ کرتا ہوں۔

۹ بجے موٹی خاتون سونے کے قریب ہے۔ اُس کی آنکھیں وقفہ کے ساتھ بند ہو رہی ہیں۔ سر سینہ پر ڈھلکا جا رہا ہے مگر وہ چونک کر اُٹھتی ہے اور گرد و پیش دیکھتی ہے ——— ایلو اب وہ بھی سو گئی۔

میں اُٹھتا ہوں اور روشنی بجھا دیتا ہوں۔ صرف ایک چھوٹا سا دُھندھیا قمقمہ روشن ہے۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔

۔۔۔۔۔۔ گاڑی اسٹیشن پر کھٹ سے رُکتی ہے ۔ میری آنکھ کُھل جاتی ہے ۔ نوجوان جوڑا ابھی سو رہا ہے ۔ میں بھی آنکھیں بند کر لیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور غنودگی سی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیجیئے وہ صبح ہوگئی ۔ گاڑی دریا کے کنارے کنارے چل رہی ہے ۔ ہر شخص سو رہا ہے ، نوجوان لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے سے لگ کر سو رہے ہیں ۔ لڑکی کا ایک پاؤں کمبل سے باہر نکلا ہوا ہے ، اُس کی جرابیں سفید رنگ کی ہیں ــــــ یقیناً شادی شدہ ہے ۔ اُف کمرے کی ہوا کس قدر غلیظ ہوگئی ہے ۔ مَیں ایک کھڑکی کھولتا ہوں خفیف سی آواز ہوتی ہے ۔ پھر تازہ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے درجہ میں آنے لگتے ہیں ۔ سب جاگ اُٹھتے ہیں ۔ صرف کوزہ پشت ایک کونے میں خراٹے لے رہا ہے ۔

موٹی خاتون اُٹھ کر بیٹھ گئی ہے ، اور آنکھیں مل مل کر نفرت انگیز نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھتی ہے ۔ سُرخ چہرہ اور بکھرے ہوئے بال اُسے یکسر ناقابلِ برداشت بنا رہے ہیں ۔ نوجوان عورت مسکرا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھتی ہے ــــ اگر شادی شدہ نہ ہوتی تو پہلے آئینہ دیکھتی ۔

مارسیلز آگیا ۔ یہاں گاڑی بیس منٹ ٹھیریگی ۔ مَیں باہر نکل کر ناشتہ کرتا ہوں ۔ پھر پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر گھوم کر واپس ۔ کوزہ پشت غائب ہو چکا ہے ۔ اُس کی جگہ دو شریف آدمیوں نے پُر کر لی ہے ۔

پھر دونوں شادی شدہ جوڑے ــــ بڈھا اور جوان ــــ اپنے ناشتہ دان کھولتے ہیں اور بے تکلف کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ مَیں سوچنے لگتا ہوں ، گاڑی میں ٹھنڈا ، باسی کھانا نوش کرنا اور ہم سفر لوگوں کی جھوٹی صلاح کئے بغیر ۔ یقیناً حد درجہ کی بدتمیزی اور سوقیانہ پن ہے ــــ میرا دل گانے کو چاہ رہا ہے ــــ چلّانے کو ــــ سگرٹ جلا کر اُس کا دھواں ان بداخلاق لوگوں کے حلق میں چھوڑنے کو ــــ جوتا اُتار کر اپنی بدبودار جرابوں سے اُن کی تواضع کرنے کو ــــ حماقت ہوئی پیٹرول کا ایک کنستر ضرور ساتھ لانا چاہیئے تھا ۔

یہ لیجیئے سینٹ ٹروپز آگیا ۔ کسی زمانہ میں یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی ۔ جا بجا عرب عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں ۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی گاؤں کی فضا اب تک مشرقیت سے بے حد متاثر ہے ۔ ہر مکان آراستہ ، رنگین اور شاعرانہ معلوم ہوتا ہے ۔ نہ سڑک ہے ، نہ ریل ، نہ تار برقی ۔

اب ہم سمندر کے کنارے کنارے جا رہے ہیں ۔ ساحل کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبے صبح کے سورج کی مخمور شعاعوں میں چمک رہے ہیں ۔

یہ کینز ہے ، اور وہ سامنے جزائر لیرانسز ہیں ــــ نہایت خوبصورت اور معتدل ۔

یہ لو نائس آگیا۔ یہاں غالباً نمائش ہے۔ آؤ دیکھیں۔ بندرگاہ خراب ہے۔ پانی گہرا نہیں، اور کیچڑ زیادہ ہے ساحل کے کنارے کنارے چل کر ایک عالیشان عمارت تک پہنچ جاتے ہیں۔ عمارت قدرے بلندی پر واقع ہے، کچھ بہت خوبصورت تو نہیں ہے، مگر بڑی کافی ہے۔

اندر کچھ اشخاص ٹوٹے ہوئے بکسوں کے ایک وسیع گودام میں گھوم رہے ہیں۔ نمائش گاہ کی رسم افتتاح ہوئے، تو مدت گذر چکی ہے، مگر ابھی مکمل نہیں ہے، سالِ آئندہ تک یقیناً ہو جائیگی۔

اگر مکمل ہوتی، تو اندر سے کافی دلکش ہوتی ــــ اب تو چنداں خوبصورت نہیں ہے۔

میرے واسطے دو حصے خاص دلچسپی رکھتے ہیں ــــ فنونِ لطیفہ اور وہ جس میں اکل و شرب کی اشیا کا انتظام کیا گیا ہے۔ آخر الذکر میں نوع، نوع کے لذیذ پھل ہیں ــــ تازہ اور محفوظ کئے ہوئے، مگر افسوس کہ یہ چیزیں فروخت نہیں کی جاتیں۔ وجہ یہ ہے کہ حکومت شہر کی تجارت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ مٹھائیوں کی نمائش محض عشرتِ نگاہ کے واسطے کرنا، چکھنے کی سخت ممانعت کے ساتھ، میرے نزدیک بنی آدم کی لطیف ترین اختراعوں میں سے ہے۔

فنونِ لطیفہ کا حصّہ ابھی زیرِ تعمیر ہی ہے۔ مگر چند کمرے مکمل ہو چکے ہیں، اور وہاں یورپ کے بہترین مصوّروں کے شاہکار رکھے گئے ہیں۔ خصوصاً "کنواری مریم کی تصویر" اور "چند مناظر" بہت دلکش ہیں۔

\+ \+ \+ \+

دوسرا دن۔ بحیرۂ روم کا تمام ساحل عطار کا "جبل الذہب" ہے۔ محض کھانسی کی دوا کی معمولی سی مقدار خریدنے کے لئے ہزاروں روپیہ چاہیئے۔

نائس سے مانیکو جانے کے لئے سمندر کے کنارے ایک خوبصورت اور صاف سڑک ہے، ریل سے اس کا منظر بہت دلکش ہے، پہاڑوں، ٹیلوں اور گھاٹیوں میں سے ہوتی ہوئی یہ سڑک ایک عجیب انداز سے جسم چُرائے ہوئے گذرتی معلوم ہوتی ہے۔ گرد و پیش حیرت انگیز پہاڑیاں اور سبزہ ہے۔

یہ مانیکو ہے اور اس کی پشت پر مانٹی کارلو۔ جوا کھیلنے والوں کے واسطے تو غالباً مانٹی کارلو سے بہتر فردوس اس دنیا میں نہ ہو سکے، مگر ایک سیاح کے لئے وہاں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ شہر کا منظر کس قدر غمگین ہے۔

قدرے آگے بڑھ کر مینٹون ہے۔ یہ بحیرۂ روم کے ساحل پر گرم ترین مقام ہے اور دق کے مریضوں کا مرکز۔ یہاں نارنگیوں کی پیداوار بہت کثرت سے ہوتی ہے۔

رات کی گاڑی سے میں واپس مارسیلز لوٹ رہا ہوں۔ میرے درجے میں دو خوش لباس خواتین بیٹھی ہیں۔ ایک

مارسیلز کا مرد ہے، جو ہم لوگوں کو چوری، قتل اور ریلوے حادثات کے واقعے سُنانے پر مُصر ہے۔ کہنے لگا:۔

ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، آپ حضرات سُن کر متحیر ہونگے۔

میرا ایک دوست تھا کارسکا کا باشندہ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے لڑکے کے ساتھ پیرس آیا۔ واپسی میں مَیں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ لڑکا جس کی عمر غالباً بیس سال ہوگی۔ پہلے کبھی ریل میں سوار نہیں ہوا تھا۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ریلیں چلی ہی تھیں۔ چنانچہ جتنی دیر ریل چلتی رہی، وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے کھڑا رہا۔ اُس کا باپ بار بار کہتا کہ بیٹا اتنا مت جھکو چوٹ پھینٹ لگ جائیگی۔ مگر لڑکا جواب بھی نہ دیتا۔

مَیں نے اُس سے کہا:۔

"میاں دیکھنے بھی دو۔ تمہارا اس میں کیا حرج ہے"۔

مگر اُس نے غصّہ میں آکر سختی سے کہا:۔

"مَیں کہہ رہا ہوں کہ باہر نہ دیکھے جا۔ مگر مانتا نہیں۔ خبیث کہیں کا"۔ لڑکے نے اب بھی جواب نہ دیا۔ تو غصّہ میں آکر باپ نے اُس کے کوٹ کو زور سے جھٹکا دیا۔ لڑکا ہمارے قدموں پر آرہا ——— سر غائب تھا۔ شاید کسی سُرنگ و رنگ سے کٹ گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ خون تک نکلنا بند ہو چکا تھا"۔

ایک خاتون نے شدّتِ اثر سے آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے ساتھ والی پر گر پڑی ——— اُسے غش آگیا تھا۔

(گائی دا موپساں)

معین الحق حقی

رباعی

اک جرعہ بہ سازِ نظر دے ساقی
اک جام بہ آئینِ دگر دے ساقی
تابِ آتشِ عشق کی نہیں ہے مجھکو
تاخیر نہ کر آتش کش تر دے ساقی

سعید احمد اعجاز

دنیائے ادب

اردو

منہ اندھیرے کا جادو

یہ کون اٹھا ہے شرماتا رین کا جاگا، نیند کا ماتا
نیند کا ماتا، دھوم مچاتا انگڑائیاں لیتا، بل کھاتا
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخ پر سرخی، آنکھ میں جادو بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون، سمٹے ابرو نیچی نظریں، بکھرے گیسو
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا، مسکی چولی ہلکی مہندی دھندلی مہندی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رخ تابانی میں انوارِ سحر پیشانی میں
یا موجِ گہر طغیانی میں یا چاند کا مکھڑا پانی میں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخسار پہ موجِ رنگینی، کچی چاندی، سچی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی مکھڑے پہ سحر کی شیرینی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

آنکھیں ہیں غلطاں عشرت گاہیں نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں، عریاں باہیں جان سے ماریں جس کو چاہیں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ہلچل میں دل کی بستی ہے طوفانِ بلا میں ہستی ہے
آنکھوں میں شب کی بستی ہے اور مستی دل کو ڈستی ہے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

کچھ جاگ رہی، کچھ سوتی ہے ہر موجِ صبا منہ دھوتی ہے
ناشستہ رخ، یا موتی ہے انگڑائی سے جز بز ہوتی ہے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

پھیلا پھیلا آنکھوں کا کاجل الجھا الجھا زلف کا بادل
نازک گردن، پھول سی کونپل سرخ پپوٹے نیند سے بوجھل
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رنگت پھیکی نیند کے مارے پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے دھرتی ماتا بوجھ سہارے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

"شاہجہان"

ہندی

آخری تمنّا

سکھیو! پران ناتھ کیوں نہیں آتے؟ کیا وہ اپنی داسی سے خفا ہیں؟ کیا وہ میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے؟ اُس دن جب کنویں کی جگت پر اُن سے ملاقات ہوئی تھی تو اُن کی آنکھوں میں چمک تھی، پریم کی چمک۔ آہ! وہ کتنے پیارے معلوم ہو رہے تھے، آسمان کے فرشتوں سے زیادہ مقدس، ہاں میں اُس کو نہیں بھول سکتی، اُن کا پریم دل کی گہرائی میں پیوست ہو چکا ہے۔ لیکن بھگوان جانے کیوں وہ اب میرے محبت سے اُٹھے ہوئے ہاتھ کو الگ ہٹا دیتے ہیں۔ مجھ کو پریم کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ غصّے کی نظر سے۔ شاید مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہوگا۔ لیکن اُنہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ چلے گئے، خاموش اور چپ چاپ۔ سکھیو! اب میں زندہ رہ کر کیا کرونگی۔ میں جس کی ہوں وہ تو آتا ہی نہیں۔

سیّد شرف الحسن آوری

اُلجھن

میں غفلت کی نیند سے تھک کر جاگتا ہوں اور پھر سو جاتا ہوں اور خود کو اپنے آپ میں پا کر پھر ذرا سی دیر میں گم ہو جاتا ہوں۔

جب جی بھر کر رو لیتا ہوں تو کھل کر ہنستا رہتا ہوں۔

اسی طرح ہر روز سکھ کے سونے کے مانند دکھ کی کسوٹی پر کسا جاتا ہوں،

پھر وصل کا شربت پی کر جدائی کی مصیبت کو محسوس کرتا ہوں اور جینے کی اُمید میں آخری سانس لیتا ہوں۔

میرا دل زمانہ کی چوٹوں کو سہ سہ کر چٹان کے مانند صدمے برداشت کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

میں اُلجھنوں میں پڑ کر سُلجھ جاتا ہوں اور قید میں پڑ کر نجات حاصل کر لیتا ہوں۔ ایسی نرالی میری زندگی ہے۔

اندرجیت شرما

عربی

رفتارِ زمانہ

زمانے کے مختلف لباس ہیں۔ کبھی نیا پہنتا ہے اور کبھی پرانا۔ تو اس تغیر لباس میں اس کی روش پر چل۔ جب وُہ نیا پہنے تو بھی نیا پہن، اور جب زمانہ پرانا لباس پہنے تو بھی پرانا پہن۔ جب تو عقلا کے مجمع میں بیٹھے تو سب سے زیادہ عقلمند ہو اور جب بیوقوفوں کے مجمع میں جائے تو احمق بن جا۔

شب فراق

اے امیمہ مجھ کو ایسے بامشقت غم اور شبِ فراق کے سپرد کر دے جس کے ستاروں کی رفتار بے حد سست ہو۔ مَیں اس شبِ غم کی تکالیف برداشت کر لوں گا۔ لیکن وہ شب اتنی طویل ہو گئی کہ مَیں نے کہا اس کا خاتمہ نہ ہو گا اور پہلا طلوع ہونے والا ستارہ (شاید) لوٹ کر اپنے مرکز پر نہ آئیگا۔

"عالمگیر"

روسی

ٹھہر!

ٹھہر، ٹھہر! اسی طرح جیسے میں تجھے دیکھ رہا ہوں میرے حافظے میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جا!

تیری آواز کا آخری نغمہ ختم ہو چکا ہے۔ تیری آنکھوں میں اب کوئی روشنی، کوئی چمک باقی نہیں رہی، وہ اب ماند پڑ گئی ہیں، خوشی کے بوجھ سے ——— احساسِ حسن کے پُرمسرت بوجھ سے وہ دب گئی ہیں کیسی خوش نصیب تھی تُو کہ خُدا نے تجھے حُسن کے اظہار کے لئے پیدا کیا۔ ـــــ حسن جس کی جستجو میں تیرے پُرآرزو ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں، فیروزمند، تھکے ہوئے ہاتھ۔

یہ چمک، آفتاب کی چمک سے بھی زیادہ روشن اور صاف کیسی ہے جو تیرے تمام اعضا اور تیرے کپڑوں کی ایک ایک شکن سے نکل رہی ہے؛

یہ کس دیوتا کا سانس ہے جو تیری بکھری ہوئی زلفوں کو لہرا رہا ہے ؟

ہاں راز کھل گیا، شعر، زندگی اور محبت کا راز! یہ ہے بقا! اس کے علاوہ بقا اور کچھ نہیں، نہ کچھ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس لمحے میں تو غیر فانی ہے۔

یہ لمحہ گزر جائیگا تو ایک دفعہ پھر تو خاک کا ایک ذرّہ ہوگی، ایک عورت، ایک بچہ.... لیکن تجھے اس کی فکر کیوں ہو! اس ایک لمحے میں تو ہر اس چیز سے بالاتر ہے جو مٹ جانے والی ہے، عارضی ہے، تیرا یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہوگا +

"ہمایوں"

انگریزی

گم گشتہ محبوب

مجھے اس سے محبت نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے تنہائی مجھے ستا رہی ہے۔ جب کبھی وہ مصروفِ گفتار ہوتی، میں اس کی بات کاٹ دیا کرتا۔ لیکن افسوس ہیں اپنے جابرانہ افعال سے اس وقت باز آ رہا ہوں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ میں نے بڑے غور کے بعد اس کی محبت کو ٹھکرا دینے کی وجہ تلاش کی اور تخیل کو اپنی فتنہ پردازی کا معترف پایا۔ اس نے میری رہبری غلط راستے پر کی تھی ـــــ ہم دونوں کی ایذا رسانی کے لئے۔ کاش وہ آج کے دن ہوتی اور میں اپنی محبت کو اس پر نثار کرتا ـــــ وہی جو کبھی میری خاطر زندہ تھی! اور جب نہ سکی اس ٹوٹ گئی اس نے اپنا چہرہ پاک زمین میں چھپا لیا ـــــ موت کی گرم اور پریمی آغوش میں تو میرا دل اس کی جدائی میں بیٹھا جا رہا ہے۔ لیکن اب میں بھی محبت کا جواب محبت سے دے رہا ہوں۔ میری ویران آغوش اس کے فراق میں آفتابِ تموز کی مانند جل رہی ہے۔ اس کی یاد نیند میں میرے شانے کو ہلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اٹھ اور اس کے فراق میں آنسو بہا۔ میں خون کے آنسو روتا ہوں ـــــ وہی آنسو جنھوں نے اس کے نرم دل کو گھلا دیا تھا۔ افسوس اس نے برسوں ایسے خونیں آنسو بہائے ہیں۔

مرزا باقر علی زاہد

انعامی مقابلہ

پچاس روپے کے انعامات کا سلسلہ

انعامی مقابلہ نمبر (۲) بابت ماہِ دسمبر کا نتیجہ

نہایت خوشی سے اعلان کیا جاتا ہے کہ دسمبر کے مقابلہ (شہروں کے نام) میں مندرجہ ذیل چار اہلِ مقابلہ نے انعامات حاصل کیے ہیں۔ ان چاروں کے حل بالکل درست ہیں۔ اس لئے انعام کی رقم ان میں مساوی طور پر تقسیم کر دی گئی ہے۔

(۱) بیگم نقوی۔ معرفت سید سجاد حیدر صاحب بی اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل۔ ڈاکومنٹ اکسپرٹ کشمیر بلڈنگ۔ لاہور

(۲) مسز محمد اسحٰق۔ بانس منڈی۔ لاہور

(۳) میاں احمد صاحب۔ ہیڈ کلرک انجمن اسلامیہ۔ ایم اے او کالج۔ امرتسر

(۴) مشکور احمد صاحب معرفت بابو محمد فضل قدیر صاحب۔ کوچہ غزنویہ کٹڑہ مہان سنگھ۔ امرتسر

انعامات کی رقمیں ان بیگمات و صاحبان کو بذریعہ منی آرڈر ارسال کی جا رہی ہیں۔

ماہ جنوری کے مقابلہ کا حل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ صبر	۲۔ برقِ آسمانی	۳۔ چاند	۴۔ گلاب	۵۔ زلف	۶۔ مرچ
۷۔ بوسہ	۸۔ ستارہ	۹۔ وقت	۱۰۔ نیلم	۱۱۔ شراب	۱۲۔ شباب

اگر آپ کا حل اس حل کے مطابق ہے یا اس میں زیادہ سے زیادہ تین غلطیاں ہیں تو آپ ایک اطلاعی کارڈ ۸ مارچ ۱۹۳۴ء تک ایڈیٹر مقابلہ ادبی دنیا لاہور کے نام ارسال کر دیں۔ موصولہ مطالبات کی جانچ کرنے کے بعد انعام کی رقم کامیاب اہلِ مقابلہ کو ارسال کر دی جائے گی اور اُن کے نام اور پتہ کا اعلان مارچ کی اشاعت میں کر دیا جائیگا۔

+ + + + +

انعامی مقابلہ نمبر ۴

پچاس روپے کے انعامات

قواعد:- ۱- اگلے صفحے پر ۱۲ اشارات کا ایک سٹ ہے۔ ان میں سے ہر اشارہ ایک مرکب لفظ یعنی دو لفظوں سے بنے ہوئے ایک لفظ کی تشریح کرتا ہے۔ آپ کو صرف اس قدر سوچنا ہے کہ کونسا مرکب لفظ کس اشارہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اشارہ نمبر ۵ کا حل "راہ رو" ہے۔ باقی گیارہ مرکب الفاظ آپ کو دریافت کرنے ہیں۔ وہ تمام مفرد الفاظ جن سے یہ مرکب لفظ بنتے ہیں اُس فہرست میں موجود ہیں جو اشارات کے نیچے دی گئی ہے۔

۲- تمام نام چھپے ہوئے کوپن پر جو اگلے صفحہ پر دیا گیا ہے نمبروار درج کردیں۔ اور کوپن کے باقی اندراجات پُر کر کے کوپن پر ۲ ؍ کا ٹکٹ چسپاں کریں اور اُسے ایک لفافہ میں بند کرکے مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں **انعامی مقابلہ نمبر ۴ دفتر ادبی دنیا پوسٹ بکس ۱۹۷ لاہور**۔ کوپن کے اندراجات میں اگر کوئی کاٹ چھانٹ ہوئی تو اُسے شاملِ مقابلہ نہیں کیا جائیگا۔

۳- آپ اپنے ارسال کردہ حل کی ایک نقل اپنے پاس رکھ لیں۔ تاکہ جب ایڈیٹر مقابلہ کا حل اگلے پرچے میں شائع کیا جائے تو آپ اپنے حل کی صحت یا غلطی جانچ سکیں۔ جو حل ایڈیٹر کے حل کے مطابق ہوگا اُسے صحیح تصور کیا جائیگا اور ارسال کرنے والے کو مبلغ پچاس روپے کا انعام دیا جائیگا۔ اگر کوئی حل بھی صحیح نہ ہوا تو وہ حل انعام کا مستحق ہوگا جس میں سب سے کم غلطیاں ہونگی اگر ایک سے زیادہ حلوں میں کم از کم غلطیاں ہوئیں تو انعام کی رقم حقداران اہلِ مقابلہ میں ایڈیٹر مقابلہ کی صوابدید کے مطابق تقسیم کر دی جائیگی۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر مقابلہ کا فیصلہ قطعی اور قانوناً قابلِ تسلیم ہوگا۔

۴- اگر وصول شدہ ٹکٹوں کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے بڑھ گئی تو انعام کی رقم بھی اسی نسبت سے بڑھا دی جائیگی اور اگر کم رہی تو ہم بقایا اپنے پاس سے ادا کرکے پچاس روپے ادا کر دیں گے۔

۵- حل دفتر ادبی دنیا میں ۸ مارچ ۱۹۳۴ء کی شام تک وصول ہو جانے چاہئیں۔ بعد میں آنے والے حل شاملِ مقابلہ نہیں کیے جائیں گے۔ مقامی اصحاب اس تاریخ تک دستی بھیج سکتے ہیں۔

۶- آپ جس قدر حل چاہیں ارسال کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر حل مطبوعہ کوپن پر ہونا چاہیے اور ہر حل کے ساتھ دو آنے کے ٹکٹ شامل کرنے چاہئیں۔ ایک سے زیادہ حل ایک لفافے میں ارسال ہو سکتے ہیں۔

فہرستِ مضامین

جلد ۹ — نمبر ۳

بابت ماہِ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء

تصاویر - ۱ - تختِ جمشید، تباہی سے پہلے - ۲ - تختِ جمشید، تباہی کے بعد

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	آئینۂ عالم	منصور احمد	۲
۲	تختِ جمشید	جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے	۷
۳	رنگ و نور (نظم)	جناب سید عبدالحمید صاحب عدم	۱۶
۴	طوفانِ جذبات (افسانہ)	جناب ایس سایم - ناظم صاحب میرٹھی - ایم ایس سی -	۱۷
۵	رباعیات	جناب مولنٰا جلال الدین صاحب اکبر بی اے آنرز	۳۱
۶	درشن پیاسی (گیت)	جناب پنڈت امرچند صاحب قیس جالندھری	۳۲
۷	تیجن کے گیت	حضرتِ وقار انبالوی	۳۳
۸	رضیہ کی جوان موت پر	جناب محترمہ ح - ب - صاحبہ	۴۰
۹	رقعاتِ غالب پر ایک نظر	جناب پنڈت مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل	۴۱
۱۰	بازاین چہ آفت ست نہالِ امید را	جناب پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد ایم اے	۴۵
۱۱	بندۂ زر (افسانہ)	جناب مولنٰا مہر محمد خان صاحب شہاب مالیرکوٹلوی	۴۷
۱۲	غزل	حضرتِ حاجی سرحدی	۵۸
۱۳	ضیا	منصور احمد	۵۹
۱۴	نصیب (غزل)	جناب محمد ناصر الدین خان صاحب ناصر بی اے	۶۱
۱۵	باپ (افسانہ)	جناب نصیر احمد صاحب بی اے	۶۲
۱۶	غزل	جناب بابو مہتاب الدین صاحب	۶۶
۱۷	کوئی خبر؟ (افسانہ)	حضرتِ طاہر قریشی	۶۷
۱۸	دنیائے ادب		۷۳
۱۹	نئے رسالے	منصور احمد	۷۷
۲۰	انعامی مقابلہ		۷۸

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول ڈاک اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے - ممالکِ غیر سے دس شلنگ

آئینۂ عالم

سوویٹ کا شانزدہ سالہ عہدِ حکومت

روس کے سوا شاید ہی کوئی اور ملک ایسا ہو جسے دنیا نے اتنا غلط طور پر سمجھا ہو، اور سوویٹ کے سوا شاید ہی کوئی اور حکومت ایسی ہو جس سے دنیا کو اتنی پرخاش ہو۔ انقلاب نے اس ملک کے لوگوں اور یہاں کے اداروں میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے روس کو زاریت سے نجات حاصل ہو چکی ہے اور اس وقت وہاں ایک کامیاب مطلق العنان عمومیت کا دَور دَورہ ہے۔ سوویٹ عہد کو قائم ہوئے سولہ سال ہو چکے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم ان کی موجودہ حالت کا جائزہ لیں۔ اور مختلف شعبوں میں ان کے ملک نے جو ترقی کی ہے اس کی جانچ پڑتال کریں۔ موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ماسکو کے ایک ماہوار رسالے "نیز ودنی لوک" نے لکھا ہے:۔

"سولہ سال میں سے گیارہ سال سوویٹ یونین کو پُرامن طریق پر گزارنے کا موقع ملا ہے جن کے دَوران میں معاشی و تمدنی زندگی کے ہر شعبے میں روس نے نہایت سرعت سے ترقی کی ہے۔ بے علمی جو زار کے عہد کا تاریک ترین اور ذلیل ترین ورثہ تھا اس کا تقریباً اب نام و نشان مٹ چکا ہے اور تعلیم اور تمدنی زندگی کے فوائد اب معدودے چند لوگوں کا حصّہ نہیں بلکہ تمام آبادی کی دسترس میں ہیں۔ زراعت پیشہ لوگ جنہیں انتہائی غربت، جہالت اور اوہام میں مقید رکھا جاتا تھا اب جدید تہذیب اور تعلیم سے پورے طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔"

گزشتہ چند سال میں دیہاتی آبادی نے اتنی دماغی ترقی کر لی ہے کہ چھوٹے پیمانے کی انفرادی زراعت کو جدید ذرائع اور جدید کلوں کے استعمال سے بڑے پیمانے پر چلانے کی مشکل اور پیچیدہ تجاویز کو کامیاب بنانے میں بھی کچھ زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

"گزشتہ دس سال کے دَوران میں زراعت کے لئے نئی اور بیش قیمت کلیں اور پہلے کی بہ نسبت بہتر طریقے سوویٹ دیہات میں رائج کئے گئے ہیں۔ مزروعہ علاقے کا رقبہ ۱۹۲۸ء میں ۷ء۲ فیصدی تھا۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں ۸۰ فیصدی تک پہنچ گیا۔ چھوٹے پیمانے کی زراعت بڑے پیمانے کی زراعت میں بڑی سرعت سے تبدیل ہو گئی۔ اجتماعی زراعت سے کسان کو بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ نفع ہوا اور اُس کے لئے اور اس کے بال بچوں کے لئے ایک بہتر زندگی گزارنے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ اس سے زمیندار لوگ جدید زرعی کلوں اور آلات کا استعمال سیکھ گئے اور انہیں ایک بڑی جاگیر کے انتظام و انصرام کا تجربہ حاصل ہو گیا۔"

گزشتہ چند سال میں روس کی صنعت بھی نہایت تیزی سے بڑھی۔ خصوصاً پہلی پنج سالہ تجویز کے بعد جو اکتوبر ۱۹۲۸ء میں پیش کی گئی اس نے بڑی سرعت سے ترقی کی +

"بہت سی نئی صنعتیں جو انقلاب سے پہلے یہاں نام کو بھی موجود نہ تھیں جاری ہوئیں۔ ایک ہزار سے زیادہ صنعتی کارخانے تعمیر ہوئے اور چلنے لگے اور بہت سے کارخانوں کی توسیع کی گئی۔ آلاتِ زراعت کی صنعت ایک نہایت اہم صنعت تھی، جو جنگ سے پہلے روس میں موجود نہ تھی۔ جب یہ رائج ہوئی تو ۱۹۳۳ء کے پہلے دس مہینوں میں ۶۲۰۷۰ آلات تیار کئے گئے یہی حال موٹر گاڑیوں کی صنعت کا ہے۔ عہدِ زار کے آخری چھ سال میں یعنی ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک روس میں کل ساڑھے چار سو مشینیں تیار ہوئیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ۱۹۳۳ء کے پہلے دس ماہ میں ۴۰۸۶۱ موٹر کاریں اور لاریاں اس ملک میں بنائی گئیں۔ ۱۹۳۳ء کے تمام سال میں ۵۰۲۵۰ نئی قسم کے ہل اور ۲۵۰۰۰ موٹر لاریاں اور کاریں بنیں مشین سازی کی صنعت میں ترقی خاص طور قابلِ لحاظ ہے، کیونکہ سوویٹ روس کی صنعتیں اس وقت بہت بڑی حد تک، اپنے ملک کی بنی ہوئی کلوں سے چل رہی ہیں اور اسے غیر ممالک کا مرہونِ منت نہیں ہونا پڑتا"

نئے شہروں کی تعمیر اور پرانے شہروں کی تعمیرِ ثانی، توسیع اور ترقی میں روس نے بہت کام کیا ہے۔ بلدیات ایسے اصول پر چلائی جا رہی ہیں کہ جنگ سے پہلے کی طرح صرف امرا ہی متمتع نہیں ہوتے بلکہ تمام آبادی مستفید ہو سکتی ہے۔ شہروں میں اور دیہات میں ہر جگہ جہالت کو دور کرتے اور تعلیم پھیلانے کے لئے زبردست کوشش ہو رہی ہے۔

"یہ کوشش اتنی کامیاب ہوئی کہ ۱۹۳۲ء کے اختتام پر ناتعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ۶۷ فیصدی سے گھٹ کر دس فیصدی رہ گئی۔ عام اور لازمی تعلیم جو پہلے پہل ۱۹۳۱ء میں رائج کی گئی تھی اس کا نصاب چار سال کی بجائے سات سال کر دیا گیا ہے ۱۹۱۳ء میں اسی لاکھ بچوں کے مقابلے میں اب اڑھائی کروڑ بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ سوویٹ یونین کے بچوں کی تعلیم کا معیار اب دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے کسی طرح کم نہیں"

اعلیٰ تعلیم دینے والے اداروں میں طلبہ کی تعداد پانچ لاکھ سی بڑھ کر ہے، اور بیس لاکھ سے زائد طلبہ صنعتی مدارس میں پڑھ رہے ہیں"

ٹیگور اور گاندھی

مہاتما گاندھی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بہار کا زلزلہ انسان کے گناہوں پر خدا کے غصے کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے اس خیال کی مخالفت کی تھی۔ اب مہاتما گاندھی نے پھر اپنے اخبار "ہریجن" میں "وہم اور عقیدہ" کے عنوان سے ڈاکٹر ٹیگور کے اعتراض کا جواب لکھا ہے۔

"میرا عقیدہ وہ نہیں جو گرودیو (رابندر ناتھ ٹیگور) کا ہے کہ ہمارے گناہ اور بدیاں خواہ کتنے بھی بڑھ جائیں ان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ تخلیق کی عمارت کو توڑ کر اس کے کھنڈر بنا دیں۔ اس کے برعکس میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے گناہوں میں اس عمارت کو تباہ کرنے کی کسی طبعی حادثے سے زیادہ قوت ہے۔ مادے اور روح میں ایک ناقابلِ شکست اتحاد قائم ہے۔ اس اتحاد کے نتائج سے لاعلمی نے بہت سے لوگوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر مادی مصیبت کو اپنی اخلاقی پستی کا آلہ کار بنا سکیں۔

عالمِ ظہور اور انسانی اخلاق کے درمیان تعلق میرا ایمان ہے جو مجھے خدا سے نزدیک تر کر دیتا ہے۔ مجھے انکسار سکھاتا ہے اور مجھے اس کے روبرو ہوتے کیلئے زیادہ تیار کر دیتا ہے۔ ایسا عقیدہ ایک ذلت آمیز وہم ہوتا اگر میں اپنی جہالت کی وجہ سے اسے اپنے مخالفین کی تعذیر کے لئے وقف سمجھتا۔

عورتوں کی تعلیم

الہ آباد دھیلا ودیالہ میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:- "بعض اوقات کہا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ودیا پیٹھ بھی اسی پر زور دیتا ہے کہ عورتوں کی تعلیم مردوں سے الگ ہونی چاہئے۔ اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ یہ عورتوں کو خانہ داری کے فرائض اور شادی کی ضروریات کے لئے تیار کرے۔ افسوس ہے کہ میں نسوانی تعلیم کے اس محدود اور یکرخی نقطۂ نظر سے اتفاق کرنے سے قاصر ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ عورتوں کو انسانی سرگرمیوں کے ہر پہلو کی بہترین تعلیم حاصل ہونی چاہیئے اور ان کی تربیت ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ ہر میدانِ عمل میں نہایت مؤثر طور پر کام کر سکیں۔ اور اس سے پہلے کہ عورتوں کو کوئی آزادی ملے انہیں محض شادی کو اپنی اقتصادی پناہ سمجھتے رہنے کی عادت خصوصاً ترک کرنی پڑے گی۔

نئے دل اور جگر

کہا جاتا ہے کہ روس کے ڈاکٹروں نے ایک مصنوعی دل ایجاد کیا ہے جو ایک مریض کے سینے میں اس وقت تک پوری کامیابی سے کام کرتا رہا جب تک وہ اس کے بیمار دل کو نکال کر اس کا علاج کرتے رہے۔ اگر یہ سچ ہے اور آج کل کے زمانے میں شک کرنے کی جرات کیسے ہو سکتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور نئے دور کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

یہ خیال تو مدت سے پیدا ہو چکا ہے کہ بیمار ہونے اور پھر دوبارہ اچھا ہونے کا صبر آزما انتظار ایک خوفناک تضییعِ اوقات ہے جس کو اب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ طریقہ ضرور بدل کر رہے گا۔

دل کے بعد دوسرے مصنوعی اعضا کی ساخت مثلاً معمولی قوت کے دماغ کی تعمیر ہمارے خیال میں کچھ زیادہ مشکل کام نہیں

اگر تمام اعضا مصنوعی طور پر بننے شروع ہوئے تو ہمارے شفاخانوں کا انتظام عجیب وغریب ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے اشتہارات میں بھی خاص تبدیلی واقع ہوگی۔ مثلاً

جسم کی دیکھ بھال کا خاص شفاخانہ!

ہر قسم کے اعضا ہمارے ہاں ملتے ہیں!

ہم سے اپنے مریضِ دل کا علاج کرائیے۔ محبّت میں پچاس فیصدی اضافے کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔

اور اسی پر خاتمہ نہیں ہوگا۔ طبی کاریگر بڑھی فطرت کی غلطیاں بھی نکالیں گے۔ مریض کہا کریں گے "دیکھئے ڈاکٹر صاحب میرا یہ پُرانا معدہ ٹھیک کام نہیں کرتا، اور جو اگلے دِن آپ نے لگایا تھا وہ تو بہت ہی اچھّا چلتا تھا۔ اور پُرخوری کو روکنے کی نئی ایجاد تو غضب ہے" بعض اپنے مریض دوستوں سے کہا کریں گے "بھئی میں نے تو زیاں کارا ینڈ کمپنی سے پچھلے ہفتے نیا جگر لگوا لیا ہے۔ بے تکان چلتا ہے"

شادی کیونکر کامیاب ہوسکتی ہے؟

جوزف سبت جو شگاگو میں جج ہیں اور اس عہدے پر اب اُن کو چوبیسواں سال شروع ہوا ہے ازدواجی معاملات کے تجربے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ چالیس ہزار ازدواجی مناقشات ان کی نظر سے گزرے ہیں، اور ان کی کوشش سے دو ہزار ایسے جوڑے جو سمجھتے تھے کہ اب جُدا ہوئے بغیر ان کے لئے چارہ نہیں یکجا رہنے پر رضامند ہوگئے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ازدواجی معاملات پر کچھ کہنے کا وہ بہت زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ شادیوں کی ناکامی کی تہ میں عموماً نہایت ہی چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں۔

بہت سے لوگ ہیں جو صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے کے متمنی ہیں۔ جج سبت نے اپنے وسیع ذخیرۂ علم میں سے شادی کی کامیابی کے لئے مندرجہ ذیل سادہ اور آسان طریقِ عمل وضع کیا ہے

۱۔ آپس میں تحمل سے پیش آؤ۔

۲۔ اِکٹھے کام کرو، اِکٹھے کھیلو اور اِکٹھے پھیلو بڑھو۔

۳۔ لڑائی جھگڑے میں کبھی جوش کے ساتھ گفتگو نہ کرو۔

۴۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مت چھپاؤ۔ مبادا وہ جمع ہو کر تعلقات ہی کو منقطع کردیں۔ نہایت سکون کے ساتھ اُن پر بحث کرو۔

۵ ۔ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف رہو ۔
۶ ۔ ہمدردی اور ایک دوسرے کو سمجھ لینا خانگی مسرت کے لازمات ہیں ۔
۷ ۔ صبح خندہ پیشانی کے ساتھ جدا ہونا اور شام کو خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کا استقبال کرنا تمہارا معمول ہونا چاہیئے ۔
۸ ۔ ذمہ داریوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاؤ ۔
۹ ۔ ایک اپنا گھر بناؤ ۔
۱۰ ۔ رات کو سوتے وقت اپنے دن بھر کے اعمال پر ایک نظر کرو ۔ اور دل کے آئینے کو کبھی مکدر نہ رہنے دو ۔

کتنے آسان اور کتنے معقول ہیں یہ اُصول ۔ شادی ایک ایسی عادت ہے جس کی پیہم اصلاح ہوتی رہنی چاہیئے ۔ اسے آزمائش میں ڈالنا اس امر کا اقرار کرنا ہے کہ غالباً یہ ناکام رہے گی حالانکہ کہنا یہ ہے کہ ضرور کامیاب ہوگی ۔

امریکا اور مسئلۂ بیکاری کا حل

محکمۂ بندوبستِ امورِ ملکی نے جو وفاقی خزانے میں سے امریکا کے چالیس لاکھ بیکاروں کے لئے کام بہم پہنچانے کے سلسلے میں طرح طرح کی کوششیں کر رہا ہے ۔ حال ہی میں دو اور نہایت عجیب تجویزیں پیش کی ہیں ۔

ان میں سے پہلی یہ ہے کہ بیکاروں میں سے ایکٹر بھرتی کئے جائیں اور ایسے تھیٹر کھولے جائیں جہاں لوگوں کو مفت تماشا دکھایا جائے ۔ نیویارک کے شہر میں ڈیڑھ سو ایکٹروں کی ضرورت کا اعلان کیا گیا ، اور سات سو سے زائد درخواستیں موصول ہوئیں ۔ ان تھیئٹروں میں وہ پرانے کھیل پیش کئے جائیں گے جو مقبول ہو چکے ہیں اور جن کے معاوضے سے ان کے مصنفین نے دست برداری دے دی ہے ۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ غربا کے دو سال سے چار سال تک کے ایک ہزار بچوں کو جمع کر کے ان کے لئے مدارسِ اطفال کا افتتاح کیا جائے اور ان مدارس کے اخراجات وفاقی حکومت برداشت کرے ۔ بچوں کو گرم کپڑے بہم پہنچائے جائیں ۔ اچھا کھانا دیا جائے اور شام کو انہیں ان کے گھر واپس بھجوا دیا جائے ۔ اس طرح بھی بیکار استادوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو کام مل جائے گا ۔

منصور احمد

درشن پیاسی

پریتم ! مکھ دکھلا

مجھ سے تو کیوں روٹھ گیا

میرا دوش بتا

پریتم ! مکھ دکھلا

میری جاں نینوں میں آئی

اور نہ اب ترڑپا

پریتم ! مکھ دکھلا

میں ہوں تیری، تیری ہوں میں

تو میرا ہو جا

پریتم ! مکھ دکھلا

امر چند قیس جالندھری

تیجن کے گیت

دیہاتی گیتوں کے سلسلے میں تیجن کے گیتوں کی قسط پیش ہے۔ یہ گیت پونے دوسو کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں سے بہت سے گیت تو اس لئے انتخاب میں نہیں آسکتے کہ وہ دیہاتی زندگی کے جن پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں وہ بہت حد تک مقامی ہیں۔ اگرچہ وہ دیہات کی سادگی، مفلسی اور بیکسی کی دردناک تصویریں ہیں اور اصل ہندوستان کے صحیح ترجمان، لیکن اس وقت یہ مقصد پیشِ نظر نہیں ہے۔ بعض گیت ایسے ہیں جو علمی مذاق کے لوگوں کی طبیعت پر بار ثابت ہونگے، اور بہت سے گیت ان میں ایسے ہیں جو بدرجۂ غایت شرنگار رس میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کسی قدر عریانی لئے ہوئے ہیں۔ عورتوں کی مجلس میں اگرچہ وہ بے تکلف گائے جاتے ہیں لیکن انہیں اس حد سے باہر نکالنا اُن پر بھی اور قارئین کرام پر بھی ظلم کرنا ہے۔ اس کے بعد جو گیت رہ جاتے ہیں تمام وکمال وہ بھی پیش نہیں کئے جاسکتے کہ ان کے لئے ایک طویل فرصت اور مستقل دفتر درکار ہے بہرکیف ان میں سے چند گیت پیش کرتا ہوں۔

ایک طویل گیت جو ہر تیجن میں گایا جاتا ہے اپنی نوعیت میں نہایت دلچسپ اور بدرجۂ غایت دلآویز ہے۔ پورا گیت لکھ کر اس کا مفہوم بیان کردینے کی جگہ یہ مناسب ہے کہ اس کے ٹکڑے کر لئے جائیں۔ سُنیئے

سہاگن:۔ سات جنی، سات اینڈھوے، سُن ساس رانی ری — ساتوں وہ چلی پانی بھرنے، سُن ساس رانی ری

چھ جنیں تو بھر چکیں، سن ساس رانی ری — مجھ سے بھرا نہ جائے، سُن ساس رانی ری

لج چھوٹی اور جگت بڑی، سُن ساس رانی ری

ساس:۔ لج بٹوادوں ریشمی، سُن میری بہو رانی — گڑوی بھی لادوں مول، سُن میری بہو رانی

ایک سہاگن اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے جاتی ہے۔ خاوند پردیس میں ہے۔ اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ چھ تو بھر بھرا کر چلدیں یہ وہیں ٹال مٹول کرتی رہی۔ ساس آئی تو عذر کیا کہ لج چھوٹی ہے۔ پانی بھرا نہیں جاتا۔ ساس گڑوی ڈوری نئی لادیتی ہے۔ اب وہ اکیلی پانی بھرتی ہے۔

سہاگن:۔ جیسے تیسے بھر لیا اب گھڑا اُٹھایا نہ جائے — کنوئیں کے نیچے راہ چلے، چلا مسافر آئے

مڑکے گھڑا اُٹھوا جی سُن جیرے والے

مسافر:- میں تیرا گھڑا اُٹھواؤں سُن گھونگھٹ والی — مجھے دو گھونٹ پلا ری سُن گھونگھٹ والی

سہاگن:- میرا تو پانی بس بھرا سُن چیرے والے — پینے والا مرجائے سُن چیرے والے

مسافر:- جو پانی تیرا بس بھرا سُن گھونگھٹ والی — گھر والوں کا کیا حال ری سُن گھونگھٹ والی

سہاگن:- میرے تو گھر والے گارڈو سن چیرے والے — پیوینگے لہر اُتار جی سُن چیرے والے

جیسے کیسے گھڑا بھرا۔ اب اُٹھوانے والا کوئی نہیں۔ سہیلیاں مل کر جاتی ہیں تو ایک دوسری کو گھڑے اُٹھوا دیتی ہیں۔ یہ اکیلی انتظار میں ہے کہ کوئی پانی بھرنے آئے تو گھڑا اُٹھوائے۔ پاس ہی رستہ ہے اس پر ایک مسافر جا رہا ہے۔ اُسے آواز دیتی ہے کہ چیرے (رنگین پگڑی) والے ذرا گھڑا اُٹھوا دینا۔ اور اُسے اجنبی سمجھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیتی ہے۔ مسافر دراصل اسی کا خاوند ہے جو بہت مدت بعد پردیس سے آیا ہے۔ لیکن گھونگھٹ میں سے یہ اُسے نہ اچھی طرح دیکھ سکتی ہے نہ پہچانتی ہے۔ خاوند پہچان لیتا ہے۔ اُسے مخول کی سوجھتی ہے۔ کہتا ہے گھڑا اُٹھوانے کی اُجرت میں دو گھونٹ پانی پلادے (واضح رہے کہ دیہاتی فضا میں محبت کے اکثر رومانوں کی ابتدا پنگھٹ سے ہوتی ہے) تو گھڑا اُٹھوا دوں۔ عورت اس بے تکلفی پر اپنے خاوند کو یاد کرکے رہ جاتی ہے، اور سوچتی ہے کہ جسے یہ کہنے کا حق تھا وہ تو پردیس چلا گیا۔ گویا میرے پانی میں بس بھرا ہے کہ اُس نے کچھ دن میرے ہاتھ کا پانی نہ پیا اور پھر خیال کی اُسی رو میں مسافر سے کہتی ہے کہ میرا پانی تو بس بھرا ہے، کیسے پلاؤں؟ شوہر پوچھتا ہے، بس بھرا پانی تیرے گھر والے کیسے پیتے ہونگے؟ اب سہاگن کو احساس ہوتا ہے کہ مَیں نے تو اَن کہنی کہہ دی۔ پھر فوراً بات بناتی ہے کہ میرے گھر والے تو گارڈو (منتروں سے سانپ کا زہر زائل کرنے والے) ہیں، بس کی لہر اُتار کر پی لیتے ہیں (یہاں لہر کا استعمال کتنا برمحل ہے) اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل جاتا ہے۔

مسافر:- اوروں کی شالیں اُجلی ہیں سُن گھونگٹ والی — تیرا کیوں میلا بھیس سُن گھونگٹ والی

سہاگن:- اوروں کے بالم گھر رہے سُن چیرے والے — میرا گیا پردیس سُن چیرے والے

مسافر:- جو تیرا بالم گھر نہیں سُن گھونگٹ والی — ہولے نہ میرے ساتھ سُن گھونگٹ والی

سہاگن:- جس بالم کی مَیں گوری سُن چیرے والے — چھوئے نہ تیرا ہاتھ سُن چیرے والے

بات کا پہلو بدل کر شوہر کہتا ہے کہ اور عورتوں کی شالیں اُجلی ہیں تیرا میلا بھیس کیوں ہے۔ سہاگن کہتی ہے، سب کے بالم گھر پر ہیں، وہ ان کے لئے سنگار کرتی ہیں۔ مَیں کسے اوڑھ پہن کر دکھاؤں، دیکھنے والا پردیس میں ہے۔ شوہر یہ سُن کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن مزید آزمائش کے لئے کہتا ہے کہ اگر یہ بات ہے تو جس نے تیرا ساتھ چھوڑ دیا تو بھی اس کا خیال چھوڑ دے اور آ میرے ساتھ ہولے۔ پتی برتا سہاگن یہ سُن کر بیتاب ہو جاتی ہے اور کہتی ہے جس بالم کی میں گوری ہوں وہ تو تیرے جیسوں کے

ساتھ چھونا بھی پسند نہ کرے۔ یہاں سے ٹریجڈی شروع ہوجاتی ہے۔ خاوند یہ سن کر ناراض ہوجاتا ہے۔ گھر نہیں آتا۔ واپس لوٹ جاتا ہے۔ سہاگن جیسے کیسے گھڑا اُٹھا کر گھر پہنچتی ہے۔ گیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے یہ گیت موزوں کیا ہے وہ موسیقی کا مذاق رکھنے کے ساتھ ساتھ فنِ شعر سے بھی واقف ہے۔ بھیس کا قافیہ پر دیس، ساتھ کا قافیہ ہاتھ صاف بتا رہا ہے کہ یہ گیت موزوں ہونے کے علاوہ مقفّیٰ بھی تھا۔ لیکن بے پڑھی اور مقتضیاتِ شعر سے ناواقف عورتوں کے ہاتھ پڑ جانے سے گیت کی یہ خوبی زائل ہوگئی اور قوافی نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ موقع پر جس گانے والی نے جو لفظ چاہا جڑ لیا، اور اس طرح یہ گیت مصرعوں کی ہم آہنگی کھو بیٹھا۔ خیر اب آگے کیا ہوتا ہے۔ سے

گھر آئی کو ساس پوچھے سن میری بہو رانی	کہاں لگادی دیر سن میری بہو رانی
سہاگن:۔ جھگڑے میں ہوگئی دیر سن ساس رانی ری	ایک مسافر لڑ پڑا سن ساس رانی ری
ساس:۔ کیسے تھے اُس کے کپڑے سن میری بہو رانی	کیسی تھی اُس کی چال سن میری بہو رانی
سہاگن:۔ دھوبی کے دھوئے کپڑے سن ساس رانی ری	جیٹھ بڑے کی چال سن ساس رانی ری
ساس:۔ وہی تو تیرا بالما سن میری بہو رانی	کس کے نہ پکڑی بانہہ سن میری بہو رانی

ساس نے دیر کا سبب پوچھا۔ بہو نے کہا ایک مسافر جھگڑ پڑا۔ ساس سوچتی ہے کہ راہ چلتا مسافر کیوں جھگڑتا پھر بہو سے پوچھتی ہے۔ وہ کیسا تھا؟ اس کی چال کیسی تھی؟ بہو بتاتی ہے۔ اُجلے کپڑے تھے اور بڑے جیٹھ کی سی چال تھی۔ ساس کہتی ہے نادان اُسے پکڑ کیوں نہ لائی۔ وہی تو تیرا بالم تھا۔ جانے کیوں دیا۔ اب بہو کا حال سنئے۔ سے

گلے میں ڈالوں جھولی میں سن ساس رانی ری	دیس پھراؤں ڈھنڈورہ سن ساس رانی ری
پیروں میں پڑگئے چھالے سن ساس رانی ری	نینوں سے برسا نیر سن ساس رانی ری
دیس ڈھنڈورہ دے پھری سن ساس رانی ری	کہیں نہ پائی بھال سن ساس رانی ری

سہاگن یہ سن کر بیتاب ہوجاتی ہے۔ جوگن بن کر اُسے ڈھونڈنے نکلتی ہے۔ پاؤں میں چھالے پڑجاتے ہیں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ چاروں کونٹ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ مگر پنگھٹ کا بچھڑا بالم نہیں ملتا۔ واپس آکر ساس کے آگے دکھڑا روتی ہے۔

ایک گیت میں ایک جھور سہاگن کے اوہام آمیز لیکن نہایت دلچسپ اور بلیغ خواب کا بیان ہے۔ سُنیئے۔!

جلے سپنے کی کیا کہوں ری، میرے راجا کا دوجا بیاہ

کونسی کو راجا منڈھا بندھیگا کب چڑھیگی برات	تیجی کو گوری منڈھا بندھیگا، چوتھی کو چڑھیگی برات

جلے سُپنے کی کیا کہوں ری، میرے راجا کا دوجا بیاہ

کون کوٹے تری زیری جی راجا، کون دلے تیری دال بھاوج تو کوٹیگی زیری گوری، نائن دلے کی دال

جلے سُپنے کی کیا کہوں ری، میرے راجا کا دوجا بیاہ

کون گائے گا راجہ گھوڑیاں اور کون چڑھیگا برات بہنیں تو گائیں میری گھوڑیاں گوری بھائی بھتیجے برات

جلے سُپنے کی کیا کہوں ری، میرے راجا کا دوجا بیاہ

سوکن آئی میں سُنی جی مجھے چڑھ گیا ہل ہل تاپ سوکن دیکھن میں چلی جی راجا کھوٹا رُپیہ ہات

جلے سُپنے کی کیا کہوں ری، میرے راجا کا دوجا بیاہ

سوکن مرگئی میں سُنی جی راجا اُترا میرا تاپ جلے سُپنے کی کیا کہوں ری، میرے راجا کا دوجا بیاہ

سہیلیاں تیجن میں جمع ہیں۔ چرخے چل رہے ہیں۔ ایک مہجور سہاگن سکھیوں سے رات کا خواب بیان کرتی ہے کہ جلے سُپنے کی کیا کہوں۔ میں نے دیکھا گویا میرے شوہر کا دوسرا بیاہ ہو رہا ہے۔ خاوند مدّت سے پردیس میں ہے۔ اُس کے وہاں رُک جانے کے امکانات پر غور کرتی ہے تو یہ بات زیادہ جچتی ہے کہ ہو نہ ہو دوسرا بیاہ کر لیا ہے۔ جبھی تو گھر بار یاد نہیں آتا۔ یہ تصوّر شدید ہو کر وہم بن جاتا ہے اور پھر اسی قسم کے خواب دیکھتی ہے۔ کسی نے عورت کے جذباتِ رقابت و فراق کی کتنی اچھی تحلیل کی ہے کہ منڈھا کب بندھیگا۔ برات کب چڑھیگی۔ خاوند کہتا ہے تیسری کا منڈھا ہے چوتھی کی برات۔ اب عورت اپنی شکر رنجی کا اظہار کرتی ہے اور طنزاً کہتی ہے کہ بیاہ کا کام کون کریگا۔ زیری (ایک نفیس قسم کے دھان) کون کوٹیگا۔ دال کون دلیگا؟ مَیں تو کرنے سے رہی۔ شوہر کہتا ہے، بھاوج اور نائن موجود ہیں۔ پھر عورت پوچھتی ہے گھوڑیاں (دولہا کے گھوڑی چڑھتے وقت کے گیت) کون گائیگا۔ برات میں کون جائیگا۔ خاوند کہتا ہے، میری بہنیں گائیں گی۔ بھائی بھتیجے برات میں جائیں گے۔ اب بیاہ ہوتا ہے۔ سوکن آجاتی ہے تو عورت کو بخار چڑھ آتا ہے لیکن شوہر کا پاسِ خاطر منظور ہے تمام رسوم میں شریک ہوتی ہے۔ اور جب گھر کی تمام عورتیں نئی دلہن کو "منہ دکھائی" دیتی ہیں تو یہ بھی جاتی ہے لیکن دل میں کھوٹ ہے۔ کھوٹا روپیہ منہ دکھائی میں دیتی ہے۔ اس کے بعد سُنتی ہے کہ سوکن مرگئی ہے، اور خوشی کے مارے آنکھ کھل جاتی ہے۔ اپنی محبت کی شکست کا یقین نہیں آتا۔ اس لئے سوکن کی موت پر گیت ختم ہے۔

ایک گیت اور سُنیئے ؎

آموں کی ٹھنڈی چھاؤں ری، آموں کے نیچے کیوں کھڑی

ماں جائے تیرے ہیں دُور، کیا تیرے گھر ساس بُری

چُپ چاپ چلا جا تجھے کیا پڑی　　میرے میّا جائے دُور نہ گھر ساس بُری
اُڑ جارے کالے کاگ بُرے تیری چونچ بُری　　پیا گئے پردیس مرے میں شگن بچارتی

آموں کی ٹھنڈی چھاؤں ری، آموں کے نیچے یُوں کھڑی

جمنا کے پرلے پار بسیں دو گوجری　　گوری گوری سی گاگری ری
آن بسیں اُس میں وہی جیسا تی　　پیا گئے پردیس مرے میں شگون بچارتی

آموں کی ٹھنڈی چھاؤں ری، آموں کے نیچے یُوں کھڑی

خاوند پردیس میں ہے منتظر سہاگن رستہ دیکھتی ہے اور بیقرار ہو کر گاؤں سے باہر نکل آتی ہے۔ ایک مسافر گذرتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ اے بھاگوان یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہے؟ کیا میکے جارہی ہے؟ گاؤں دُور ہے تھک کر آرام لینے کے لئے ٹھہری ہے؟ یا ساس جھگڑالو ہے اُس سے روٹھ کر یہاں آنکلی ہے؟ سہاگن کہتی ہے۔ جا اپنی راہ لگ۔ تجھے کیا۔ نہ میرا میکہ دُور ہے نہ ساس بُری ہے۔ پھر دل کی بات منہ پر آجاتی ہے اور کہتی ہے۔ پیا پردیس میں ہے، اس کی راہ تکتی ہوں۔ کوا منڈیر پر بولتا ہے تو میں کہتی ہوں اُڑ جا اور شگون لیتی ہوں کہ آج پیا آئے گا لیکن نہیں آتا۔ کوری مٹکی میں دہی جما کر شگون لیتی ہوں کہ آج بالم آئیگا، لیکن نہیں آتا۔ آخر گھبرا کر بستی سے نکل آتی ہوں اور بالم کا رستہ دیکھتی ہوں۔

ہمارے اُردو کے شاعر جو ایران کے صوفی شعرا کی اندھی تقلید میں حقیقت و مجاز کی گتھیاں سلجھاتے ہیں کیا ان کے کلام میں اس معیاری محبت کی ایسی دلگداز تصویریں مل سکتی ہیں؟ انصاف کیجئے، کبھی ہمارے شاعروں نے اپنی جاندار لیکن بیمار معاشرت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھا ہے؟ کہاں ہیں ہندوستان کے شاعر! کہ ان کے یہ موتی جن میں محبت کی آب ہے ان کی بے پروائی سے خاک میں ملے جاتے ہیں۔ حقیقی ہندوستانی شاعری کی رُوح افسردہ ہو رہی ہے اور وہ تقلید کی دھن میں اتنے مست ہیں کہ ہمارے حقیقی جذباتِ محبت کی لطافت اور ہندوستانی ادب کی جان مٹتی جارہی ہے۔ ادب اگر کسی قوم کی رُوح ہے تو بتایا جائے کہ اُردو کے شاعر اس مقولے کی روشنی میں کونسا ادب دُنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، جو اُن کی قومی رُوح کا آئینہ دار ہو؟

ایک گیت سنئے! بچپن میں بیاہ ہو جاتا ہے۔ شوہر پردیس نکل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے سہاگن جوان ہوتی ہے۔ ساس سوتیلی ہے وہ نہ اچھا کھلاتی ہے نہ اچھا پہناتی ہے۔ بُرے حالوں رکھتی ہے۔ کسی آنے جانے والے کی زبانی معلوم ہوا کہ پردیسی مسافر فلاں دن کو آرہا ہے۔ سوتیلی ساس اُس روز غیر معمولی سلوک کرتی ہے۔ بہو پوچھتی ہے کہ آج یہ کیا؟ ساس کہتی ہے آج تیرا شوہر آرہا ہے۔ سہاگن خوش ہوتی ہے، لیکن بد باطن ساس جسے نہ سوتیلا لڑکا بھاتا ہے نہ بہو کھانے میں زہر ملا دیتی ہے۔

بہو:- اور دنوں تو سوکھی سی ٹکیا آج کیوں دی ساس کھیر کی تھالی ری

ساس:- پہلے تو بہو تیری کٹی اکیلے آج گھر آئے تیرا بالم ری

بہو:- اور دنوں تو کھٹی سی لسّی ساس آج کیوں دیا دودھ کٹورا ری

ساس:- پہلے تو بہو تھی میری ، پائی اب ہوئی تو کسی جوگی لدی

بہو:- اور دنوں تو ٹوٹی سی کھٹیا آج دیا ساس لال پلنگ ری

آہ! معصوم بہو کو کیا خبر تھی کہ یہ ناگن کیا کر رہی ہے ۔ کھیر کھا کر دودھ پی کر لیٹ جاتی ہے ۔ اب اُس کا خاوند گھر آتا ہے اور کچھ دیر بعد اُس ڈائن ماں سے پوچھتا ہے ۔

لڑکا:- اماں بھی دیکھی بہنیں بھی دیکھیں ایک نہ دیکھی میں نے سجنوں کی دھی ری

سوتیلی ماں:- اونچی اٹاری لال کواڑی وہاں چڑھ سوئی سجنوں کی دھی ری

لڑکا وہاں جاتا ہے ۔ دیکھتا ہے دلہن سنگارے پلنگ پر سو رہی ہے ۔ بُلاتا ہے ، ہلاتا ہے ، چھڑی سے ٹھوکتا ہے ، لیکن وہاں کیا دھرا تھا ۔ آہ کتنی دلگداز تصویر ہے سوتیلی ماؤں کے سلوک کی ۔ اس گیت میں دیکھئے سوتیلی ماؤں کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی روحیں کس موثر انداز میں فریاد کرتی ہیں ۔ کوئی ہے اس فریاد کو سُننے والا ۔ !

لڑکا واپس آکر ماں سے کہتا ہے ؎

مَیں نے پکارا ، بانہہ بھی ہلائی ، پھر بھی نہ بولی سجنوں کی دھی ری

بولتی کس طرح ۔ اُسے تو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا تھا ۔ ساس نے اپنے ظلم چھپانے کے لیے تو اُس معصوم کی جان لی ۔ لیکن زندگی سے زیادہ اس کی موت نے اس کے ظلم کا راز افشا کیا ۔ آہ ! سوتیلی مائیں !!

ایک گیت اور ؎

چندا کی چاندنی رات ، آنگن میں میرے کون کھڑا ، میری جان گھٹ گئی ری

سُن کے اتنی سی بات ، نند مری ترا بیر کھڑا ، میری جان گھٹ گئی ری

سُن کے اتنی سی بات ، سیّاں نے گھوڑا پیڑ لیا ، میری جان گھٹ گئی ری

ہے کوئی چتر سرگیان ، سیّاں کو موڑ لے ، میری جان گھٹ گئی ری

میرا دیور چتر سرگیان ، سیّاں کا گھوڑا موڑ ، میری جان گھٹ گئی ری

چاندنی رات میں سہاگن آنگن میں نکلتی ہے ۔ وہاں کسی کو کھڑا دیکھ کر کہتی ہے کہ میری جان گھٹ گئی ۔ اب وہ سنتی ہے

کہ یہ تو بالم ہیں اور پردیس جانے کو تنگ کس رہے ہیں تو زیادہ بیتاب ہوتی ہے اور شوہر کی محبّت سے مجبور ہو کر کہتی ہے کہ کوئی گھر میں اتنا چتر اور عقلمند ہے کہ انہیں پردیس جانے سے روکے۔ آخر دیور کو سمجھتی ہے کہ یہ روک سکیگا، اور اُس سے جا کر کہتی ہے۔

ایک آخری گیت اور سنیئے۔ تہذیبِ نَو کا اثر جھونپڑیوں تک بھی پہنچا، لیکن دیہاتیوں نے اس سے محفوظ رہنا چاہا۔ یہ گیت بیباکی کے باوجود دیکھیے سبق آموز بھی ہے۔ ایک سہاگن چرخہ کات رہی ہے۔ ایک بنا سنورا نوجوان سامنے سے گزرتا ہے۔ عورت متاثر ہوتی ہے اور پھر اُس مقدس ساز پر اپنا گیت چھیڑتی ہے جسے چرخہ کہتے ہیں ؎

عورت:۔ اب کے لڑکے بلبل رکھیں، رکھیں تیل رچائے ری
کل جگ آیا، بُرا زمانہ! رکھیو من سمجھائے ری
اب کے لڑکے جوتے پہنیں، چلتے ٹھوکر مار کے
کل جگ آیا، بُرا زمانہ! رکھیو من کو مار کے

نوجوان:۔ اب کی بہویں ملیں دنداسہ، رکھیں گھونگٹ کھول جی
کل جگ آیا، بُرا زمانہ! من کا ہے کیا مول جی
اب کی بہویں سرمہ ساریں، چلیں مٹکے مار کے
کل جگ آیا، بُرا زمانہ! رکھیو من کو مار کے

بلبل اُن بالوں کو کہتے ہیں جو پیشانی پر پڑے رہیں۔ انگریزی وضع کے بالوں کو بھی دیہاتی بلبل کہتے ہیں۔ باقی گیت کا مطلب صاف ہے۔

وقار (انبالوی)
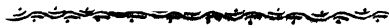
"ہاں جناب، تو دس برس کے بعد جا کر مجھے معلوم ہؤا کہ ادبیات سے مجھے دُور کی بھی نسبت نہیں، اور میں قطعاً نہیں لکھ سکتا۔"

"پھر تم نے لکھنا چھوڑ دیا؟"

"نہیں! اُس وقت تک میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔"

رضیہ کی جوان موت پر

جواں مرگ رضیہ میرے ماموں کے منجھلے بیٹے کی بیوی تھیں جو دو سال کی ایک ننھی سی بچی چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یوں تو سب اُن کے اخلاق کے معترف تھے مگر مجھ سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ اُن کی صورت و سیرت کا گہرا نقش میرے دل سے کبھی نہ مٹے گا اور ان کی موت سے زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے زمانہ اُسے کبھی پُر نہ کر سکیگا۔

کیا خزاں لے آئی اے فصلِ بہاری ہائے ہائے
کیسا ماتم ہو گیا گلشن پہ طاری ہائے ہائے

آنسوؤں کی نہر آنکھوں سے رواں ہی سر بسر
آہ اے میرے چمن کی آبیاری ہائے ہائے

یاد تیری اشکِ خوں برسوں ہمیں رُلوائے گی
تُو نے آنکھوں کو سکھا دی لالہ کاری ہائے ہائے

مرگ گلچیں توڑنے پر پھُول ضِد کرنے لگا
کام غنچے کی نہ آئی آہ و زاری ہائے ہائے

اب نہ کھائیں گے مسرّت کا جوانی کا فریب
تُو نے پھیلا دی ہے وہ بے اعتباری ہائے ہائے

خوبصورت انکھڑیاں اب تیری کھلتیں ہی نہیں
چھین لی ہے کس نے اِن کی سحر کاری ہائے ہائے

آنکھ تو کھولو نگہ تو اک کرو بہرِ خُدا
کیوں ہو صیدِ جادوئے بے اختیاری ہائے ہائے

کیوں نہیں دیتیں عزیزوں کی صداؤں کا جواب
مار ڈالے گی یہ خاموشی تمہاری ہائے ہائے

آج کیوں مجھ کو نہیں کہتی ہو تم۔ آپا سلام
سرمدی خاموشیاں ہیں لب پہ طاری ہائے ہائے

حسبِ عادت کیوں گلے ملنے کو آج اُٹھیں نہیں
یہ رکھاوٹ تھی نہ فطرت میں تمہاری ہائے ہائے

پھُول سا چہرہ تمہارا اب نہ آئے گا نظر
خاک میں ملجائیگی صورت یہ پیاری ہائے ہائے

نو دمیدہ پھُول کو دو دن نہ مہماں رکھ سکا
ہائے باغِ کُن تری بے اختیاری ہائے ہائے

انجمن تاریک شمعِ انجمن خاموش ہے
ظلمتِ غم کونے کونے پر ہے طاری ہائے ہائے

سرنگوں ہے آسماں انجامِ ہستی دیکھ کر
چھا رہا ہے ابرِ نا اُمیدواری ہائے ہائے

تو بگڑنے کو سجی تھی تُو اُجڑنے کو لگی!
محفلِ ہستی تری ناپائداری ہائے ہائے

(ح۔ ب)

رقعاتِ غالب پر ایک نظر

عودِ ہندی اور اُردوئے معلّٰی میں مرزا غالب کے بہت سے خطوط ہیں ان دونوں کی اہمیت اردو علم ادب میں مسلّم ہے چنانچہ ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی کتاب یا ان میں سے کسی ایک کا کم و بیش حصہ اُردو کے کسی نہ کسی امتحان میں شامل ضرور ہے۔ اسی سبب سے ہر دو نسخوں کی اشاعت بھی اچھی خاصی ہوئی ہے۔ میرے خیال سے میرٹھ، دہلی، کلکتہ، کانپور، لکھنؤ، آگرہ، الٰہ آباد اور لاہور سے عودِ ہندی و اردوئے معلّٰی دونوں کے نسخے تقریباً پچیس ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں۔

بلا شبہ یہ تعداد حوصلہ افزا ہے اور اس سے غالب کے رقعات کی قدر و قیمت کا بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے مگر کمال افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عودِ ہندی و اُردوئے معلّٰی کے ابتدائی ایڈیشنوں میں جو غلطیاں اور خامیاں ہیں اُن کو درست کرنے کی کوشش ابھی تک نہیں ہوئی اور اب عمیق مطالعہ اور نگاہِ متجسس سے دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جو خرابیاں پہلے تھیں ان سے کہیں زیادہ عجیب و غریب اغلاط و اسقام دونوں کے کسی نہ کسی ایڈیشن میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

(۱)

مرزا غالب کا ایک خط عودِ ہندی میں بنام جناب مرزا رحیم بیگ صاحب میرٹھی ہے اسی کا نام "نامۂ غالب" ہے چنانچہ نامۂ غالب میں ایک عبارت یوں ہونی چاہیئے :۔

"نہ آپ شیرازی نہ اُستادِ اصفہانی"

مگر عودِ ہندی کے تمام ایڈیشنوں میں عبارت یوں ہے :۔

"نہ آپ شیرازی نہ اُستاد رمضانی"

چنانچہ عود کے مختلف نسخے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں :۔

(۱) ایڈیشن اوّل مطبع مجتبائی میرٹھ سنہ ۱۸۶۸ء صفحہ ۱۴۴ س ۱۴ (۲) مطبع نارائنی دہلی سنہ ۱۸۷۸ء صفحہ ۱۴۴ س ۱۴

(۳) مطبع مفید عام آگرہ سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۳۸ س ۸ (۴) مطبع منشی نولکشور کانپور سنہ ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۳۸ س ۷ و ۸

(۴) مطبع کریمی لاہور سنہ ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۴۱ س ۴ (۵) نیشنل پریس الٰہ آباد سنہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۳۵ س ۱۷

(۷) مطبع انوارِ احمدی الٰہ آباد (دفعہ اوّل) صفحہ ۱۸۶ س ۱۷

ہاں یہ بھی واضح رہے کہ ان کے سوا دیگر نسخوں میں بھی یقیناً "رمضانی" لکھا ہی ملے گا۔

(۲)

اُردوئے معلّیٰ میں جناب نواب میر غلام باباخاں صاحب کے نام جو دسواں خط ہے اس کی تاریخ مندرج ہے:-

"یکشنبہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۰ء"

چنانچہ کم از کم ذیل کے نسخے ملاحظہ کیجئے:-

(۱) اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۹ء صـ۱۳ـ س ۱ (۲) مطبع اُردو گائڈ کلکتہ ۱۸۸۳ء صـ۸ـ س ۱۹

(۳) مجتبائی پریس دہلی ۱۸۹۹ء صـ۱۰ـ س ۱۴ (۴) مجیدی پریس کانپور ۱۹۲۲ء صـ۹ـ س ۱۶

(۵) نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۷ء صـ۷ـ س ۱۵ (۶) مطبع کریمی لاہور ایڈیشن اوّل و سوم صـ۹ـ آخری سطر

اب سب سے پہلے یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ سن غلط ہے کیونکہ جناب نواب صاحب کو سب سے پہلے جو خط مرزا نے لکھا تھا اس کی تاریخ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۳ء تھی جیسا کہ مکتوب الیہ کے نام کے دوسرے رقعہ میں ہے:-

"سبحان اللہ تعالیٰ شانہ ما اعظم برہانہٗ - جناب مستطاب نواب میر غلام باباخاں بہادر سے بتوسط میاں داد خاں صاحب شناسائی بہم پہنچی - لیکن واہ اوّل ساغر و دردی! کیا جگر خون کن اتفاق ہے - پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا اس میں خبر مرگ۔ اب میں جو اُس کا جواب لکھوں اور یہ میرا پہلا خط ہوگا لامحالہ مضامین اندوہ انگیز ہونگے نہ نامۂ شوق نہ محبت نامہ صرف تعزیت نامہ صریر قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے، جو لفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے - ہے ہے! نواب میر جعفر علی خاں جیسا امیر روشن گہر نام آور روشناس اعیانِ ہند و انگلینڈ وسط جوانی یعنی ۴۶ برس کی عمر میں یوں مر جائے"۔

مرزا غالب کی تاریخ وفات ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء ہے - اس سن کے پہلے اور ۱۸۶۳ء کے بعد ۱۸۶۵ء ہی ایسا پڑتا ہے جب کہ ۱۷ر دسمبر کو یکشنبہ پڑتا ہے - مگر یہ واضح رہے کہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو مرزا صاحب رام پور میں رونق افروز تھے اور دسواں خط بزبانِ حال چلا رہا ہے کہ میں دہلی میں لکھا گیا ہوں اور دہلی ہی سے چلا ہوں - آخر کار اُردوئے معلی میں جو تیسواں خط ہے اور بنام منشی میاں داد خاں صاحب المتخاطب بہ سیف الحق و المتخلص بہ سیاح ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دسواں خط بنام نواب صاحب درحقیقت "یکشنبہ ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۵ء" کا ہے - چنانچہ مرزا صاحب اس میں میاں سیّاح کو لکھتے ہیں:-

"ہاں صاحب سَو روپیہ کا نوٹ پہنچا اور روپیہ وصول ہوا کاپی آج شروع ہوگئی ہے - جس دن نوٹ پہنچا اُس کے دوسرے دن روپیہ مل گیا تیسرے دن میں نے تم کو تمہارے رجسٹری دار خط کا جواب لکھ بھیجا - یقین ہے کہ میرا خط پہنچ گیا ہوگا اور تم نے بموجب میری خواہش کے نواب صاحب کو دکھا دیا ہوگا - کل حضرت کا بھی خط آیا ہے اس کا جواب بھی آج تمہارے خط کے

ساتھ ارسال ہوتا ہے"۔

اور جناب نواب صاحب کے نام والے دسویں خط کی عبارت یوں ہے:۔

عطیۂ حضرت بتوسط جناب سیف الحق پہنچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔ آج سے کاپی لکھی جانے لگی چھاپے کے واسطے برسات کا موسم اچھا ہے بس اس کے چھپ جانے میں دیر کیا ہے"۔

(۳)

"میرے مشفق آپ کا خط آیا اور اُس کے آنے نے تمہاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا الخ"

ان الفاظ سے عودِ ہندی میں جو اکیسواں رقعہ بنام جناب چودھری عبد الغفور صاحب ہے اس میں عبارت ہے:۔

"صاحب امکنہ اور دکاکین نہیں بتلا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دُکان کہاں تھی"۔

(عودِ ہندی اڈیشن اوّل مطبوعہ مطبع مجتبائی میرٹھ ۱۸۶۹ء صفحہ ۳۴ س ۷)

مگر عودِ ہندی کے کم از کم مفصلۂ ذیل نسخے ملاحظہ کئے جائیں "دکاکین" کے عوض "دُکانیں" مطبوع ہے:۔

(۱) نارائینی پریس دہلی ۱۸۷۸ء صفحہ ۳۴ س ۷　(۲) مطبع مفیدِ عام آگرہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۲ س ۳

(۳) مطبع منشی نولکشور کانپور ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۲ س ۳　(۴) نیشنل پریس الٰہ آباد ۱۹۲۹ء صفحہ ۵۱ س ۱۵

(۵) مطبع کریمی لاہور ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۷ س ۲۱　(۶) مطبع انوارِ احمدی الٰہ آباد (بار اوّل) صفحہ ۴۵ س ۷

(۴)

عودِ ہندی کے عام نسخوں میں جو خط ۱۳۹ بنام مولوی عبد الرزاق صاحب شاکر ہے اور جس میں "نقش فریادی الخ" کے معنی مندرج ہیں اسی میں ایک اور شعر کی تشریح کے سلسلے میں کم از کم عودِ ہندی کے ان ایڈیشنوں کی اوراق گردانی کیجئے:۔

(۱) مطبع نارائینی دہلی ۱۸۷۸ء صفحہ ۱۶۱ س ۱۱　(۲) مطبع مفیدِ عام آگرہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۵۲ س ۱۸

(۳) نیشنل پریس الٰہ آباد ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۶۳ س ۱۴　(۴) مطبع کریمی لاہور ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۵۸ س ۶

(۵) مطبع انوارِ احمدی الٰہ آباد (بار اوّل) صفحہ ۲۰۶ س ۱۴

اِن تمام نسخوں میں عبارت یوں ہے:۔

"یہ لفظ تیر کے مناسب حال یعنی یہ کہ"

اور حقیقت یہ ہے کہ عودِ ہندی کے پہلے ایڈیشن میں صحیح عبارت یہ ہے:۔

یہ لفظ تیر کے مناسب ۔ حاصل یہ کہ

(۵)

جناب نواب ضیاء الدین خانصاحب سے مرزا نے اپنا دیوان طلب کیا تھا چنانچہ اسی سلسلے میں مرزا نے لکھا تھا۔

"اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل[1] سے لے کر بھیجدو"

لیکن اُردوے معلی کے ان نسخوں کو ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء صفحہ ۲۴۲ س ۱۱ (۲) مطبع انوار المطابع لکھنؤ ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۶۲ س ۴

ان میں عبارت یوں چھپی ہے:۔

"اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفصیل سے لکھ کر بھیجدو"

ہاں دیگر دو نسخوں:۔

(۱) مطبع کریمی لاہور ایڈیشن اوّل ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۱۶ س ۵ (۲) مطبع کریمی لاہور ایڈیشن سوم ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۱۶ س ۸

کی بھی اوراق گردانی کیجئے عجیب گُل کھلا ہے۔ چنانچہ ان میں عبارت یوں مطبوع ہے:۔

"اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل۔ سے لکھ کر بھیجدو"

القصہ اس قسم کی صدہا باتیں اور عبارتیں رقعات غالب میں مجھ ناچیز کی نظر میں اصلاح کی محتاج ہیں۔ علاوہ بریں چند دیگر امور بھی اصلاح طلب ہیں۔ مگر کلام غالب کے حق میں جتنی کوششیں ہوئی ہیں اور اس کے جس قدر ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اس کے عمدہ ایڈیشن نکالنے کے لئے جو کوششیں ہوئی ہیں اور اس کی جس قدر شرحیں لکھی گئی ہیں ان سب امور کے اعادہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ پس اب آخر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غالب کے اشعار کی جانب جتنی توجہ برتی گئی ہے اتنی ہی یا اُس سے کہیں زیادہ عدم توجہی رقعاتِ غالب کی جانب برتی گئی ہے۔ حالانکہ یہ امر مسلّمہ ہے کہ رقعات کی اہمیت علمی و ادبی اعتبار سے کچھ کم نہیں۔

حق تو یوں ہے کہ رقعات کی جانب مناسب توجہ ہی نہیں ہوئی۔ یہ صرف مالکانِ مطابع اور ان کے کاپی نویسوں کے رحم پر رہے۔ جس کا نتیجہ یہی نہیں کہ عبارتیں غلط لکھی گئی ہیں بلکہ بہت سے الفاظ ضبطِ تحریر میں آنے سے رہ گئے جیسا کہ پہلے اظہار کیا گیا ہی خیر مضی ما مضیٰ

اب بھی موقع ہے کہ رقعات کی صحت کے لئے اربابِ علم کوشاں ہوں ورنہ اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اغلاط و اسقام ہی صحت کا درجہ حاصل کر کے بطورِ ثبوت پیش کئے جائیں گے اور مرزا کے اصل و صحیح رقعات کچھ اور بن جائیں گے ہیچ ہے ۔

دفعِ غم نیست جز بغم خوردن چارۂ کار نیست جز کردن

مہیش پرشاد

[1] مراد میاں تفضل حسین خاں پسر دیوان فضل اللہ خانصاحب

"بازایں چہ آفت است نہال امید را
امسال ہم شگوفہ فشاند و ثمر نشد"

نہیں بھولتا اُن کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا (حالیؔ)

دلِ بیقرار و غمِ ناگہاں ۔۔۔ پلا ساقیا بادۂ ارغواں
سکوں کوئی حاصل نہ ہو یوں مجھے ۔۔۔ تو دے زہر میں گھول کر خوں مجھے
مغنّی! سن اے فتنۂ عقل و ہوش ۔۔۔ لہو سے ہوا دل کفِ گلفروش
کوئی چیز اے ماہ پارا بجا ۔۔۔ سریلی دھنوں میں کدارا بجا
مغنّی وہ عالم مجھے یاد ہے ۔۔۔ جُدائی کا ماتم مجھے یاد ہے
سرِ شام وہ ان کا جانا ہے یاد ۔۔۔ مجھے آج تک وہ فسانہ ہے یاد
گئیں اور ذوقِ فغاں دے گئیں ۔۔۔ نشانِ غمِ بے نشاں دے گئیں
گئیں اور پابندِ غم کر گئیں ۔۔۔ یکایک نگاہوں سے رم کر گئیں

مرے دل کی شادابیاں لے گئیں
وہ ساتھ اپنے دونوں جہاں لے گئیں

رگوں میں ٹھٹھر سی گئی موجِ خوں
خزاں ہو گیا لالہ زارِ جنوں

کلی شادمانی کی مرجھا گئی
خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

مغنّی ذرا چھیڑ دے بانسری
سنا دے کوئی راگنی مدھ بھری

مغنّی! ذرا اپنا بربط سنبھال
فسانے محبّت کے دوزخ میں ڈال

محبت نے دل میرا خوں کر دیا
محبت نے محوِ جنوں کر دیا

سنا کوئی تازہ غزل شعلہ کار
کہ نکلے کسی طرح دل کا بخار

کیا خنجرِ غم نے دل چاک چاک
پلا ساقیا بادۂ تابناک

نہ کر عشق میں فکرِ سود و زیاں
نہ ہو کاوشِ این و آں سے ہلاک

نہ دنیا کی پروا نہ عقبیٰ کا خوف
نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ سے باک

خداوندِ زمین و زماں ہے یہ دل
محبت سے روشن ہے یہ مشتِ خاک

نہ وہ بادہ کش ہیں نہ وہ پارسا
نہ وہ اہرمن ہے نہ یزدانِ پاک

مرے خوں سے عابد ہے شانِ بہار
مرے خوں سے رنگیں ہیں رگہائے تاک

عابد لاہوری
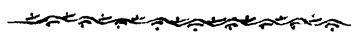
ضیا کے قطعات کا ایک چھوٹا سا خوبصورت مجموعہ تنقید کے لئے موصول ہوا ہے لیکن مجھے چونکہ ان قطعات میں ضیا کی شخصیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے اس لئے میں نے ان سطور پر ضیا ہی عنوان لکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ اس ننھی سی کتاب کے بجائے ایک بڑے شاعر کو ناظرین سے کیوں نہ متعارف کراؤں۔

ضیا سے میرا تعارف کلیم صاحب کے ذریعے سے ہوا۔ وہ ایک دن انہیں میرے دفتر میں لے آئے۔ اور صرف "حضرتِ ضیا" کہہ کر مجھ سے ملا دیا۔ یہ ایک خاموش سے آدمی تھے، مَیں نے سمجھا ہوں گے ان کے کالج کے کوئی متشاعر۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی ایک دن وہ مجھے اس طرح متاثر کریں گے۔ اس دن کے بعد کئی دفعہ اُن سے ملنا ہوا لیکن اب میں اُنہیں متشاعر نہ سمجھتا تھا بلکہ محض کلیم صاحب کا ایک دوست۔ جن دنوں میں سالنامے کی ترتیب میں مصروف تھا کلیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ ضیا کے کلام کا ایک مجموعہ آپ کے پاس آئیگا اس پر اچھا سا ریویو کر دیجئے گا۔ اس کے بعد وہ مجموعہ آیا اور میں نے اُسے زیرِ تبصرہ کتابوں میں رکھ دیا۔ چند روز ہوئے ضیا اور کلیم دونوں حضرات میرے پاس تشریف لائے۔ ضیا نے پوچھا "میری کتاب آپ کو مل گئی تھی؟" میرا یہ حال تھا کہ میں ضیا اور ان کی کتاب دونوں کا نام بھول چکا تھا۔ مَیں نے کہا "کونسی کتاب؟" کلیم صاحب بولے وہی "طلوع" اِن کے قطعات کا مجموعہ۔" میں نے ذرا سوچ کر کہا "ہاں ان کی کتاب آئی تو تھی"۔ اور مَیں نے اُسی وقت کتاب نکال کر ان کے سامنے ہی اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ضیا اور طلوع دونوں میرے سامنے تھے اور مَیں دیکھ رہا تھا کہ ضیا کی خاموش اور مغموم طبیعت کس صفائی کے ساتھ اُن کے کلام میں موجود ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ ضیا ایک حقیقی شاعر ہیں، اور جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُسے اُنھوں نے محسوس بھی کیا ہے اور سوچا بھی ہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں سنجیدگی اور اثر کی فراوانی ہے۔ ان کا ذوق بلند ہے اور زبان نہایت پاکیزہ اور صحیح ہے۔

حضرتِ ساغر نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ اس کے ضمن میں اُنھوں نے ایک عنوان "شاعر کا پیغام" بھی دیا ہے، اور یہ پیغام پیغامِ عمل بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مجموعے میں ایک دو قطعات عمل کے متعلق بھی ہیں لیکن مجھے یہ شاعر کے لئے ایک پیغام کا ہونا ضروری معلوم نہیں ہوتا، جیسا کہ آج کل عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ خصوصاً ضیا کی شاعری ایسی ہے کہ اس میں اجتماعیت کی بجائے انفرادیت زیادہ ہے۔ اُنہیں پیغام سے احتراز کر کے اپنی شخصیت زیادہ نمایاں کرنا چاہئے۔

اب مَیں اُن کے چند قطعات یہاں نقل کرتا ہوں تاکہ ناظرین ادبی دنیا خود دیکھ لیں کہ اُن کی شاعری کس پایہ کی ہے۔

شمعِ احساس جلتی رہتی ہے
آگ دل میں اُبلتی رہتی ہے
لب پر آتا نہیں مگر شکوہ
چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے

تجربہ ایک بار کر دیکھو
دل کو بے اختیار کر دیکھو
مجھ سے کیا پوچھتے ہو حالِ فراق
ایک دن انتظار کر دیکھو

زندگی نذرِ جامِ الفت ہے
یہ جو مل جائے تو غنیمت ہے
عشرتِ جان و دل سمجھ اس کو
ورنہ دنیا نہیں مصیبت ہے

درد کو ہمکنار کرتا ہوں
رات دن انتظار کرتا ہوں
سادہ لوحی مری کوئی دیکھو
حُسن کا اعتبار کرتا ہوں

موت کو زندگی سمجھتا ہوں
بے خودی کو خودی سمجھتا ہوں
حُسن کو دیکھتا ہوں ہر شے میں
رنج کو بھی خوشی سمجھتا ہوں

آ رہا ہوں کدھر سے کیا معلوم
جا رہا ہوں کہاں خُدا معلوم
نہ مرے ساتھ کوئی رہبر ہے
نہ مجھے اپنا راستہ معلوم

کتاب ساغر بک ڈپو۔ ادبی مرکز میرٹھ سے مل سکتی ہے۔

منصور احمد

اچھا ملے نصیب مجھے یا بُرا نصیب
لے دے کے دل کو پھر وہی آہ و بکا نصیب

الفت میں رنج ہو کہ ہو راحت مرا نصیب
ہر رنگ میں ہے دل کو مری جاں دوا نصیب

مجھ سے اُنھوں نے پوچھ لیا مدعائے دل
آخر بگڑ بگڑ کے مرا بن گیا نصیب

بیتاب آرزو کو مِلا بھی تو کیا مِلا
حسرت جنوں نصیب تو محبّت بلا نصیب

اِس خاکداں میں آکے میں حسرت نصیب تھا
ایسا بنا کہ بن کے نہ بدلا مرا نصیب

اپنا نصیب دیکھ کے مانگی دعائے غم
ناصرؔ ہمیں ملا ہے غمِ انتہا نصیب

ناصر الدین خاں

باپ

ٹارڈ جو اپنے علاقہ میں سب سے زیادہ امیر اور بارسوخ کسان تھا ایک دن پادری کے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوا اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا:

"آسمانی باپ نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا ہے اور میں اُسے بپتسمہ دینے کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں"۔

"اُس کا نام کیا ہوگا"۔

"فن، جو میرے باپ کا نام تھا"؟

"اور اس کے مذہبی ماں باپ کون ہونگے"۔

ان کے نام بتائے گئے اور ثابت کیا گیا کہ وہ ٹارڈ کے معزز رشتہ دار ہیں۔

پادری نے کہا "کوئی اور بات"؟ اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کسان کچھ دیر خاموش رہا اور آخر کار بولا:

"بہتر ہوگا کہ میرے بیٹے کو علیحدہ بپتسمہ دیا جائے"۔

"یعنی اتوار کے علاوہ کسی اور دن"؟

"اگلے ہفتہ کے دن، بارہ بجے دوپہر کو"۔

"کوئی اور بات" پادری نے پوچھا۔

کسان نے کہا "آپ کی نوازش"۔ اور ٹوپی کو اس طرح حرکت دی گویا وہ اب جا رہا ہے۔

پادری اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے ٹارڈ کا ہاتھ پکڑا اور نہایت سنجیدگی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"خداوند تمہارے بیٹے کو تمہارے لئے بابرکت کرے"۔

عین سولہ سال بعد ٹارڈ پھر پادری کے مطالعہ کے کمرے میں کھڑا تھا۔ اس لمبے عرصہ میں کسان کی شکل و شباہت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا۔ پادری نے حیرت سے کہا۔

"ٹارڈ تمہاری صحت تعجب انگیز طور پر اچھی ہے"۔

"شاید اس لئے کہ میں دنیا کے مصائب سے محفوظ ہوں"۔

پادری خاموش رہا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد بولا "آج کس طرح آنا ہوا؟"

"میرا بیٹا فن کل اپنے مذہب کا اقرار کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا"۔

"وہ ایک نہایت اچھا لڑکا ہے"۔

"میرا بیٹا کل گرجے میں کس نمبر پر کھڑا ہوگا"۔

پادری نے جواب دیا "سب سے پہلے"۔

"میں نے بھی یہی سنا ہے۔ تو لیجئے یہ دس ڈالر قبول فرمائیے"۔

"کیا میں آپ کی کوئی خدمت کرسکتا ہوں"۔ پادری نے یہ کہا اور ٹکٹکی باندھکر ٹارڈ کی طرف دیکھنے لگا۔

مہربانی۔ ٹارڈ کمرے سے باہر چلا گیا۔

آٹھ سال اور گذر گئے۔ ایک دن پادری کے کمرے کے باہر غیر معمولی شور ہو رہا تھا۔ ٹارڈ کی سرکردگی میں ساتوں کا ایک گروہ پادری کے مکان کی طرف آ رہا تھا۔ ٹارڈ سب سے پہلے داخل ہوا۔

پادری نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور اسے پہچان کر کہا:

"آج تو تمہارے جلو میں بہت سے آدمی ہیں"۔

"میرے بیٹے کی شادی گڈمنڈ (جو میرے پاس کھڑے ہیں) کی لڑکی کیرن سے ہونے والی ہے۔ آپ اس کے متعلق اعلان کر دیں"۔

کیرن جو علاقہ کی سب سے زیادہ امیر لڑکی ہے؟

"ہاں" کسان نے ایک ہاتھ سے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

پادری کچھ دیر گہری سوچ میں مستغرق رہا اور پھر خاموشی سے رجسٹر میں نام درج کر لئے۔ ٹارڈ اور گڈمنڈ نے اپنے اپنے ناموں کے نیچے دستخط کر دئیے۔

ٹارڈ نے تین ڈالر میز پر رکھے۔

پادری نے کہا "صرف ایک ڈالر دیجئے"۔

"مجھے معلوم ہے لیکن فن میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں خوشی سے آپ کو تین ڈالر دیتا ہوں"۔

پادری نے ڈالر جیب میں ڈال لئے۔

"یہ تیسرا موقع ہے کہ تم میرے پاس اپنے بیٹے کے متعلق آئے ہو"۔

ٹارڈ نے کہا "بس یہ آخری موقع ہے" اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کسانوں کا گروہ اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

دو ہفتے بعد ایک چھوٹی سی کشتی جھیل کی سطح پر خاموش پانیوں کو چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ فضا میں چاروں طرف پرہیبت خاموشی طاری تھی کشتی کی سرسراہٹ سے ہلکا ہلکا سرود پیدا ہو رہا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جس کا چہرہ اطمینان کی روشنی سے چمک رہا تھا اور ایک مستِ شباب نوجوان جس کی خفیف سی مسکراہٹ ناتجربہ کاری اور ایک مبہم سرور سے مرکب تھی غایت وقار سے چپّو چلا رہے تھے۔ یہ ٹارڈ اور اُس کا بیٹا تھے جو شادی کے سامان کا انتظام کرنے کے لئے پاس کے قصبہ کو جا رہے تھے۔

"میری بیٹھنے کی جگہ کچھ محفوظ نہیں" یہ کہہ کر نوجوان اسے درست کرنے کے لئے اُٹھا۔

معاً اُس کے پاؤں تلے سے تختہ پھسل گیا اس نے اپنے بازو ہوا میں پھیلا دیئے ایک بے بسی کی چیخ فضا کی خاموشیوں میں گونجی اور وہ دھڑام سے جھیل میں گر پڑا۔

ٹارڈ ایک جست لگا کر اُٹھا اور چپّو اپنے ڈوبتے ہوئے بیٹے کی طرف بڑھایا۔ لیکن ایک دو ہاتھ مار کر نوجوان کے اعضا سرد پانی میں شل ہو گئے۔

ٹارڈ نے کہا "ٹھہرو میں ابھی آ رہا ہوں" اور کشتی کا رُخ اپنے بیٹے کی طرف کیا۔

نوجوان پیٹھ کے بل پانی کی سطح پر اُبھرا۔ ٹکٹکی باندھ کر اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ٹارڈ کو اس واقعے کا یقین نہ آتا تھا۔ اُس نے کشتی کو وہیں کھڑا رکھا اور ٹکٹکی باندھے ہوئے عین اُسی جگہ دیکھتا رہا جہاں اس کا بیٹا پانی کے پردوں میں چھپ گیا تھا۔ گویا اسے یقین تھا کہ وہ ان پردوں کو پھاڑ کر سطح پر نمودار ہوگا۔

چند بلبلے نمودار ہوئے۔ پھر کچھ اور۔ اور آخر کار ایک بہت بڑا بلبلہ جو معاً پھٹ گیا۔

جھیل پھر ایک صاف و شفاف آئینے کی طرح خاموش تھی۔

متواتر تین دن اور تین رات لوگوں نے ٹارڈ کو اس نقطے کے گرداگرد جنون کی سی حالت میں کشتی چلاتے ہوئے دیکھا وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چوتھے دن ابھی صبح روشن نہیں ہوئی تھی کہ لاش مل گئی۔

اس نے اپنے نوجوان۔ بیٹے کی لاش کو کندھوں پر اُٹھالیا اور پہاڑیوں میں اپنے کھیت کی طرف غائب ہو گیا۔

غالباً ایک سال اور گذر چکا ہو گا کہ موسمِ خزاں کی ایک شام کو پادری کے برآمدے میں کوئی نہایت احتیاط سے دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ پادری نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

ایک لمبا، دُبلا، سفید بالوں والا، خمیدہ کمر آدمی داخل ہوا۔ پادری ایک عرصہ تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد اُسے

پہچاننے میں کامیاب ہوا۔

پادری نے کہا "ٹارڈ تم اس وقت تک کہاں پھر رہے ہو" اور بے حس و حرکت اُس کے سامنے کھڑا رہا۔

ٹارڈ نے کہا "غالباً بہت دیر ہو چکی ہے" اور بیٹھ گیا۔

خاموشی نہایت طویل خاموشی طاری رہی۔ آخر ٹارڈ نے کہا:

"میں غریبوں کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ آپ یہ رقم میرے مرحوم بیٹے فن کے نام پر خیرات فنڈ میں جمع کر لیجئے"

وہ اُٹھا ایک بھاری تھیلی میز پر رکھی اور بیٹھ گیا۔

پادری نے تھیلی کو کھول کر گننا شروع کر دیا۔

"یہ تو بہت بڑی رقم ہے"

"میں نے کل اپنی جائداد بیچ دی ہے۔ یہ اُس کی نصف قیمت ہے"

پادری عرصے تک ایک حیرتناک خاموشی میں ڈوبا رہا۔ پھر نہایت نرم لہجے میں بولا۔

"ٹارڈ اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"کوئی بہتر کام"

کچھ دیر دونوں بیٹھے رہے۔ ٹارڈ کی نظریں نیچی تھیں اور پادری کی آنکھیں ٹارڈ پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر نہایت نرمی اور آہستگی سے پادری نے کہا "آخر تمہارا بیٹا تمہارے لئے حقیقی [illegible] رحمت کا باعث ہوا"

ٹارڈ نے اوپر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"

دو بڑے بڑے چمکتے ہوئے آنسو [illegible] اُس کے رخساروں پر ڈھل رہے تھے!

نصیر احمد

(لاہور)

رباعی

[illegible]

سعید احمد اعجاز

نہ پوچھو کیا گزرتی ہے جدا جب یار ہوتا ہے
ہر آنسو اُس کا بن کر تیر دل کے پار ہوتا ہے

فغاں جب عندلیبِ زار کی گل تک پہنچتی ہے
گریباں چاک کردیتا ہے دل افگار ہوتا ہے

مری جب بیقراری حد سے بڑھ جاتی ہے فرقت میں
خیالِ یار بھی اُس دم نہیں غمخوار ہوتا ہے

جدا ہوتے تو ہو لیکن مجھے اتنا بتا جاؤ
سیہ خانہ یہ پھر کب مطلع الانوار ہوتا ہے

بتاؤں کیا تجھے رنگینیاں دردِ محبّت کی
ٹپکتا ہے جو آنسو آنکھ سے گلنار ہوتا ہے

وہ دل جس میں پڑے ہوں سینکڑوں ہی داغ فرقت میں
فدا کارانِ الفت کا وہی گلزار ہوتا ہے

مزا دردِ محبّت کا تمہیں معلوم کیا ناصح
یہ اُس کے دل سے پوچھو آہ جو بیمار ہوتا ہے

محمد مہتاب الدین

کوئی خبر؟

بوڑھا سیم گیٹس اپنی عمر کی ستّر منازل طے کر چکا تھا۔ وہ ایک مدت سے نہایت جانفشانی اور تندہی سے کھیتی باڑی کا کام کر رہا تھا۔ اس کا مزاج چڑچڑا نہ تھا۔ مگر آج اُسے ایک واقعہ پیش آگیا تھا جس سے وہ غیر معمولی طور پر غضب آلود نظر آتا تھا۔ اس کے غیر متزلزل مزاج میں ایک گونہ ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔

اس کی بھتیجی ایگی ایک نادان سی لڑکی تھی۔ وہ ہر صبح اپنے چچا کے لئے کھیت میں کھانا لایا کرتی تھی۔ مگر آج وہ کھانا لے کر آئی تو چچا سے کہنے لگی "چچا جان! کوئی خبر؟"

بوڑھے سیم گیٹس کی زندگی دنیا کی تگ و دو سے بالکل خالی تھی۔ اُس نے ساٹھ سال کا طویل عرصہ صرف [illegible] کی حدود میں گذار دیا تھا۔ تو ان حالات کے ماتحت لڑکی کتنی بے سمجھ تھی کہ اُس نے ایسا بے معنی سوال کیا!

ایگی نے کھانا لا کر چچا کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ چچا کوئی بات کرے۔ مگر لاحاصل۔ سیم گیٹس کھانا کھا کر سگار پینے میں مشغول ہو گیا۔

ایک طرف تو ایگی کے اس بے معنی سوال نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک ہوائی جہاز کی [illegible] خراش آواز نے اُس کی طبیعت کو اور برہم کر دیا۔ ان دنوں لڑائی کی وجہ سے ہوائی جہاز خلافِ معمول کثرت سے آسمان پر نظر آتے تھے۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ کام کی طرف متوجہ ہو، مگر بے سود! آخر کار وہ ہوائی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوائی جہاز کبھی نیچے آتا اور کبھی پھر اُوپر کی جانب پرواز کرنے لگ جاتا۔ مگر بالآخر مسٹر ڈورج کے کھیت میں اس سے [illegible] کے فاصلے پر اُترا۔ سیم گیٹس نے للکار کر کہا "اس کھیت میں مت اُترو۔ یہ مسٹر ڈورج کا کھیت ہے۔"

اتنے میں ایک شخص جہاز پر سے اُترا اور مشین کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔ سیم گیٹس بھلا اتنی گستاخی کب گوارا کر سکتا تھا۔ جھٹ اُس کے پاس پہنچا اور اپنی بات کو دہرایا۔ اس پر ڈرائیور نے اُسے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا "دیکھو کام میں خلل مت ڈالو۔ چپکے سے بیٹھ جاؤ ورنہ موت قریب ہے!"

اگرچہ سیم گیٹس ستّر سال کا بڈھا آدمی تھا۔ مگر پھر بھی زندگی اُسے موت سے زیادہ محبوب تھی۔ وہ [illegible] ڈرائیور کے حکم کے مطابق زمین پر بیٹھ گیا۔

ہواباز بڑی شد و مد سے مرمت کے کام میں مشغول تھا۔ دس منٹ کے عرصہ میں اس نے تمام نقص [illegible]

اس سے قبل کہ وہ روانہ ہوتا وہ سیم گیٹس کے پاس آیا۔ اسے اس پر مشہور جاسوس پال کا شبہ ہو رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ اس کے بعد اس نے اس کی داڑھی کو کھینچا تاکہ معلوم ہو کہ یہ مصنوعی تو نہیں اور پھر اُسے جہاز پر سوار ہونے کو کہا "بس تمہارے لئے دو راہیں ہیں یا تو جہاز پر سوار ہو جاؤ یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سیم گیٹس کے جذبہ حیات نے جوش مارا اور وہ جہاز پر سوار ہو گیا۔

جہاز پر بیٹھتے ہی مشین بڑی سُرعت سے ہوا باز نے اُس چند منٹوں میں وہ فضائے آسمانی میں ایک ناپیدا کنار سمندر کے اُوپر اُڑنے لگے۔ سیم گیٹس ڈرتا اور دل میں سوچتا کہ اب موت بالکل قریب ہے۔ اس کے دل میں جذبات اور شکوک کا ایک بے پناہ طوفان برپا تھا۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ ابھی یہ جہاز گر کر غرق ہو جائیگا۔ کبھی اُسے یہ شبہ ہوتا کہ ابھی وہ دائی اجل کو لبیک کہا چاہتا ہے۔ غرضکہ اُس کا حیرت زدہ دماغ گوناگوں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

کچھ عرصے کی مسافت کے بعد اُسے خشکی کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ اس زمین کے مناظر جس پر وہ وارد ہوئے تھے اُس کے لئے بالکل غیر مانوس تھے۔ کچھ آدمی اُن کی طرف دوڑے، وہ کوئی اجنبی زبان بولتے تھے۔ انہوں نے اُسے جہاز پر سے اتارا۔ سیم گیٹس کو حکم ہوا کہ وہ ہوا باز کے پیچھے پیچھے چلے۔ وہ دونوں ایک بارعب فوجی افسر کے سامنے حاضر کئے گئے۔ افسر مذکور نے انگریزی زبان میں پوچھا "تمہارا نام؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ کتنی عمر ہے؟ تمہارے والدین کا وطن کونسا ہے؟

فوجی افسر نے بھی سیم کی داڑھی کھینچی اور کئی تجسس آمیز سوالات کئے۔ پھر کہا "واقعی یہ شخص پال سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ مگر ہاشمین تمہارے خیال کے مطابق اس سے کیا سلوک کیا جائے ـــــ؟

ہوا باز ہاشمین نے کہا۔ "یہ شخص پال سے بہت مشابہ ہے۔ انگریز ہمارے اس جاسوس کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اور اسے گرفتار کرنے کی دو دفعہ ناکام کوشش بھی کر چکے ہیں۔ اُن سب کے پاس اس کے فوٹو موجود ہیں"۔

افسر نے کہا "خوب!

ہوا باز۔ میری رائے یہ ہے کہ کل جب انگریز پہاڑی علاقے پر حملہ آور ہوں تو ہم اس شخص کے مُردہ جسم کو اُن کے راستے میں پھینک دیں تاکہ وہ اصلی پال کی تلاش کرنا چھوڑ دیں اور ہمیں جو فائدہ پال کی ذات سے پہنچ رہا ہے وہ بدستور جاری رہے

فوجی افسر۔ "مگر اصلی پال اس وقت کس جگہ ہے۔

ہوا باز۔ "وہ اس وقت سینٹ ایلائس کے مقام پر باغبان کی حیثیت سے کام کر رہا ہے جو برطانی کیمپ سے ایک سو گز کے فاصلے پر ہے"۔

فوجی افسر۔ "ہاشمین! تمہاری یہ تجویز بہت موزوں ہے"۔

فوجی افسر نے پھر ایک دفعہ سیم گیٹس کے چہرے پر متجسسانہ نگاہ ڈالی اور کہا۔ "کس درجہ مشابہت رکھتا ہے"۔
پھر اُس نے جرمن زبان میں کہا۔ یہ کام ضرور کرنا چاہیئے۔ جب افسرانِ بالا اس کی نسبت سنیں گے تو تمہاری بہت تعریف ہو گی۔ لیفٹننٹ سکاؤٹز کو حکم دو کہ اس سادہ لوح انسان کو خندق ۳۸ میں محبوس کر دے اور جب موقع آئے اسے گولی سے اُڑا کر راستے میں پھینک دے ——— مگر یہ یاد رہے کہ اس کی صورت مسخ نہ ہونے پائے۔

ہوا باز سلام کہکر مصنوعی پال کی معیت میں واپس لوٹا۔ بوڑھا سیم اُن کی گفتگو کا آخری حصہ اخذ نہ کر سکا تھا۔ مگر اپنی غیر معمولی ذہانت سے اتنا تو ضرور جان گیا تھا کہ کوئی نہایت اہم بحث ہو رہی تھی۔ اُس نے موقع پاکر ہوا باز سے کہا "مسٹر! مجھے آپ میرے کمیپ میں پہنچاؤ گے" ہوا باز نے جواب دیا۔ "مطمئن رہو بڑے میاں تمہیں بہت جلدی پہنچا دیا جائے گا"۔

چند منٹ کے بعد سیم نے اپنے آپ کو ایک زرد رنگ کی کار میں چند سپاہیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے پایا۔ گاڑی غیر آباد زمین سے گذر کر ایک شکستہ کنویں کے پاس ٹھہری۔ آسمان پر ہوائی جہازوں کی سمع خراش آواز سے غلغلہ سا پیدا ہو رہا تھا۔ سپاہی سیم کو ایک زمین دوز کمرے میں لے گئے۔ وہاں تین جرمن افسر شراب پی رہے تھے۔ ایک نے حقارت آمیز لہجے میں سیم کے منہ پر تھوک کر اس کی داڑھی کھینچی اور کہا۔ "یہ انگریز بندر معلوم ہوتا ہے"۔

بیس منٹ کے بعد ایک سپاہی بندوق لیکر آیا اور اُس نے پانچ گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر بندوق سیم کی طرف سیدھی کی۔ اور — — — — — — — — — — اس کے بعد اُسے صرف اتنا ہوش رہا کہ وہ کسی جان گسل دھماکے سے آگے کی جانب گرا ہے — — — — — مگر اُس کے ساتھ ہی سپاہی بھی وہیں ڈھیر ہو گیا —— !

کچھ عرصے کے بعد اُس کے حواس بحال ہوئے تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک تختے پر دراز ہے۔ اُس نے کسی شخص کو کہتے سُنا۔ یہ کوئی انگریز نژاد معلوم ہوتا ہے"۔ اِدھر اُدھر جو نگاہ ڈالی تو کیا دیکھا کہ ایک اژدھام اُسے گھیرے ہوئے ہے۔ کچھ آدمی خاکی لباس میں اور کچھ سفید میں۔ وُہ اُٹھا اور سر کو دباتے ہوئے کہنے لگا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ کونسی جگہ ہے؟

"بوڑھے! تم جہانِ ثانی کے کنارے پر کھڑے ہو —— مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہارا وطن کہاں ہے"؟

اسی اثنا میں دو آدمی اور آ گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ " اب یہ رُو بہ صحت ہے۔ بہتر ہے کہ اسے کرنیل

کے پاس پہنچا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ کوئی جاسوس ہی ہو! دوسرے نے بڑھ کر سیم کے کندھے کو جنبش دی اور کہا۔
"کیا تم چل سکتے ہو؟"

"ہاں اب میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھا سکتا ہوں"۔

نوجوان مذکور اُس کے کندھے کو سہارا دے کر اُسے صحن میں لے آیا۔ دونوں عقبی کمرے میں داخل ہوئے۔
جہاں ایک خوشرو ادھیڑ عمر کا فوجی افسر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کرنیل نے سیم کی طرف غور سے دیکھا اور کہا"۔۔۔

"براڈشا خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ یہ کون ہے"؟

براڈشا۔ "جناب مجھے معلوم نہیں"۔

کرنیل "کیا یہ پال تو نہیں"؟

براڈشا۔ "پال۔ ہاں ہاں وُہی"!

کرنیل نے سیم کی طرف مخاطب ہو کر کہا" دیکھا نہ پال! ہم نے تجھے پھر گرفتار کر لیا۔ اس دفعہ ہم ذرا زیادہ محتاط رہیں گے۔

سیم نے سراسیمہ ہو کر کہا" دیکھئے جناب میں آپ کی اس منطق سے گھبرا رہا ہوں۔ میرا نام پال نہیں۔ میرا نام سیم ہے۔ میں تو شلغم بویا کرتا ہوں"۔

دونوں افسروں نے پُر زور قہقہہ لگایا اور ایک نے کہا" سیم! تمہیں موقع دیا جائیگا کہ تم اپنی ذات کے متعلق صفائی پیش کر سکو۔ بھلا تم کس حصۂ انگلستان کے رہنے والے ہو"؟

میں ساڑھے سات بجے مسٹر ڈوج کے کھیت میں شلغم بو رہا تھا۔۔۔ ہیلویشن کے مقام پر۔۔۔ کہ ایک ہوائی جہاز نیچے اُترا۔ میں نے ہوا باز سے اس کی وجہ دریافت کرنی چاہی مگر اُس نے پستول دکھا کر مجھے جہاز پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"!

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ مقام ہیلویشن ہے کہاں؟ وہاں کے لوکل افسر کا کیا نام ہے"؟

"وہاں کے لوکل افسر ڈیوڈ پرائس ہیں۔ بڑے خدا ترس آدمی ہیں۔ میں وہاں ڈوج کے کھیت میں کام کرتا ہوں۔

"اوہو چارلی ڈوج۔ اچھا میں اس سے دریافت کروں گا کہ کیا وہ تمہیں جانتا ہے"۔

اس کے بعد دونوں افسر ایک دوسرے سے ہمکلام ہوئے۔ سیم کی عقل نے اس کی رہنمائی کی اور وُہ یوں گویا ہوا۔

"میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اصلی پال اس وقت کہاں ہے"؟

ہاں ہاں! کہاں ہے ؟

"وہ اس وقت سینٹ ایلائس کے مقام پر باغبان کی حیثیت سے کام کر رہا ہے"۔

افسر۔ "بوڑھے تمہیں کیسے معلوم ہے ؟

اس پر سیم نے جرمن افسروں کی تمام گفتگو جو اُس نے سُنی تھی من وعن کہہ سُنائی۔

فوراً گھنٹی بجی۔ ایک افسر نے آکر سلام کیا۔ اُسے حکم ہوا کہ سینٹ ایلائس کے قریب جو شخص باغبانی کا کام کر رہا ہے اُسے بغیر مزید تاخیر کے گرفتار کر کے یہاں لایا جائے۔ ایک گھنٹے کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو"

"باغبان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہی اصلی پال ہے"۔

اس پر کرنیل اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اُٹھیں اور وہ شکر گذاری کے لہجے میں کہنے لگا۔

"مسٹر سیم گیٹس! تم بڑے تجربہ کار آدمی ہو۔ تم نے ہمیں ایک نہایت ہی کار آمد اور منفعت بخش خبر پہنچائی ہے۔ ہماری گورنمنٹ تمہیں وکٹوریہ کراس انعام کے طور پر عطا کرے گی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ میں تمہاری کونسی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں"۔

بوڑھے سیم گیٹس نے داڑھی کو ہلاتے ہوئے کہا "مَیں اپنے وطن کو واپس جانا چاہتا ہوں"۔

کرنیل۔ "یہ تو بہت جلد ہو سکتا ہے"۔

سیم۔ "مگر مَیں چائے کے وقت سے قبل جانا چاہتا ہوں۔

کرنیل۔ "کس وقت"

سیم۔ "پانچ بجے کے قریب"

کرنیل۔ "بہتر"

کرنیل کی آنکھوں میں مسرت کی ایک تیز لہر دوڑی۔ وہ دوسرے افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"ریکس! کیا آج دوپہر کے بعد کوئی جا رہا ہے ؟"

ریکس۔ "جی ہاں۔ کمانڈر جینکنس آج تین بجے جا رہا ہے"۔

کرنیل۔ "تو اس سے کہنا کہ مجھ سے مل کر جائے"۔

دس منٹ میں کمانڈر موصوف آگیا۔

کرنیل۔ "جینکنس ایک کام تمہارے متعلق ہے۔ میرا دوست سیم گیٹس جو ہیلوشن سے ہمیں ایک معتبر اور کارآمد خبر دینے آیا ہے چائے کے وقت سے قبل اپنے وطن کو لوٹنا چاہتا ہے کیا تم اُسے پہنچا سکتے ہو؟"

کمانڈر نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "ہاں میں اس کا انتظام کرسکتا ہوں"

چنانچہ ہوا باز اور سیم پھر ایک دفعہ فضائے آسمانی میں پرواز کرنے لگے۔ بیس منٹ کے قلیل عرصہ میں سیم مسٹر ڈوج کے کھیت میں دوبارہ اُترا۔ تیز پا ہوا باز نے اس سے مصافحہ کرکے اپنا راستہ لیا۔ جونہی سیم اپنی جھونپڑی کے قریب پہنچا۔ اس کی بھتیجی ایگی اُس کے پاس بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ "چچا جان! کوئی خبر؟"——

(ادھوری)　　طاہر قریشی

اقوالِ زرّیں

اُمید بیداری کا خواب اور نا اُمیدی نفس کی راحت ہے۔

زبان کی لغزش پاؤں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

دولتمند ہونے کے لیئے وراثت کا انتظار فقیر بنا دیتا ہے۔

عزت کے مستحق ہو اور وہ حاصل نہ ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ عزت کے مستحق نہ ہو اور وہ حاصل ہو جائے۔

افلاس واحتیاج دو زبردست معلم ہیں۔

جس قدر دیر میں بُرا لفظ کہا جاتا ہے اُسی قدر دیر میں اچھا لفظ ادا ہو سکتا ہے۔

آنسو عورت کی دوسری زبان ہے جس میں صدہا الفاظ کا خزانہ مضمر ہے۔ لیکن جہاں آنسو بھی اثر نہ کرسکیں وہاں کوئی چیز کارگر نہیں ہو سکتی۔

شادی ایک شراب ہے جس کی نوعیت کا حال دوسرے جام پر معلوم ہو سکتا ہے۔

وعدہ ایک قرض ہے جو بہرصورت ادا کرنا پڑتا ہے۔

سیّد یوسف بخاری دہلوی

دنیائے ادب

ڈینش

شاہی باغ

بہار کے دن تھے۔ میں صبح صبح اپنے کام پر جایا کرتا تھا اور ہر روز مجھے ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت راستے میں ملتے تھے۔ شاہی باغ کے سرسبز درختوں کے سائے میں ہر روز میں ان کو گزرتے ہوئے دیکھتا تھا +

ہر روز اُسی وقت وہ آتے تھے، اور ہر روز مجھے ان کے دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ جب وہ آتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صبح اور زیادہ روشن ہوگئی ہے +

اگر اور کسی بات سے نہیں تو کم از کم ان کے سروں کے رجحان سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے محبّت ہے۔ کیونکہ مرد کا سر عورت کے سر کی طرف جھکا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن بند کے قریب آکر وہ ہمیشہ ایک لمحے کے لئے رُک جایا کرتے تھے، اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے +

پھول اپنے پورے جوبن پر تھے، اور خوشبودار بوٹیوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی +

انہیں دِنوں مجھے وہاں سے کہیں جانا پڑا، یا بہر حال میں نے شاہی باغ میں سے گزرنا چھوڑ دیا +

لیکن کچھ عرصے کے بعد جب میں اس راستے سے گزرا تو میں نے اسی عورت کو اپنے آگے آگے جاتے دیکھا ـــــ تنہا ـ

میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ یقیناً وہی ہے ذرا تیز تیز چل کر اس کے پاس سے گزرا +

ہاں، وہ وہی تھی۔ لیکن اس کی چال پہلے سے بہت سست ہوگئی تھی، اور اس کی آنکھوں میں ایک تحیّر زا غم کی جھلک نظر آتی تھی +

اب میں پھر اس کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ بند پر پہنچ کر وہ ٹھہر گئی جیسا کہ وہ دونوں اکثر ٹھہر جایا کرتے تھے اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر یکایک ایک مسکراہٹ آئی ـــــ آنسوؤں سے بھی زیادہ دلگداز +

اور پھر وہ چلی گئی +

لیکن بے اختیار میرے دِل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ

"اب کن رستوں سے گزر کر وہ اپنے کام کو جاتا ہوگا؟"

منصور احمد

انگریزی

میں کیا کروں گا

میری محبت اوروں کی طرح نہیں کہ وہ بدل سکے

اگرچہ تمہاری بے پروا نفرت حد سے بڑھ چکی ہے

کیونکہ تمہارے لئے آہیں بھرنے والا یہ حقیر وجود

میں سمجھتا ہوں کہ پیدا بھی تمہارے ہی لئے ہوا تھا +

ہاں ہاں، تمہارے اس جمودِ قلب کو توڑنے کا

میں ایک زیادہ یقینی راستہ اختیار کروں گا۔

میں اپنی ناکام محبت کا انتقام لینے کے لئے

تم سے محبت کرتا رہوں گا اور مر جاؤں گا +

جب میں غم سے مر کر لحد میں پڑا ہوں گا

اور تم اُن آہوں کو یاد کرو گی

جو اَب اٹھتی ہیں اور تمہارے دِل میں رحم پیدا نہیں کر سکتیں

تو ـــــ اس مبارک ساعت میں جب کہ میرا غم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوگا ـــــ

تمہارے دِل میں بھی ایک درد اُٹھے گا

جو تمہیں تڑپا دے گا +

کیونکہ ایسا پُر محبت اور بَا وفا دِل

جیسا کہ میرے سینے میں ہے

بے سُود نہیں ٹوٹ سکتا +

ملک محمد اسلم خان ایم اے

بیرسٹر ایٹ لا

گمشدہ کی تلاش

لندن کا ایک شہری کچھ عرصے کے لئے ایک چھوٹے سے قصبے میں ٹھہرا ہُوا تھا۔ یہاں اس کا قیمتی کتّا گم ہو گیا۔ مقامی پرچے میں اس نے اشتہار شائع کرایا کہ جو شخص کتّا تلاش کر کے لائے گا اسے دس پونڈ انعام ملیں گے۔ کسی نے انعام طلب نہ کیا۔ کتّے کا مالک دوبارہ اخبار کے دفتر میں گیا اور دفتر کے چپڑاسی لڑکے سے پوچھنے لگا:۔

"صیغۂ اشتہارات کے منتظم کہاں ہیں ؟"

لڑکے نے جواب دیا "وہ باہر گئے ہیں"۔

"اچھّا اُن کے نائب ؟"

"جناب، وہ بھی باہر گئے ہیں"

"اچھّا، تو ذرا ایڈیٹر صاحب کو اطلاع کر دو"۔

"جناب وہ بھی باہر گئے ہیں"۔

کتّے کے مالک نے سٹپٹا کر کہا "بندۂ خدا سب باہر چلے گئے ہیں ؟"

"ہاں جناب سب کے سب ایک کتّے کی تلاش میں گئے ہیں"۔

ندیم

عورت کی ضروریات

صرف ایک مرد کو خوش کرنے کے عورت کو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہے :۔

بجلی کا تبسم
فاختہ کی سُریلی آواز
پتھر کی خاموشی
حور کی آنکھیں
چمگادڑ کا اندھاپن
سلیمان کی دانائی

کاٹھ کے سپاہی کا تحمل
با انداز کی خاکساری
گنبد کی صدا
کتّے کی وفاداری
ملائی کی مٹھاس
گانے والی لڑکیوں کی ادائیں

"ہمایوں"

نئے رسالے

نیساں - یہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے، جس کے مدیر صدرِ شعبہ جناب سید محمد ضامن علی صاحب ایم اے ہیں۔ سید صاحب اُردو کی ترقی اور تحقیق کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں اس کا ثبوت وہ مبسوط رپورٹ ہی ہے جو انہوں نے "اُردو زبان و ادب" کے نام سے ہندوستانی اکیڈیمی کے لئے تیار کی ہے۔ یہ رسالہ جاری کر کے انہوں نے زبان کی ایک نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی بی اے اور ایم اے کی تعلیم ہوتی ہے۔ وہ اس رسالے کے ذریعے سے ان طلبہ کو میدانِ عمل میں لائے ہیں جنہیں اُردو سے حقیقی ذوق ہے۔ اس پرچے میں بعض مضامین ایسے اچھے ہیں کہ اگر ان کے مصنفین کو اپنے جوہرِ قابل کے اظہار کا موقع ملا تو وہ آسمانِ ادب پر مہر و ماہ بن کر چمکیں گے۔ اس پرچے کا حجم ۸۶ صفحات ہے۔ سالانہ چندہ برائے نام یعنی صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔ خط و کتابت جناب سید اعجاز حسین صاحب ایم اے لیکچرار الٰہ آباد یونیورسٹی کے نام سے کی جائے +

شباب - یہ رسالہ حضرتِ نسیم امروہوی کی نگرانی اور حضرتِ شوکت تھانوی کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ دنیائے ادب میں ان دونوں حضرات کو جو رتبہ حاصل ہے وہ اس رسالے کی کامیابی کا ضامن ہے۔ زیرِ نظر جنوری ۱۹۳۶ء کا پرچہ ہے جس میں ملک کے مشہور ادبا کے مضامین کثرت سے موجود ہیں۔ مولانا نیاز فتحپوری کے دو خط، کلام حسرت موہانی، جناب مدیر کا افسانہ "خضاب" اور پروفیسر افسر میرٹھی کا مضمون میر درد کی شاعری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ظاہری اعتبار سے بھی شباب اس زمانے کے بہترین رسائل کا ہم پلہ ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ، سرورق مصور، ایک رنگین اور دو یک رنگ تصویریں اس کو جاذبِ نظر بنائے ہوئے ہیں۔ حجم ۷۶ صفحات، اور سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے ہے۔ منیجر شباب، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے طلب فرمائیے +

قانون - اس رسالے کی ادارت لاہور کے چار فاضل وکلا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے لئے تمام قوانین اور ضابطوں کی تشریح کی جائے اور عدالتوں کے قابلِ ذکر فیصلے شائع کئے جائیں۔ مندرجۂ ذیل فقرہ رسالے کا عنوان ہے اور اس کی اشد ضرورت پر دلالت کرتا ہے "قانون سے لاعلمی کسی الزام کا صحیح جواب نہیں لہٰذا ہر شخص کا فرض ہے کہ قانون پڑھے اور سمجھے"۔ حجم ۶۴ صفحے، سالانہ چندہ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ قانون، بلیسہ اخبار سٹریٹ، انارکلی، لاہور

پیغامِ فطرت - حضرتِ جاذب دہلوی کی بصیرت افروز نظم ہے، جس میں موجودہ تہذیب کو انسانی مصائب اور مشکلات کا ذمہ دار قرار دیا ہے، اور فطرت کی طرف بلایا ہے۔ اس کی آمدنی مصیبت زدگانِ بہار کو بھیجی جائے گی۔ اس لئے ہم قارئین ادبی دنیا سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس کی خریداری میں حصہ لیں۔ قیمت دو آنے۔ کتب خانہ علم و ادب، چوڑی والاں، دہلی سے طلب فرمائیے +

منصور احمد

انعامی مقابلہ

پچاس روپے کے انعامات کا سلسلہ

نہایت خوشی سے اعلان کیا جاتا ہے کہ جنوری کے مقابلہ (مرکب الفاظ) میں مندرجۂ ذیل اصحاب نے انعامات حاصل کئے - چونکہ ایک حل بھی ایسا موصول نہیں ہوا جو مکمل طور پر صحیح ہو اس لئے انعام کی رقم پندرہ اصحاب میں درجہ وار تقسیم کی جا رہی ہے -

پہلا انعام چودہ روپے کا ——— ان کی ایک غلطی ہے -

(۱) محمد اسمٰعیل صاحب مدرس گورنمنٹ ہائی سکول فیروز پور

دوسرا انعام آٹھ روپے کا ——— ان کی دو غلطیاں ہیں -

(۲) بشیر حسین صاحب ضیائی ایم اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال

تیرہ انعام دو دو روپے کے ——— ان کی تین تین غلطیاں ہیں -

(۳) قاضی فیض محی الدین صاحب مسلم زمیندارہ ہائی سکول گجرات پنجاب

(۴) محمود صاحب معرفت چودھری لعل دین صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس میانوالی

(۵) جتندر سنگھ صاحب متعلم سیکنڈ ایر خالصہ کالج لائل پور

(۶) ہیرانند صاحب ایس وی ایچ پی بی سناتن دھرم مڈل سکول مردان

(۷) عطاء اللہ صاحب مدرس مڈل سکول تاوڑو ضلع گڑگانوہ

(۸) عبد اللطیف خان صاحب مترجم عدالت جناب جوڈیشل کمشنر بہادر کوئٹہ

(۹) مولوی محمد شفیع صاحب انصاری - جے نرائن ہائی سکول بنارس

(۱۰) ماسٹر ممتاز حسین صاحب کیمبل گھڑتل ضلع سیالکوٹ

(۱۱) عثمان علی خان صاحب کرم آباد وزیر آباد

(۱۲) شیخ ذکاء اللہ صاحب چک نمبر ۳۱۰ جھنگ برانچ براستہ گوجرہ ضلع لائل پور

(۱۳) قاضی غلام مصطفٰے صاحب سرپنچ پنچائت موضع وڈاک خانہ قاضیاں تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی

(۱۴) پربھو دیال صاحب بتوسط رام پرشاد جگل کشور - کلاتھ مرچنٹ - پرتاب گڑھ (اودھ)

(۱۵) سکھ رام صاحب طالب علم جماعت ہفتم مڈل سکول فتح پور بلوچ - تحصیل بلب گڈھ - ضلع گوڑگانوہ -

ماہ جنوری کے مقابلہ کا حل حسبِ ذیل ہے

۱- کوہِ نور	۲- چاند تارا	۳- قطب مینار	۴- لختِ جگر	۵- راہرو	۶- آسمان
۷- عالی جاہ	۸- جہاں پناہ	۹- صاف گو	۱۰- کماں دار	۱۱- نونہال	۱۲- گل گشت

اگر آپ کا حل اس حل کے مطابق ہے یا اس میں زیادہ سے زیادہ تین غلطیاں ہیں تو آپ ایک اطلاعی کارڈ ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء تک اسسٹنٹ ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور کے نام ارسال کر دیں - موصولہ مطالبات کی جانچ کرنے کے بعد انعام کی رقم کامیاب اہلِ مقابلہ کو ارسال کر دی جائے گی - اور اُن کے نام اور پتے کا اعلان اپریل کی اشاعت میں کر دیا جائے گا +

انعامی مقابلہ نمبر ۵

پچاس روپے کے انعامات

قواعد:- ۱- صفحہ ۸۰ پر ۱۲ اشعار کے تین سٹ درج ہیں - ان میں سے ہر سٹ میں اساتذہ کے چار مشہور ترین اشعار کے الفاظ کو بکھیر کر رکھ دیا گیا ہے - ہر سٹ کے اوپر ان شعرا کے نام لکھ دیئے گئے ہیں جن کے اشعار اس میں موجود ہیں - آپ کو ان الفاظ کی مدد سے صرف اس قدر سوچنا ہے کہ ہر سٹ میں کون کون سے اشعار ہیں - مثال کے طور پر پہلے سٹ میں غالب کا یہ شعر موجود ہے :- ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی +

۲- تمام اشعار چھپے ہوئے کوپن پر جو اگلے صفحہ پر دیا گیا ہے نمبروار درج کر دیں - اور کوپن کے باقی اندراجات پُر کر کے کوپن پر ۲ر کا ٹکٹ چسپاں کر دیں - اور اسے ایک لفافہ میں بند کر کے مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرمائیں - ایڈیٹر ادبی دنیا - پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷ - لاہور - کوپن کے اندراجات میں اگر کوئی کاٹ چھانٹ ہوئی تو کوپن قبول نہیں کیا جائے گا +

۳- آپ اپنے ارسال کردہ حل کی ایک نقل اپنے پاس رکھ لیں تا کہ جب ایڈیٹر مقابلہ کا حل اگلے پرچے میں